اُمّتِ مسلمہ

کامیابی کا راستہ

■

ڈاکٹر محمد فاروق خان

اُمّتِ مسلمہ

کامیابی کا راستہ

■

ڈاکٹر محمد فاروق خان

Marfat.com

جملہ حقوق محفوظ ہیں

81695

کمپوزنگ : محمد سرور

اہتمام: ممتازالدّین

مطبع: نیو ایج پرنٹرز

تاریخ اشاعت: مارچ 2008

قیمت:

نیو ایج پرنٹرز
رسالپور

برائے رابطہ۔
نثار محمد
D-130 شیخ ملتون ٹاؤن مردان
فون:0937-868852
موبائل:0345-9343415

Marfat.com

فہرست

پہلا باب	موضوع کی ضرورت اور اہمیت	1
دوسرا باب	کامیاب ممالک کی حکمتِ عملی	9
تیسرا باب	قومیں سُپر پاورز کیسے بنتی ہیں	16
چوتھا باب	اسلامی دنیا اور مغربی دنیا کا تقابلی جائزہ، تاریخ کی روشنی میں	24
پانچواں باب	امریکہ بحیثیت سپر پاور	66
چھٹا باب	امت مسلمہ کے لیے فوری ایجنڈا	94
ساتواں باب	پاکستان کیلئے فوری ایجنڈا	102
آٹھواں باب	ہر مسلمان اور پاکستان کے لیے انفرادی ایجنڈا	109
نواں باب	پاکستانی جرنیل اور سیاست دان	113
دسواں باب	مسئلہ کشمیر	124
گیارھواں باب	مسئلہ افغانستان	141
بارھواں باب	مسئلہ فلسطین	160
تیرھواں باب	مسئلہ عراق	190
چودھواں باب	بوسنیا اور چیچنیا	197
پندرھواں باب	کوسوو، یورپ کی تیسری مسلمان ریاست	202
سولھواں باب	سوڈان اور صومالیہ کا المیہ	205
سترھواں باب	مسلم اقلیتوں کے مسائل:	212
اٹھارھواں باب	"دہشت گردی کے خلاف جنگ"	215
انیسواں باب	مغرب کی طرف سے امت مسلمہ کے خلاف اشتعال انگیز کاروائیاں کیوں ہو رہی ہیں؟	228
بیسواں باب	پس اب کیا کیا جائے؟	233
اکیسواں باب	اسلامی تہذیب بمقابلہ مغربی تہذیب	236
بائیسواں باب	اسلامی نظام کی حقیقت کیا ہے۔	246

Marfat.com

تیئسواں باب	جمہوری کلچر کیا ہے۔	251
چوبیسواں باب	مذہبی اور دنیاوی نظام تعلیم کی بحث	256
پچیسواں باب	مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تعلقات	270
چھبیس واں باب	جنگ اور ریاست کا باہمی تعلق	274
ستائیس واں باب	تشدد اور عدم تشدد	276
اٹھائیس واں باب	حکمت ودانائی کیا ہے	280
انتیس واں باب	اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی مصیبت	282
تیسواں باب	سیکولرزم کا ایشو	285
اکتیس واں باب	اپنی غلطیوں کا اعتراف کیجئے	291
بتیس واں باب	سازش تھیوری	296
تینتیس واں باب	یہ تیاری کا وقت ہے	300
چونتیس واں باب	عمل اور ردِعمل ۔ ردِعمل کی نفسیات	302
پینتیس واں باب	کون مخلص ہے	306
چھتیسواں باب	اقبال کی شاعری	309
سینتیس واں باب	سانحہ مشرقی پاکستان	314
اڑتیس واں باب	سانحہ لال مسجد	319
انتالیس واں باب	مصلحین (Reformers) کا کام	324
چالیس واں باب	اپنا مائنڈ سیٹ تبدیل کیجئے	328
اکتالیس واں باب	کرپشن کا علاج	331
بیالیس واں باب	''اعتدال پسند روشن خیالی'' (Enlightened Moderation)	333
ترایلیسواں باب	پختونوں کا مفاد	335
چوالیسواں باب	فرقہ بندی کا ناسور	341

Marfat.com

پیش لفظ

زیرِ نظر کتاب میں اس راقم نے امت مسلمہ کے عروج وزوال کا تجزیہ کر کے اُن عوامل کی نشان دہی کرنے کی کوشش کی ہے جن کی وجہ سے ہمارا زوال ہوا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ راقم نے وہ حل بھی تجویز کیا ہے جس پر عمل کر کے امت مسلمہ ایک باوقار مقام حاصل کر سکتی ہے۔ وہ حل کوئی مشکل، پیچیدہ اور ناممکن العمل نہیں، بلکہ ایک ایسا حل ہے جس پر اس وقت بھی دنیا کی بہت سی اقوام عمل کر رہی ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ اس راقم نے امتِ مسلمہ کے موجودہ اہم مسائل کے متعلق بھی اپنا تجزیہ اور اُن کا حل پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس راقم کے مطابق یہ ضروری ہے کہ پہلے ہر مسلمان ملک میں ایک واضح تبدیلی آئے، اس لیے راقم نے پاکستان کے مسائل کا بالخصوص جائزہ لیا ہے۔

اِس راقم کے نزدیک انسانیت، امتِ مسلمہ، پاکستان اور پاکستان کی معاشرتی اکائیوں کے مفادات کے درمیان کوئی اختلاف و تضاد نہیں ہے۔ چنانچہ کئی دوسرے اہم مسائل پر بھی اِس راقم نے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کی ہے۔

کتاب میں زیادہ حوالہ جات قصداً نہیں دیے گئے تاکہ کتاب بوجھل نہ ہو۔ یہ سارے تاریخی حقائق معلوم و معروف ہیں، البتہ اُن کا تجزیہ اس راقم کی ذاتی کاوش ہے۔ اِس ضمن میں ہر مثبت تنقید، تجویز اور مشورے کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

اس تجزیے کے مطابق عملی کام کے لیے راقم نے ''پاکستان اینڈ اُمہ فورم'' کی داغ بیل ڈالی ہے تاکہ اس ضمن میں ایک پریشر گروپ کے ذریعے پاکستان اور امتِ مسلمہ کے بالادست طبقات اور عوام کو اس پر قائل کیا جا سکے اور اِس تبدیلی کے لانے میں ایک موثر عملی کردار ادا کیا جا سکے۔

Marfat.com

یہ کتاب اکتوبر 2007ء میں مکمل ہوگئی تھی، اس لیے اس کے بعد کے واقعات کا تجزیہ اِس میں شامل نہیں ہے۔ تاہم اِس کتاب میں دیے گئے اصولوں کے مطابق ہر آدمی اِن حالات کا تجزیہ اور اُن کے حل کے بارے میں ایک مثبت اور محکم رائے تک پہنچ سکتا ہے۔

ڈاکٹر محمد فاروق خان

dmfkhan@gmail.com

جنوری 2008ء

Marfat.com

امت مسلمہ..........کامیابی کا راستہ

پہلا باب

موضوع کی ضرورت اور اہمیت

ہم ایک ایسے دور میں جی رہے ہیں جب عالم اسلام بہت سے اندرونی و بیرونی بحرانوں کا شکار ہے۔ یوں تو دنیا میں چھپن مسلمان ممالک موجود ہیں لیکن بلحاظِ مجموعی ہم ترقی یافتہ دنیا سے بہت پیچھے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ ہم کئی حوالوں سے غلامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں تو چنداں غلط نہ ہوگا۔ ترقی یافتہ دنیا جی بھر کر ہمارا استحصال کر رہی ہے۔ عالمِ اسلام کو باقی دنیا کے سامنے ایک خطرے کے روپ میں پیش کیا جا رہا ہے، اور بے شمار لوگوں کے نزدیک تو شاید ہر مسلمان دہشت گرد ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کہ عالمِ اسلام کو منظم طور پر ٹارگٹ کیا جا رہا ہو۔ عالمِ اسلام کے ایک بڑے حصے میں غیر ملکی افواج موجود ہیں۔ ان افواج کے ہاتھوں پچھلے تیس برسوں میں کئی ملین مسلمان موت سے ہم کنار ہو چکے ہیں اور سینکڑوں ارب ڈالر کا نقصان ہمیں پہنچایا جا چکا ہے۔ یہ ترقی یافتہ ممالک، خصوصاً امریکہ، جب چاہتے ہیں، مسلمان ممالک کو ڈراتے دھمکاتے ہیں، یہاں اپنے اڈے بناتے ہیں اور ان کی افواج نے پچھلے برسوں میں معصوم اور بے گناہ لوگوں پر لرزہ خیز مظالم ڈھائے ہیں۔

مغرب میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو کھلم کھلا بذاتِ خود اسلام ہی کو خطرہ قرار دیتے ہیں۔ ایسے نقطہ ہائے نظر وجود میں آ گئے ہیں جن کے خیال میں دنیا کی آئندہ ترقی اور حضرت مسیحؑ کی دوبارہ آمد کے لیے یہ ضروری ہے کہ یہودی مسلمانوں پر خوب ظلم ڈھائیں اور اس کام میں مسیحی بھی یہودیوں کی مدد کریں۔ مغرب کے کئی حکمران طبقے شعائرِ اسلام کی بے حرمتی کا کوئی موقع ہاتھ

Marfat.com

سے جانے نہیں دیتے اور اسلام کا مذاق اڑانے والے بد طینت لوگوں کو اعزازات سے نوازتے ہیں، اُن کو ہیرو بناتے ہیں اور ان کو آزادیٔ رائے کے علم بردار کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔

برطانیہ اور دوسرے مغربی ملکوں کی کوششوں سے وجود میں آنے والے اسرائیل نے پچھلے پچاس برس میں لاکھوں فلسطینیوں کو شہید کیا ہے اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ پچھلے بیس برس میں کشمیر کے اندر بھی ہزاروں مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتارا جا چکا ہے۔ افغانستان میں روسی مداخلت کے بعد اب تک کئی لاکھ افغانی اس لڑائی کی نذر ہو چکے ہیں۔ عراق میں امریکی مداخلت کے بعد وہاں مقتولین کی تعداد، ایک اندازے کے مطابق، چھ لاکھ سے بڑھ چکی ہے۔ چیچنیا میں روسی افواج نے لاکھوں مسلمانوں کو تہِ تیغ کر دیا ہے۔ بوسنیا میں سربیائی افواج نے مسلمانوں کا منظم قتلِ عام کیا۔ اس وقت صومالیہ سمیت بہت سے مسلمان ممالک میں غیر ملکی افواج موجود ہیں۔

دوسری طرف ہر معیار کے اعتبار سے عالمِ اسلام اس وقت بدحالی، کمزوری، نااتفاقی، بدانتظامی، اور بے انصافی کی آخری حد پر ہے۔ تمام عالم اسلام کی مجموعی قومی آمدنی (تیل والے ممالک کی آمدنی سمیت) ترقی یافتہ ممالک میں سے کسی ایک ملک کی آمدنی سے بھی کم ہے۔ سوائے ملائیشیا، کے کسی ملک کی کوئی خاص صنعتی بنیاد نہیں۔ چند افریقی ممالک کو چھوڑ کر ہمارے ہاں تعلیم سب سے کم ہے۔ صحت کی سہولتوں کا بھی یہی حال ہے۔ پورے عالم اسلام میں سے کسی ملک میں مضبوط ادارے موجود نہیں ہیں۔ دفاعی صنعت کے اعتبار سے صرف پاکستان کے پاس نیوکلیئر ٹیکنالوجی موجود ہے۔ ہوائی جہاز، ٹینک، توپ، آب دوز، بحری جہاز، ریڈار، بکتر بند گاڑیاں اور اس نوعیت کی دیگر تمام چیزوں کے لیے مسلمان دوسروں کے محتاج ہیں۔ ایک سعودی عرب کے علاوہ، باقی مسلمان ملکوں میں انصاف نام کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی۔ سعودی عرب کا انصاف بھی اپنے ملک کے باشندوں کے لیے کچھ اور ہے، اور دوسروں کے لیے کچھ اور ہے۔ ہم مسلمان ہر وقت مغرب پر دہرے معیار کا الزام لگاتے ہیں۔ یقیناً یہ الزام اس حد تک صحیح ہے کہ

Marfat.com

مغربی اور ترقی یافتہ ممالک اپنے اندرونی نظام میں تو نہیں، لیکن بیرونِ ملک تعلقات کے ضمن میں قابلِ مذمت دہرے معیار سے کام لیتی ہیں۔ تاہم اگر غیر جانبدارانہ تجزیہ کیا جائے تو یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جاسکتی ہے کہ مسلمان ممالک اندرونی اور بیرونی دونوں اعتبارات سے دہرے معیار سے کام لیتے ہیں۔ سارے مسلمان ملکوں میں بنگلہ دیش، ملائیشیا اور انڈونیشیا میں صرف کسی حد تک جمہوریت ہے۔ ایران میں انتخابات ہوتے ہیں، مگر اصل اختیار غیر منتخب قوتوں کے پاس ہے۔ ترکی میں بھی انتخابات ہوتے ہیں، مگر طاقت کا سرچشمہ فوج ہے۔ پاکستان کی صورت حال تو ہم سبھی کے سامنے ہے۔ جہاں تک عرب ممالک کا تعلق ہے تو وہاں یا بدترین فوجی آمریتیں ہیں یا خاندانی بادشاہتیں ہیں۔ حکمران خود اپنے عوام کو اپنے ملکی معاملات میں دخیل ہونے کا حق نہیں دیتے، اور عوام کی حیثیت رعایا سے زیادہ کچھ نہیں۔ مسلمان ملکوں میں کہیں بھی عدل اجتماعی نہیں۔ احتساب کے اداروں کا کوئی تصور ہی نہیں۔ حکمران ہر طرح کے قوانین سے بالاتر ہیں۔ مشرقِ وسطیٰ کے تیل کی ساری آمدنی درحقیقت حکمران کی ذاتی آمدنی ہوتی ہے۔ حکمران خاندانوں اور حکمران طبقوں کے لیے بالکل علیحدہ قوانین ہیں اور عام انسان کے لیے بالکل علیحدہ۔ مثلاً سعودی شاہی خاندان کے چھتیس ہزار اراکین کو ساری دنیا میں لامحدود مفت سفر کی سہولت حاصل ہے۔ یہی حالت تیل پیدا کرنے والے تمام باقی ممالک کی ہے۔ چند امیر مسلمان ممالک کو چھوڑ کر باقی ملکوں میں مفلوک الحال نچلے طبقے کی صورت حال بہت ناگفتہ بہ ہے۔ زندگی کی بنیادی سہولیات تک بھی ان کی رسائی نہیں۔ تعلیم، صحت، رہائش اور روزگار تک محض خوش قسمت کی رسائی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ان مقاصد کے حصول کے لیے رقم میسر نہیں، بلکہ پیسہ ہے، مگر وہ غلط ترجیحات، مخالفین کو دبانے اور حکمران طبقے اور ان کے چہیتوں کے کام آتا ہے۔

مسلمان ملکوں نے بلحاظ مجموعی صنعتی ترقی کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ ہمارے یہاں سائنس دانوں کی تعداد بہت کم ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی ہماری ترجیحات میں شامل نہیں ہے۔ پچھلے کئی سو برس میں کسی مسلمان ملک میں کوئی نئی ایجاد نہیں ہوئی۔ اسی لیے ہمیں ہر چیز میں مغربی

Marfat.com

ممالک کا محتاج ہونا پڑتا ہے۔ چنانچہ اگر وہ ہماری محتاجی کا فائدہ اٹھائیں، ہم پر اپنی شرائط مسلط کریں اور ہمارا بازو مروڑنے کی کوشش کریں تو اصل قصور یقیناً ہمارا ہی بنتا ہے۔

مسلمان ملکوں میں عام طور پر رشوت، کرپشن، سفارش، عیاشی اور کام چوری کا کلچر ہے۔ ہمارے امیر طبقے نے اپنی دولت کا بہت کم حصہ کمزور طبقے کے لیے مختص کیا ہے، وہ بھی عجیب ترجیحات کے ساتھ۔ مثلاً امارات کے امیر شیخ پاکستان اور بنگلہ دیش میں آ کر عظیم الشان مساجد تعمیر کر لیتے ہیں۔ حالانکہ ان کا سرمایہ یہاں مسجدوں میں نہیں، بلکہ کارخانوں میں لگنا چاہیے۔ مسجد تو ہر بستی کے مسلمان اپنے معاشی حالات کے مطابق لازماً تعمیر کر ہی لیتے ہیں۔

ہمارے عام لوگوں کی ترجیحات بھی کسی زندہ قوم کے شایانِ شان نہیں۔ ہم اپنے بچوں کی تعلیم کے بجائے شادی بیاہ اور دوسری تقریبات میں دکھاوے پر زیادہ رقم خرچ کرتے ہیں۔ ہم وقت کی قدر کرنا نہیں جانتے، اس لیے ہماری ایک بڑی کلچرل قدر مسلسل غمی شادی میں شریک ہونا ہے۔ ہمارے یہاں کسی بڑے جنازے کو اپنے بہت فخر اور دوسرے بہت قدر اور رشک کی نظر سے دیکھتے ہیں، خواہ اس میں قوم کے کتنے ہی قیمتی دن ضائع ہو جائیں۔

ہم لوگ بے حسی، خود غرضی، لاپروائی اور غیر ذمہ داری کے آخری مقام پر ہیں۔ سوائے پاکستان کے، اکثر مسلمان ممالک اپنے دفاع کی مطلوبہ صلاحیت نہیں رکھتے۔ مسلمان ممالک آپس میں پالیسیوں کی اعتبار سے بھی بالکل منتشر، غیر متفرق اور مختلف الخیال ہیں۔ ایک فلسطین کے متعلق کسی حد تک ذہنی ہم آہنگی موجود ہے، مگر اس کا معاملہ بھی یہ ہے کہ مصر کے مرحوم صدر سادات نے اسرائیل سے مذاکرات کے ذریعے سے صحرائے سینا تو واپس لے لیا اور غزہ کا فلسطینی علاقہ بدستور اسرائیل کے کنٹرول میں رہنے دیا، حالانکہ وہ علاقہ اسرائیل نے مصر سے ہی چھینا تھا۔ اسی طرح فلسطینیوں اور اردن کی آپس کی دشمنی سے ایک دنیا واقف ہے۔ شام اور فلسطینیوں کے درمیان بھی کئی اختلافات ہیں۔ ایک مدت سے پوری عرب دنیا نے عملاً فلسطینیوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا ہوا ہے۔ خود فلسطینیوں کا یہ حال ہے کہ وہ بیسیوں تنظیموں میں بٹے ہوئے ہیں جن کے

Marfat.com

درمیان وسیع اختلافات پائے جاتے ہیں۔

چنانچہ یہ ہے عالمِ اسلام کی زبوں حالی، دو عملی، کمزوری، نا اتفاقی اور دہرے معیار کا ایک مختصر خاکہ۔ اس حالت کے ساتھ تو ہمارا محض زندہ رہنا بھی ایک بڑی باعث حیرت بات ہے۔ کجا یہ کہ ہم یہ سوچ سکیں کہ اپنی اس حالت کو بدلے بغیر ہم دنیا کے ترقی یافتہ ممالک کے ہم پلہ بن سکیں گے، ان کا مقابلہ کر سکیں گے اور ان کی سازشوں کا توڑ کر سکیں گے۔ ایسا ممکن نہیں ہے۔ پہلے ہمیں اپنے گھر کو ہر اعتبار سے ٹھیک کرنا ہوگا تب کہیں جا کر ہم آگے کا سوچ سکیں گے۔

عالم اسلام کے حکمران ہوں یا سیاسی لیڈر، دانش ور ہوں یا مذہبی واعظ، صحافی ہوں یا کالم نگار، سب کے سب جذباتی الفاظ واصلاحات استعمال کرنے، جذباتی تقریریں اور کالم لکھنے اور ہر وقت عوام کو ایک سحر کے عالم میں رکھنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ عوام بھی اس انداز کو پسند کرتے ہیں۔ ہر مقرر اپنی تقریر میں یوں سماں باندھتا ہے جیسے پوری دنیا بس ہمارے ایک ہی وار کی زد میں ہے۔ ہر کالم نگار رائی کو یوں پہاڑ بناتا ہے کہ ہر نوجوان کا جی چاہتا ہے کہ ابھی اٹھ کر عالم کفر کو للکار کر تخت یا تختہ میں سے کسی کا انتخاب کر لے۔ ماضی کے کسی بھی واقعے کا حقیقت پسندانہ تجزیہ کرنے کے بجائے اس کو افسانہ طرازی کے انداز میں یوں پیش کیا جاتا ہے گویا ہم سے تو کبھی کوئی غلطی ہوئی ہی نہیں۔

ہمارے لیڈر ہماری ہر خواہش اور جذبے کو نعرے کی صورت دے کر دلوں کو گرماتے ہیں، چاہے وہ نعرہ یا دعویٰ کتنا ہی کھوکھلا کیوں نہ ہو۔ ''اب روس کے بعد امریکہ کی باری ہے''، ''ہم دہلی کے لال قلعہ پر سبز ہلالی پرچم لہرا کے رہیں گے''، ''سارا ہندوستان مسلمان ہونے والا ہے''، ''گرتی ہوئی دیواروں کو ایک دھکا اور دو''۔ اس طرح کے نعرے پاکستان میں عام سنائی دیتے ہیں۔ 1967ء میں ناصر نے کہا: ''ہم اسرائیل کو اٹھا کر بحیرۂ روم میں غرق کر دیں گے۔'' اس بیان کے تین چار دن بعد اسرائیل نے حملہ کر کے پانچ دن کے اندر اندر بشمول مصر تین ملکوں کو یوں شکست دی کہ سویز سے قاہرہ تک مصر کا ایک سپاہی بھی موجود نہیں تھا۔ خلیجی جنگ میں امریکی حملہ

Marfat.com

کے وقت صدام نے اسے "ام المحارب" یعنی جنگوں کی ماں قرار دیا۔ یہ جنگ تین دن میں عراق کی بدترین شکست پر اپنے انجام کو پہنچی۔

عالمِ اسلام کا ہر قائد اپنی ذات سے اوپر اٹھ کر کچھ سوچنے کے لیے تیار نہیں۔ ہر ایک اپنی حکومت برقرار رکھنے کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار رہتا ہے۔ اسی لیے کسی بھی ملک کے اندر متبادل لیڈر شپ نہیں ابھرتی۔ ہر حکمران مسلسل غلطیاں کرتا رہتا ہے اور اس کا خمیازہ پوری قوم کو بھگتنا پڑتا ہے۔ یہاں جمہوریت ہے نہ ادارے۔ نہ اجتماعی قربانی ہے، نہ انفرادی۔ نفسانفسی کا دور دورہ ہے۔ اسی لیے مسلمان ممالک نے پچھلے پچاس برسوں میں آپس میں نہایت خوف ناک جنگیں لڑی ہیں۔ صرف یہی نہیں، بلکہ خود کئی ملکوں کے اندر خانہ جنگیوں میں بھی لاکھوں جانیں ضائع ہوئی ہیں۔ مثلاً ایک لمبے عرصے تک انڈونیشیا اور ملائشیا کا آپس میں قضیہ چلتا رہا۔ یمن خانہ جنگی کا شکار رہا۔ سعودی عرب شمالی یمن کا طرف دار اور مصر جنوبی یمن کا حمایتی تھا۔ سعودی عرب کے فوجی، شمالی یمن کی طرف سے اور مصر کے فوجی، جنوبی یمن کی طرف سے لڑتے تھے۔ یہ لڑائی ایک لمبی مدت تک چلتی رہی جس میں دونوں طرف سے ہزاروں سپاہی ہلاک ہوئے۔ شام اور عراق میں خون ریز انقلاب آئے۔ شام میں ایک لمبے عرصے تک حکومت اور اخوان المسلمون کے درمیان مسلح جنگ ہوتی رہی۔ ایک دفعہ حکومت نے اخوان کے زیرِ قبضہ ایک شہر پر بمباری کر کے ایک تہائی شہر کو ملیامیٹ کر دیا۔ صرف اسی ایک حملے میں ہزاروں اموات ہوئیں۔ عراق میں صدام انتظامیہ نے اپنے سیاسی مخالفین اور کُرد علیحدگی پسندوں کے خلاف قتل و غارت کا بازار گرم کیے رکھا۔ افریقہ میں الجزائر، تیونس اور مراکش کا مغربی صحارا کے مسئلے پر آپس میں مناقشہ زوروں پر تھا۔ الجزائر میں 1991ء کے بعد خانہ جنگی شروع ہوئی جس میں ایک محتاط اندازے کے مطابق ایک لاکھ افراد ہلاک ہو چکے ہیں۔

پاکستان کی اپنی غلطیوں سے بنگالی عوام میں احساس محرومی آخری درجے میں پیدا ہوگیا۔ 1970ء کے انتخابی نتائج کو عملاً ماننے سے انکار اور مشرقی پاکستان میں فوجی ایکشن کے

Marfat.com

نتیجے میں خانہ جنگی برپا ہوئی، جس میں لاکھوں بنگالی بھی تہہ تیغ ہوئے اور پاکستانی افواج کو بھی ایک بڑے نقصان کے علاوہ ذلت آمیز شکست کا سامنا کرنا پڑا۔انڈونیشیا میں فوج کے دو متحارب دھڑوں کے درمیان لڑائی ہوئی۔ایک گروہ کمیونزم کا حامی، جب کہ دوسرا گروہ مغرب کا حامی تھا۔اس لڑائی میں بھی بہت نقصان ہوا۔اسی کے نتیجے میں سوہارتو برسراقتدار آئے اور اگلے پینتیس برسوں تک انڈونیشیا کے سیاہ وسفید کے مالک بنے رہے۔

افغانستان میں ظاہر شاہ کی پالیسیوں کی وجہ سے کمیونسٹوں کو بڑا اثر ونفوذ حاصل ہوگیا۔پھر سردار داؤد نے بھی ابتدا میں اس کو بڑھایا اور پھر جب اسے ہوش آیا تو پانی سر سے گزر چکا تھا۔1977ء میں سردار داؤد کا تختہ بھی الٹ کر ایک اشتراکی انقلاب برپا کردیا گیا۔خانہ جنگی میں اتنی شدت پیدا ہوئی کہ دو برس بعد روس نے اپنی فوج بھیج کر براہ راست مداخلت کردی۔سات برس بعد روسی افواج واپس ہوئیں۔لیکن ان کی واپسی کے مزید چار سال بعد تک کابل اور دوسرے اہم شہروں پر نجیب کی حامی افواج کا قبضہ رہا، اور لڑائی جاری رہی۔گویا روسیوں کا بھیانک جرم اپنی جگہ پر، مگر اصل میں تو یہ افغان تھے جو آپس میں لڑتے رہے اور آج تک لڑتے چلے آرہے ہیں۔

1980ء کی دہائی میں عراق نے ایران پر حملہ کردیا۔یہ لڑائی آٹھ برس جاری رہی اور اس میں دونوں طرف سے دس لاکھ افراد ہلاک ہوئے، چھ لاکھ ایرانی اور چار لاکھ عراقی۔نہ صرف پوری دنیا بلکہ مسلمان ممالک کی تنظیم او آئی سی بھی تماشا دیکھتی رہی۔جہاں ایک طرف ایران کی ساری آمدنی اسلحہ پر لگ گئی، وہاں مال دار عرب ممالک مسلسل عراق کی مدد کرتے رہے۔آٹھ برس بعد یہ بے نتیجہ اور فضول جنگ اس وقت ختم ہوئی جب دونوں طاقتوں میں لڑنے کا دم خم رہا ہی نہیں۔

اس کے بعد عراق نے ایک سرحدی تنازعہ کو بہانہ بنا کر کویت پر قبضہ کرلیا۔اقوام متحدہ کے جھنڈے تلے پوری دنیا عراق کے خلاف صف آرا ہوگئی۔عراق سے بار بار اپیلیں کی

Marfat.com

گئیں۔اقوام متحدہ کی قراردادیں سخت سے سخت تر ہو گئیں۔مگر صدام کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔بالآخر امریکہ کی زیر قیادت ایک فوجی آپریشن کے ذریعے سے چند ہی دنوں میں عراق کو کویت سے نکال باہر کیا گیا۔اس تنازعہ میں لاکھوں اموات کے علاوہ تمام عرب ممالک کی معیشت کا بیڑا غرق ہو گیا۔

یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ پچھلے پچاس برس کے دوران میں مسلمانوں نے آپس کی خانہ جنگیوں میں ایک دوسرے کا بہت خون بہایا ہے۔ہمارا ہی ایک طبقہ بڑی آسانی سے یہ کہہ کر مطمئن ہو جاتا ہے کہ یہ سب کچھ غیروں کی سازشوں سے ہوا۔لیکن یہ محض حقائق سے آنکھیں چرانے والی بات ہے۔سوال یہ ہے کہ صرف ہم ہی کیوں دوسروں کی سازشوں کا آلۂ کار اور شکار بنتے ہیں؟ تلخ حقیقت تو یہ ہے کہ اصل خرابی دراصل ہم میں ہے اور اگر ہم میں خامی وکمزوری نہ ہو تو کوئی طاقت بھی ہمیں اپنا آلۂ کار نہیں بنا سکتی۔اجتماعی معاملات میں قدرت کے کچھ اصول ہیں جن کی بنیاد پر معاشرہ آگے بڑھتا ہے یا پیچھے رہ جاتا ہے۔پیچھے رہ جانے والے لوگ ہمیشہ سازشوں کی دہائی دیتے ہیں۔حالانکہ پس ماندگی کے اسباب میں سازش کو وجہ جواز بنا لینا دراصل ایک ملک کو کوشش سے محروم کر دیتا ہے۔چنانچہ آئندہ صفحات میں ہماری یہ کوشش ہو گی کہ جذباتیت،اور تعصب کے بجائے انصاف اور غیر جانبداری کے ساتھ امتِ مسلمہ کی موجودہ بے توقیری کا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ ہماری کامیابی کا راستہ کیا ہے۔

Marfat.com

دوسرا باب

کامیاب ممالک کی حکمتِ عملی

اس دنیا میں ہمیشہ سے یہ طریقہ چلا آرہا ہے کہ کچھ اقوام بہت کامیاب ہو جاتی ہیں، حتیٰ کہ وہ اپنے وقت کی سُپر پاور بن جاتی ہیں۔ کچھ ریاستیں اتنی کامیاب تو نہیں بنتیں لیکن بہر حال باوقار طریقے سے زندگی بسر کرتی ہیں۔ جب کہ اس کے برعکس کچھ قومیں بہت کمزوری کی حالت میں زندگی بسر کرتی ہیں، اور وہ اکثر اوقات حقیقتاً یا عملاً غلامی کی زندگی گزارتی ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ درحقیقت یہ سارا اُتار چڑھاؤ کچھ عوامل کا مرہونِ منت ہوتا ہے۔

معلوم تاریخ کا پہلا دور

وقت اور حالات کی مناسبت سے ان عوامل میں کچھ تبدیلیاں بھی آتی ہیں، تاہم ان کا بنیادی ڈھانچہ یکساں ہوتا ہے۔ مثلاً آج سے چند صدیاں قبل وہ عوامل جو کسی قوم کی تقدیر کا فیصلہ کرتے تھے، درج ذیل تھے

- کسی بڑے مقصد پر اتفاق
- امورِ مملکت مشورے سے چلانا
- انصاف

قوموں کی ترقی، بقا اور غلبے کے لئے یہ ضروری تھا کہ ان کا کسی بڑے مقصد پر اتفاق ہو۔ یہ مقصد عموماً جہانگیری ہوا کرتا تھا، یعنی یہ کہ زیادہ سے زیادہ علاقوں کو فتح کیا جائے، وہاں کی رعایا کو اپنا باج گزار بنایا جائے اور دوسروں کے وسائل سے فائدہ اٹھایا جائے۔ عموماً کوئی بادشاہ اس کا خواب دیکھتا تھا اور پھر وہ اپنی پوری قوم میں اس کے لیے ایک جوش و جذبہ بھر رہتا تھا۔ یوں یہ قوم پرعزم اور توانا ہو جاتی تھی اور بہت سے علاقوں کو فتح کر لیتی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس عمل کو

Marfat.com

کہیں نہ کہیں تو ٹھہرنا ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کے بعد ٹھہراؤ کا ایک دور آتا تھا۔ چند نسلوں تک یہ آن بان اور شان قائم رہتی تھی۔ پھر عام طور پر بادشاہ اور رعایا دونوں سُستی اور آرام طلبی کے رسیا ہو جاتے تھے۔ چنانچہ کوئی دوسری زیادہ پُرعزم قوم اس کو اپنا غلام یا اطاعت گزار بنالیتی تھی۔ یوں یہ پہیہ چلتا رہتا تھا۔

پچھلے زمانوں میں بھی جن ممالک میں بادشاہ اور اُمرا مشورے کو اہمیت دیتے تھے اور اتفاق رائے سے فیصلے کیے جاتے تھے، وہ اقوام زیادہ کامیاب رہتی تھیں۔ تاریخ میں جتنی بڑی سلطنتوں کی شان وشوکت کے قصے بیان کیے جاتے ہیں، وہاں مشورے کو بنیادی حیثیت حاصل ہوتی تھی۔ حتیٰ کہ منگولوں کے حکمرانوں، چنگیز خان، ہلاکو خان اور قبلائی خان جنہیں تاریخ وحشی حکمرانوں کی حیثیت سے جانتی ہے، جیسے لوگوں کے ہاں بھی مشورے کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھایا جاتا تھا۔ اس کے برعکس جہاں جہاں مطلق العنان بادشاہ ہوتے تھے، وہاں بہت جلد سازشیں جڑ پکڑ لیتی تھیں، بغاوتیں ہوتی تھیں اور قسم قسم کے خطرات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

اسی طرح جن ملکوں میں انصاف کا دور دورہ ہوتا تھا، وہاں کے رعایا بادشاہ سے خوش ہوتے تھے اور ملک کے اندر معاشی اعتبار سے بھی خوش حالی ہوتی تھی، اسی لئے یہ ملک نسبتاً پائیدار ہوتے تھے اور دشمنوں کے حملے کے وقت سارے رعایا مل کر دشمن کا مقابلہ کرتے تھے۔

یہ بھی واضح رہے کہ ہر زمانے میں چھوٹی اور بڑی اقوام ہوتی ہیں۔ چنانچہ جن اقوام کا رقبہ اور آبادی زیادہ نہیں ہوتی تھی یا ان کے پاس زرعی زمینیں نہیں ہوتی تھیں، وہ ملک صبر اور بہتر حکمت عملی کے ذریعے اپنا بچاؤ کرتے تھے۔ یعنی وہ ہر پیش آمدہ خطرے پر ٹھنڈے دل سے غور وفکر کرتے، پورے حساب کتاب کے ساتھ اپنے اور حملہ آور قوم کے تناسب پر غور کرتے اور اگر اس نتیجے پر پہنچ جاتے کہ وہ لڑائی میں جیت سکتے ہیں تو مسلح دفاع کرتے۔ ورنہ صلح کر کے یہ وعدہ کرتے کہ وہ حملہ آور قوم کو سالانہ اتنا خراج (ٹیکس) دیں گے۔ یوں وہ وقتی طور پر اپنے آپ کو محفوظ کر لیتے اور پھر جب دشمن کچھ اور عوامل کے نتیجے میں کمزور ہو جاتا، تب یہ لوگ بھی کامل آزادی کا

Marfat.com

اعلان کر لیتے۔

جن اقوام، خصوصاً چھوٹی اقدام، نے صبر و حکمت سے کام لیا، انہوں نے تاریخ میں اپنے آپ کو زندہ رکھا، اپنے لوگوں کو فنا کے گھاٹ اترنے اور مصیبتوں سے محفوظ رکھا اور اس طرح دوسروں سے بہتر زندگی گزاری۔

تاریخ کا دوسرا اور حالیہ دور

حالیہ دور میں جو عوامل کسی قوم کی کامیابی و ناکامی کا فیصلہ کرتے ہیں، اُن میں کچھ تبدیلی آ گئی ہے۔ مگر اس حالیہ دور کی ابتدا کہاں سے ہوتی ہے، اہلِ علم اور مفکرین نے اس کے کئی جوابات دیے ہیں۔ کسی کے نزدیک یہ دور یورپ میں ریناساں (Renaissance)، یعنی نشاۃ ثانیہ سے ہوا۔ کچھ اور اہلِ علم کے مطابق اس کی ابتدا ریفارمیشن (Reformation) یعنی اُس تحریکِ اصلاحِ مذہب سے ہوئی جو مارٹن لوتھر کنگ نے شروع کی تھی۔ بعض مفکرین کے خیال میں حالیہ دور کی ابتدا صنعتی انقلاب (Industrial Revolution) سے ہوتی ہے جس میں بھاپ، لوہے اور تیل کے استعمال سے تیز رفتار ترقی ممکن ہوئی۔ تاہم اس راقم کے نزدیک حالیہ دور کی ابتدا بنیادی طور پر 1440ء میں اُس وقت ہوئی جب جرمنی میں گٹن برگ نے چھاپہ خانہ ایجاد کیا۔ اس ایجاد سے بڑے پیمانے پر کتابوں کی اشاعت ممکن ہوئی، چنانچہ عام لوگ بہت تیزی کے ساتھ نئے علوم وفنون سے واقف ہوئے۔ اور جب چھاپہ خانے کے ذریعے بائبل بھی بہت بڑی تعداد میں شائع ہوئی تو لوگوں میں احساس پیدا ہوا کہ وہ خود بھی بائبل کو پڑھ سکتے اور سمجھ سکتے ہیں، چنانچہ یہ ضروری نہیں کہ وہ بائبل کی وہی تعبیر مانیں جو پادری اب تک اُن کے سامنے پیش کررہے تھے۔ اس طرح عیسائی دنیا کے ایک بڑے حصے پر اہلِ مذہب کی اجارہ داری ختم ہوگئی۔

جب پوری سوسائٹی میں علم سیکھنے اور سکھانے کا شوق بڑھ گیا تو انسان کے تجسس میں بھی اضافہ ہوگیا۔ اس سے نئی نئی ایجادات نے جنم لیا، جس کا نتیجہ صنعتی انقلاب کی شکل میں سامنے آیا۔

Marfat.com

اس صنعتی انقلاب کی وجہ سے معاشرے میں دولت آئی، نئے نئے طبقات وجود میں آگئے، اُن طبقات میں اپنے حقوق کا احساس پیدا ہوا اور اسی احساس نے جمہوریت کو جنم دیا۔

گویا حالیہ دور کی ابتدا دراصل تعلیم سے ہوئی۔ تعلیم ہی وہ کنجی ہے جس سے ترقی کا تالہ کھلتا ہے۔ جب علم پر کچھ خاص طبقات کی اجارہ داری ختم ہوئی اور عوام کو تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا تو اُن کے اندر آگہی پیدا ہوئی اور اُن میں اپنے آپ پر اعتماد پیدا ہوا۔ یہی اعتماد وقار، عزت اور ترقی کی بنیاد ہے۔

حالیہ دور میں آگے بڑھنے اور باوقار زندگی گزارنے کے لیے درج ذیل عوامل لازم ہیں۔

- تعلیم سب کے لیے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر بچے کی پہلی بارہ سال کی تعلیم مفت، لازمی اور یکساں ہو، ملک کے اندر سائنسی تعلیم کا جال بچھا ہوا ہو، عزت کا سب سے بڑا شرف تعلیم ہو، اور تعلیم ہی مملکت کی اولین ترجیح ہو۔
- جمہوری کلچر، جس کا مطلب یہ ہے کہ حکومت عوام کی مرضی سے منتخب ہو، عوام کی مرضی سے ختم ہو، حکومت ہر معاملے میں عوام کے سامنے جواب دہ ہو، ہر چیز کے لیے ادارے قائم ہوں، سارے ادارے پارلیمنٹ کے سامنے جواب دہ ہوں، سارے حکومتی معاملات شفاف ہوں، ہر اہم معاملے کا فیصلہ مشورے سے ہو، آزاد پریس ہو اور احتساب کا آزاد اور کڑا انظام نافذ ہو۔
- انصاف، جس کا مطلب یہ ہے کہ عدالتیں آزاد ہوں، انصاف سستا اور جلد ملتا ہو، لوگوں کے اندر ہر اجتماعی معاملے میں احساسِ ذمہ داری پیدا ہو، وہ ہر خطرے سے بے نیاز ہو کر گواہی دیں، پولیس دیانت دار ہو اور انصاف کسی حالت میں خریدا نہ جا سکے۔ اس کا یہ بھی مطلب ہے کہ معاشرے میں ہر فرد ہر وقت یہ سوچے کہ کیا وہ ہر عمل انصاف کے مطابق کر رہا ہے۔ یعنی سوسائٹی کی ترقی کے لیے یہ ضروری ہے کہ اجتماعی زندگی میں انصاف بطور زندہ قدر (Value)

Marfat.com

جاری وساری ہو۔

O صبر و حکمت، یعنی سوسائٹی میں دانش مندی اور مکالمے کا دور دورہ ہو۔ ہر معاملے پر ٹھنڈے دل ودماغ کے ساتھ غور وفکر کیا جائے۔ فوری ردِعمل (Instant Reaction) نہ کیا جائے۔ جذباتیت سے کام نہ لیا جائے۔ ہر فیصلے کے دوررس نتائج پر نگاہ رکھی جائے۔ ٹکراؤ اور مڈھ بھیڑ (confrontation) کے بجائے تدبر کے ساتھ، اپنے موقف پر قائم رہتے ہوئے حالات کے بدلنے کا انتظار کیا جائے۔ صبر و حکمت کا یہ بھی مطلب ہے کہ حکمران، سیاسی لیڈر اور مذہبی رہنما عوام کے اندر ہیجان اور سنسنی خیزی (Sensationlism) پیدا نہ کریں، بلکہ عوام کو سوچنے سمجھنے اور مکالمے کی ترغیب دیں۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ پہلے دور کے ایک اہم عامل یعنی ''کسی بڑے مقصد پر اتفاق'' کو ہم نے جدید دور کے عوامل میں شامل نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جمہوریت کی وجہ سے اب ہر ملک کو ایک بڑا مقصد مل گیا ہے۔ وہ مقصد ہے اپنے ملک کو بحیثیتِ ملک ترقی دینا اور اس کا بچاؤ کرنا۔

ان عوامل کے کچھ اہم فوائد

جمہوریت کی وجہ سے سوسائٹی میں مساواتِ انسانی کا شعور بڑھتا ہے۔ ہر انسان اپنے آپ کو پوری قوم کا ایک زندہ حصہ تصور کرتا ہے، اُسے خوداعتمادی حاصل ہوتی ہے اور پوری قوم کے اندر ہر وقت آگہی کی کیفیت موجود ہوتی ہے۔ انصاف کی وجہ سے سوسائٹی میں امانت و دیانت فروغ پاتی ہے اور میرٹ کا اصول پروان چڑھتا ہے یعنی یہ کہ ہر فرد کو قابلیت وصلاحیت کی بنیاد پر جانچا جائے۔ جس سوسائٹی میں انصاف کا دور دورہ ہو، وہاں رشوت و سفارش کم ہوتی جاتی ہے، سب کے لیے ترقی کے یکساں مواقع وجود میں آتے ہیں اور لوگ ملکی قانون کی پابندی کرتے ہیں۔ گویا کوئی بھی اپنے آپ کو قانون سے بالاتر نہیں سمجھتا۔

تعلیم اِن سب اقدار (Values) کی ماں ہے۔ اس سے سوسائٹی کے اندر محنت کی

Marfat.com

قدر پیدا ہوتی ہے۔ سوسائٹی میں محنت کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ نئی نئی ایجادات ہوتی ہیں۔ معیارِ زندگی اور دولت کا براہِ راست تعلق تعلیم سے جُڑ جاتا ہے۔ ہر جگہ صحت مند مقابلے کا رجحان پیدا ہو جاتا ہے۔ لوگ صحت کی طرف توجہ دینے لگتے ہیں۔ جذباتیت اور تعصبات کم سے کم تر ہونے لگتے ہیں۔ سوسائٹی کے اندر محروم، غریب اور کمزور طبقات کی خدمت کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے اور اس مقصد کے حصول کے لیے بہت سے ادارے وجود میں آجاتے ہیں۔

درج بالا چار اقدار گویا ترقی کا دروازہ ہیں، جس کے بعد خودکار طریقے سے دوسری مفید اقدار (Values) جنم لیتی ہیں اور ہر معاملے کے لیے ادارے وجود میں آجاتے ہیں۔

چھوٹی اقوام کے لیے باوقار زندہ رہنے کا راستہ

حالیہ دور میں دنیا کے اندر عموماً وہی ملک سُپر پاور بنتا ہے جس کی آبادی زیادہ ہو، رقبہ بڑا ہو اور وہ قدرتی وسائل پر دسترس رکھتا ہو۔ لیکن اگر سُپر پاورز بلاشرکتِ غیرے پوری دنیا کے مالک بن جائیں تو یہ دنیا آزمائش کی دنیا کے بجائے غلامی کی دنیا بن جائے گی۔ چنانچہ پروردگار نے چھوٹی اقوام کو زندہ رہنے، آگے بڑھنے اور مضبوط بننے کا طریقہ بھی رکھا ہے۔ قدرت نے ایسا انتظام کر رکھا ہے کہ اگر ایک چھوٹی قوم باوقار طریقے سے زندہ رہنے کا فیصلہ کرلے تو سُپر پاورز کوشش کے باوجود اُس کو اپنے زیرِ نگیں نہیں لاسکتیں۔ آج کے حوالے سے درج بالا چار میدان ایسے ہیں جہاں پیش رفت کے نتیجے میں ایک چھوٹی قوم بھی محیرالعقول کارنامے انجام دے سکتی ہے، بلکہ اپنے آپ کو کئی پہلوؤں سے سُپر پاورز کے لیے ناگزیر بھی بنا سکتی ہے۔ یورپ کی کئی چھوٹی مملکتیں اس کی زندہ مثال ہیں۔ مثلاً آٹھ ملین کی آبادی کے ایک ملک آسٹریا کی مجموعی قومی آمدنی عالمِ اسلام کے کسی بھی ملک (بشمول تیل پیدا کرنے والے ممالک) سے زیادہ ہے۔ عالمِ اسلام میں اس معاملے میں کسی حد تک ملائیشیا کی مثال دی جاسکتی ہے۔ پچھلے مالیاتی بحران، جس میں مشرقِ بعید کے سارے ممالک کا معاشی نظام بیٹھ گیا تھا، سے ملائیشیا کامیابی کے ساتھ بچ گیا۔ خارجہ تعلقات میں ملائیشیا کا موقف بہت جرأت مندانہ ہے لیکن سُپر پاورز اُس کے خلاف آج تک

Marfat.com

کوئی انتقامی کاروائی نہیں کرسکیں۔

لیکن اگر کسی چھوٹی قوم کے اندر درج بالا چار میدانوں میں کمزوری ہو یا سرے سے ہی اُس کا شعور مفقود ہو تو پھر بڑی طاقتیں اُس کو اپنے پنجوں میں دبوچ لیتی ہیں۔ اُس کی معیشت پر براہِ راست یا بالواسطہ قبضہ کر لیتی ہیں۔ اُس کے حکمرانوں کو اپنی مرضی کے مطابق چلانے کی کوشش کرتی ہیں۔ کیونکہ قانونِ قدرت ہے کہ بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو نگل لیتی ہے۔

گویا اگر کوئی چھوٹی قوم اپنے آپ کو سُپر پاورز کے جبڑوں سے نکالنا چاہے، تو اُسے درج بالا چار عوامل پر عمل پیرا ہونا ہوگا۔ یہ بھی بڑی اہم بات ہے کہ اگر کوئی چھوٹی قوم متحد ہو کر ان چار میدانوں میں پیش رفت کرنے کا تہیہ کرلے تو سُپر پاورز اُس کو روک نہیں سکتیں اور اُن کی سازشوں کو قدرت ناکام بنادیتی ہے۔ گویا سُپر پاورز سے گلوخلاصی کوئی ناممکن کام نہیں۔ اصل ضرورت عزمِ صمیم اور صبر و استقامت کے ساتھ ایک فیصلہ کرنے کی ہے۔ باقی کام قانونِ قدرت خود بخود کردیتا ہے۔

Marfat.com

تیسرا باب

قومیں سُپر پاورز کیسے بنتی ہیں

پچھلے باب میں ہم نے دیکھا کہ اگر کوئی قوم چار بنیادی صفات یعنی تعلیم، جمہوریت، انصاف اور صبر و حکمت کو اپنے لیے بنیادی اقدار بنائے تو وہ دنیا میں عزت اور وقار کی زندگی بسر کرتی ہے۔ اور اگر وہ ان بنیادی عوامل کی طرف توجہ نہ دے تو وہ کمزوری اور بے عزتی کی زندگی گزارتی ہے جو بعض حالات میں معاشی غلامی سے بڑھ کر حقیقی غلامی تک بھی جا سکتی ہے۔ اب ہم یہ دیکھیں گے کہ قوموں کی برادری میں کچھ اقوام بہت آگے کیسے بڑھ جاتی ہیں اور سُپر پاور کا درجہ کیسے حاصل کر لیتی ہیں۔ سُپر پاور بننے کے لیے مزید تین چیزوں کی ضرورت ہے۔ وہ ہیں:

- سائنس اور ٹیکنالوجی پر دوسروں سے بڑھ کر دسترس
- بڑا رقبہ، زیادہ آبادی اور قدرتی وسائل پر دسترس
- صحیح حکمت عملی

اب ہم ان تینوں کی مزید تفصیل میں جانے کی کوشش کریں گے۔

سائنس اور ٹیکنالوجی

سُپر پاور بننے اور برقرار رہنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی پر اعلیٰ ترین دسترس حاصل کی جائے اور اس معیار کو نمو و ترقی کے ذریعے برقرار رکھا جائے۔ یہ ترقی صنعتی، زرعی، طبی، دفاعی اور جنگی، غرض یہ کہ ہر میدان میں ہونی چاہیے۔ گویا جدید ترین علم کا مسلسل حصول اور اُس کا استعمال و اطلاق ایک سُپر پاور کے لیے زندگی اور موت کا سوال ہے۔ ظاہر ہے کہ اس غرض کے لیے تعلیم، ریسرچ، دریافت اور اس سے متعلقہ تمام پہلوؤں کی طرف آخری درجے میں بھرپور توجہ ضروری ہے۔ چنانچہ سُپر پاورز یہ سب کام کرتی ہیں اور یہ اُن کے لیے اہم ترین شعبہ ہوتا ہے۔

Marfat.com

ٹیکنالوجی کی برتری کی وجہ سے انگریزوں، فرانسیسیوں، پرتگیزوں اور ولندیزیوں نے سترہویں اور اٹھارویں صدی میں مسلم دنیا سمیت افریقہ اور ایشیا کے بہت بڑے علاقوں پر قبضہ جمالیا جو انیسویں صدی کے نصف تک جاری رہا۔ ٹیکنالوجی کے فرق ہی کی وجہ سے سراج الدولہ اور ٹیپو سلطان انگریزوں کے مقابلے میں شکست کھا گئے۔ بہتر ٹیکنالوجی اور تنظیم کی وجہ سے 1857ء کی جنگِ آزادی میں حریت پسندوں کے مقابلے میں انگریز کامیاب رہے۔

ٹیکنالوجی ہی کی مدد سے امریکہ نے 1985ء میں روس کو افغانستان میں شکست دی، جب اسٹنگر میزائلوں نے روسی ہیلی کاپٹروں پر نوے فیصد ٹھیک نشانے لگا کر ان کی فضائی برتری ختم کردی۔ اسی وجہ سے برطانیہ نے ارجنٹائن کے بالکل پاس جا کر فاک لینڈ کی جنگ میں اُسے شکست سے دوچار کیا۔ یہ ٹیکنالوجی ہی کا کرشمہ تھا کہ امریکہ نے طالبان اور صدام کو شکست سے دوچار کیا۔ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کی ایجاد بھی امریکہ ہی میں ہوئی۔

گویا جو بھی طاقت اپنے آپ کو برتری کے مقام پر فائز دیکھنا چاہتی ہو، اُس کے لیے لازم ہے کہ وہ سائنسی علوم اور ٹیکنالوجی کے میدان میں اعلیٰ ترین مقام پر فائز ہو۔

رقبہ، آبادی اور قدرتی وسائل

جس ملک کا رقبہ بڑا ہو، آبادی زیادہ ہو اور وہ قدرتی وسائل پر دسترس رکھتا ہو، اُتنا ہی اُس کے سُپر پاور بننے کا امکان زیادہ ہو جاتا ہے اور اگر وہ اُس مقام پر نہ رہے تب بھی وہ کامل زوال اور فنا سے بچ جاتا ہے۔ امریکہ کے ایک بڑی طاقت بننے میں اُس کے رقبے اور آبادی کا بڑا دخل ہے۔ چین بھی انہی دو عوامل کی وجہ سے ایک بڑی طاقت کے طور پر جانا جاتا ہے۔ سویت یونین بھی اپنے رقبے اور آبادی کی وجہ سے سُپر پاور بن گیا تھا۔ اگرچہ اختیارات کی مرکزیت اور جمہوریت کے نہ ہونے کی وجہ سے سویت یونین تو ختم ہو گیا، مگر اس کے باوجود روس ایک بڑی طاقت کے طور پر ابھر رہا ہے اور اغلباً اگلے چند برس میں اُس کی عظمتِ رفتہ پھر بحال ہو جائے گی۔

Marfat.com

صحیح حکمت عملی

سُپر پاور بننے، برقرار رہنے اور اپنے آپ کو حال اور مستقبل کی مشکلات سے بچانے کی خاطر عالمی حالات کا صحیح تجزیہ اور اُس کے مطابق عمل کرنا بھی حد درجہ ضروری ہے۔ یہ حکمتِ عملی زمانۂ امن اور زمانۂ جنگ، دونوں میں ہوتی ہے۔ ہر جنگ اور ہر معرکے میں اُسی ملک کو کامیابی ملی ہے جس نے بہتر حکمت عملی کا مظاہرہ کیا۔ جب یورپ نے دیکھا کہ اس کا رقبہ بڑھتی ہوئی آبادی کو سنبھالنے کے لیے کافی نہیں ہے تو اُس نے دوسرے ممالک کو اپنی نوآبادی بنایا۔ اور پھر جب یورپی ممالک نے دیکھا کہ حالات کی تبدیلی کی وجہ سے اب اُن کے لیے اپنی نوآبادیات کو قابو میں رکھنا ممکن نہیں ہے تو انہوں نے آہستہ آہستہ تمام غلام ملکوں کو آزاد کر کے اپنی قوت محفوظ کر لی۔

چین نے بھی خارجہ حکمت عملی کے میدان میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔ تائیوان اسی کا جزو ہے جو امریکی پشت پناہی سے آزاد ملک کی حیثیت سے زندہ ہے، مگر چین نے آج تک اس کے خلاف کوئی فوجی کارروائی نہیں کی، اس لیے کہ وہ جانتا ہے کہ اس سے وہ مشکلات میں پھنس جائے گا۔ اسی طرح ایک لمبے عرصے سے اس نے یہ پالیسی بنائی ہے کہ وہ کسی بین الاقوامی معاملے میں براہ راست مداخلت نہیں کرے گا۔ چنانچہ 1971ء کی جنگ میں اس نے پاکستان کی کوئی فوجی مدد نہیں کی، حالانکہ اس کی عملی مداخلت کی صرف دھمکی ہی بنگلہ دیش بننے میں بڑی رکاوٹ ثابت ہو سکتی تھی۔ اسی طرح 1984ء میں سیاچین پر بھارتی قبضے کے وقت بھی اس نے کوئی سرگرمی نہیں دکھائی۔ 1999ء میں پاکستان نے کارگل کے محاذ پر جو لڑائی شروع کی، اس پر بھی چین نے ناراضگی کا اظہار کیا اور پاکستان کی عملی مدد سے انکار کیا۔ دراصل چین کی حکمت عملی یہ ہے کہ ایک بھر پور عالمی طاقت بننے تک وہ امریکہ سے کسی بھی طرح بگاڑ پیدا نہ کرے تا کہ امریکہ کو اس کے خلاف کارروائی کا کوئی جواز نہ مل سکے۔

اسی طرح جب چین نے دیکھا کہ کمیونزم اس کی معاشی ترقی میں رکاوٹ بن رہا ہے تو اس نے بہت عرصہ پہلے بڑے شہروں میں سرمایہ دارانہ نظام کو پھلنے پھولنے کی آزادی دی۔ اسی

Marfat.com

لیے جب روس اور باقی کیمونسٹ دنیا میں بغاوت کی لہر پورے زوروں پر تھی، چین اس سے نسبتاً محفوظ تھا۔ کیمونسٹ پارٹی نے اقتدار پر سے تو اپنی گرفت کمزور نہیں کی لیکن عوام کو مزید معاشی آزادی دے کر اس نے اپنے ہاں بغاوت پر قابو پالیا۔ اور نومبر 2002 میں بوڑھی قیادت نے نئی قیادت کے لیے جگہ چھوڑ کر ایک بڑا کارنامہ سرانجام دے دیا۔

سپر پاورز دنیا میں اپنی سودے بازی کی قوت برقرار رکھنے کی خاطر اپنے سخت ترین مخالف ملکوں کو بھی قرضے اور امداد دیتی ہیں۔ مثلاً مغربی ممالک غیر ترقی یافتہ دنیا کے تمام ملکوں کو امداد دیتے ہیں، جس میں اُن کے بدترین مخالف بھی شامل ہوتے ہیں۔ اس سے اُن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ رابطے کا دروازہ کھلا رہے اور مناسب موقع پر اسے استعمال کیا جائے۔ سپر پاورز اپنی غلطیوں سے بھی بہت کچھ سیکھتی ہیں۔ مثلاً پچھلی صدی میں امریکہ نے بہت سی کامیابیاں حاصل کی ہیں، تاہم امریکہ میں ان کامیابیوں کو بہت کم یاد رکھا جاتا ہے۔ امریکہ کی ایک بہت بڑی غلطی ویت نام میں فوجی مداخلت تھی۔ امریکہ کے دارالحکومت واشنگٹن کی اہم ترین یادگاروں میں سے ایک ویت نام جنگ کی یادگار ہے۔ اس عجیب وغریب یادگار پر اُن تمام اڑسٹھ ہزار (68000) ہلاک شدہ فوجیوں کے نام بمعہ کمپنی ورجمنٹ کندہ ہیں جو اس جنگ میں کام آئے۔ اس یادگار پر روزانہ سینکڑوں افراد آتے ہیں اور میموریل ڈے پر تو وہاں ہزاروں افراد کے میلے کا سماں رہتا ہے۔ یہ عام انسانی نفسیات ہے کہ لوگ اپنی ناکامیاں فراموش کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ جیسے ہم لوگ بحیثیتِ قوم سقوطِ مشرقی پاکستان کی یاد کبھی نہیں مناتے، لیکن ہم چھ ستمبر کی چھٹی ضرور کرتے ہیں اور اپنے آپ کو یہ دھوکہ دیتے ہیں کہ ہم نے 1965ء کی جنگ جیتی۔ لیکن زندہ قومیں اپنی کامیابیوں کی بجائے ناکامیوں کو ایک زندہ واقعے کے طور پر یاد رکھتی ہیں اور ہر ہر حوالے اور پہلو سے اُن کا تجزیہ کرتی ہیں تاکہ آئندہ اُس کے اعادے سے بچا جاسکے۔

سپر پاورز کی نفسیات اور اس سے جنم لینے والے جرائم

دنیا کی پوری تاریخ میں سپر پاورز کی ہمیشہ سے ایک ہی نفسیات رہی ہے۔ اس کو ایک

Marfat.com

فقرے میں یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ ایک سُپر پاور یہ چاہتی ہے کہ وہ مستقلاً ایک سُپر پاور کے طور پر قائم رہے اور اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے وہ سب کچھ کرنے پر آمادہ رہتی ہے۔

چونکہ ہر سُپر پاور ایک قوم کی بنیاد پر بنتی ہے، اس لیے اس نفسیات کا ایک قدرتی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یہ طاقت اپنی قوم اور دوسری اقوام کے معاملے میں دُہرے معیار (Double standered) سے کام لیتی ہے۔ مثلاً اپنے لیے تو اُن کو جمہوریت بہت اچھی لگتی ہے اور اپنے ملک میں جمہوریت برقرار رکھنے کے لیے یہ لوگ سر دھڑ کی بازی لگا دیں گے۔ لیکن اگر کسی دوسرے ملک میں ایک ڈکٹیڑ اقتدار پر براجمان ہوگا، تو یہ سُپر پاورز اُس سے اچھے تعلقات رکھنے اور معاملہ کرنے میں کوئی شرم محسوس نہیں کریں گی۔ اسی طرح اپنے ملک میں تو یہ ترقی یافتہ اقوام انصاف، دیانت داری اور میرٹ کا پورا خیال رکھتی ہیں، لیکن دوسری اقوام سے معاملہ کرتے ہوئے رشوت، دھونس اور دھاندلی سب کچھ روا رکھا جاتا ہے۔ سُپر پاورز دوسروں، خصوصاً اپنے دشمنوں، کے ساتھ امن و جنگ دونوں میں ہر طرح کے جھوٹ، غلط بیانی اور پروپیگنڈے کو بالکل جائز سمجھتی ہیں۔ اس کی مثال یہ ہے کہ امریکہ کو اسرائیل کے ایٹم بم پر کوئی اعتراض نہیں ہے، لیکن کسی دوسرے ملک کے پاس ایٹمی طاقت کا آنا اُسے گوارا نہیں ہے۔ اسی طرح عراق پر حملے کے وقت امریکہ نے بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں (weapons of mass destruction) کا جھوٹا پروپیگنڈا کیا۔ خالصتاً اصولی اعتبار سے یہ دُہرا معیار یقیناً غیر انسانی، غیر جمہوری اور خلافِ حق و انصاف و ضمیر ہے۔ ترقی یافتہ ممالک اپنے اس طرزِ عمل کے لیے یہ جواز پیش کرتی ہیں کہ ہم دنیا میں صرف جہد للبقاء (Struggle for exitence) اور بقائے اصلح (Survival of the fittest) کے ذریعے زندہ رہ سکتے ہیں۔ چنانچہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ہر وہ کام عملی اعتبار سے بالکل ٹھیک، صحیح اور مطلوب ہے جس کے ذریعے ہم اپنی سُپر پاور والی پوزیشن برقرار رکھ سکیں۔ دنیا کی پوری معلوم تاریخ میں، پیغمبروں کی حکومتوں کو چھوڑ کر، ہمیشہ یوں ہی ہوا ہے اور شاید مستقبل میں بھی ایسا ہی

Marfat.com

ہوتا رہے گا۔

سُپر پاورز کی یہ دلیل ظالمانہ اور سفاکانہ ہے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے اور انسانی ضمیر کو لازماً اُس مقام تک ارتقاء کا سفر طے کرنا چاہیے جہاں اُس کا معیار اپنی قوم اور دوسری قوم سب کے لیے ایک ہو۔ مگر کیا انسان اس دنیا میں ارتقاء کا یہ سفر طے کر سکے گا؟ اس کا جواب کسی کے پاس نہیں۔

یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ اگر سُپر پاورز اتنے ظالمانہ دُہرے معیار سے کام لیتی ہیں تو قدرت اُنہیں سزا کیوں نہیں دیتی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ غیر ترقی یافتہ اقوام اس سے دُگنے دُہرے معیار (Multiple double standerds) کا شکار ہوتی ہیں۔ غیر ترقی یافتہ ممالک میں حکمرانوں اور بالائی طبقات کے لیے کچھ اور معیار ہوتا ہے اور عوام کے لیے کچھ اور۔ غیر ترقی یافتہ ممالک میں اندرونی طور پر بھی طاقت کا قانون چلتا ہے۔ خود اپنے ملک کے اندر تعلیم، جمہوریت، انصاف اور میرٹ پر عمل درآمد نہیں کیا جاتا۔ آج کی مسلمان دنیا کا عام طور پر یہی حال ہے۔ اسی دُگنے دُہرے معیار کی وجہ سے قدرت اُنہیں ترقی یافتہ اقوام سے کم تر رکھتی ہے۔

قومیں سُپر پاور کے درجے سے کیسے گرتی ہیں

اگر کسی سُپر پاور کے اندر اجتماعی صفات میں کمزوری آجائے۔ مثلاً تعلیم کم ہو جائے، جمہوری اقدار ماند پڑ جائیں، اندرونِ ملک انصاف کی حکمرانی نہ رہے، سائنس اور ٹیکنالوجی میں کوئی دوسرا ملک اُس سے آگے بڑھ جائے، اگر اُس سے بین الاقوامی تنازعات میں کوئی غلطی سرزد ہو جائے اور وہ یہ بھول جائے کہ اُسے ہر وقت بہترین حکمتِ عملی پر کاربند رہنا ہے، تو یقیناً وہ اُس مقام سے نیچے گر جاتی ہے۔ اُس کا زوال اُس کی غلطی کے حساب سے ہوتا ہے۔ اگر غلطی کم تر نوعیت کی ہو تو زوال بھی معمولی ہوتا ہے۔ لیکن اگر غلطی بہت بڑی ہو تو زوال بھی اُسی اعتبار سے بہت بڑا ہوتا ہے۔ اگر غلطی کرنے کے بعد کوئی قوم اپنی غلطی کی اصلاح کر لے تو قدرت ایک دفعہ

Marfat.com

پھر اُسے آگے بڑھنے کا موقع دیتی ہے۔ جرمنی، اٹلی اور جاپان اس کی زندہ مثالیں ہیں۔

تاہم ہر معاملے کی طرح یہاں بھی معروضی تجزیہ (objective analysis) لازم ہے۔ مثلاً ہمارے ہاں بعض کم فہم سیاسی رہنما نعرے بازی کے طور پر کہتے ہیں کہ برطانیہ عظمیٰ پر پہلے سورج غروب نہیں ہوتا تھا اور اب اُس پر سورج طلوع بھی نہیں ہوتا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ سورج نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا سے طلوع ہوتا ہے جو سلطنتِ برطانیہ ہی کی ایک توسیع ہے۔ پھر یہ سورج بحرِ ہند کے انگریزی عمل داری والے مختلف جزیروں سے ہوتا ہوا جنوبی افریقہ پہنچتا ہے۔ یہاں سورج یورپ سے ہوتا ہوا امریکہ جا پہنچتا ہے جو برطانیہ ہی کی اولاد ہے۔ پھر وہاں سے ہوتا ہوا وہ بحرالکاہل کے اُن جزیروں پر جا چمکتا ہے جہاں امریکی پرچم لہراتا ہے۔

چین اور بھارت کے بارے میں ایک سوال

یہاں یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ چین کیوں سُپر پاور ہے جب کہ وہاں جمہوریت نہیں ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ چین میں 1947ء میں عوامی کمیونسٹ انقلاب آیا۔ اس انقلاب نے عوام کو ایک واضح مقصد دیا۔ چونکہ حکمران بلحاظ مجموعی انصاف پسند اور دیانت دار تھے اور انھوں نے تعلیم کی طرف بھرپور توجہ دی، اس لیے اس انقلاب کو ابتدائی تیس سالہ دور میں ان عوامل سے سہارا ملا۔ پھر جب حکمرانوں نے دیکھا کہ کمیونزم کی مرکزیت پسند پالیسیوں کی وجہ سے عوام کے اندر سستی اور بے زاری کا رجحان پیدا ہو رہا ہے تو وہ تدریجاً سرمایہ دارانہ نظام کی طرف بڑھتے گئے۔ حتیٰ کہ اب صورت حال یہ ہے کہ چین نام کی حد تک تو کمیونسٹ ہے مگر وہاں سرمایہ دارانہ نظام اپنی پوری تابانیوں کے ساتھ قائم ہے۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ چین کی کمیونسٹ پارٹی کے اندر قابلِ اطمینان حد تک جمہوریت موجود ہے۔ پارٹی اپنے ماضی پر ناقدانہ نظر ڈالتی ہے، سابقہ اقدامات کا پورا تجزیہ کرتی ہے اور پھر اپنی غلطیوں کا اعتراف کرتے ہوئے یہ پوری تفصیل عوام کے سامنے پیش کرتی ہے۔ پارٹی کے اندر کوئی بھی شخص اپنے عہدوں سے چمٹنا نہیں چاہتا، بلکہ باقاعدہ انتقالِ اقتدار ہوتا رہتا ہے۔ ابھی حال ہی میں، 2002 میں، سارے عہدوں پر نئے

81695

Marfat.com

لوگوں کو منتخب کیا گیا ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ وہاں ملکی سطح پر معیار مطلوب جمہوریت موجود نہیں ہے، تاہم تیسری دنیا کی نسبت وہاں زیادہ جمہوری کلچر ہے۔یہی چین کے سُپر پاور بننے کا راز ہے۔راقم کے خیال میں چین ملکی سطح پر بھی جمہوریت کی طرف اپنا سفر تدریج کے ساتھ کرے گا۔

بھارت کے متعلق بھی یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ جمہوریت کے باوجود وہ ایک سُپر پاور کیوں نہ بن سکا۔اس کا جواب یہ ہے کہ بھارت کے اندر تین میدانوں میں بہت بڑی کمزوریاں ہیں۔وہاں تعلیم کی شرح کم ہے اور بھارتی حکومت نے صرف پچھلے چند سال ہی سے اس کی طرف توجہ دینی شروع کی ہے۔ بھارت میں انصاف، دیانت داری اور میرٹ کی بڑی کمی ہے۔ پاکستان کی طرح بھارت نے بھی مانگے تانگے کے ہتھیاروں کی دوڑ پہلے دن سے شروع کی، جس کے نتیجے میں ملکی تعمیر سے حکمرانوں کی توجہ ہٹ گئی۔ جب تک بھارت ان تین میدانوں میں اپنی کمزوریوں پر قابو نہیں پائے گا، وہ سُپر پاور نہیں بن سکے گا۔

Marfat.com

باب چہارم

اسلامی دنیا اور مغربی دنیا کا تقابلی جائزہ، تاریخ کی روشنی میں

اسلامی دنیا، مغربی دنیا کے ساتھ تقابل کے اعتبار سے چار بڑے ادوار سے گزری ہے۔ ویسے تو تاریخ کا تجزیہ کرنے کے بہت سے زاویے اور پیمانے ہو سکتے ہیں۔ لیکن یہاں راقم نے تقابلی جائزے کے لیے وہ پیمانہ لیا ہے، جس پر آئندہ صفحات میں تفصیل سے روشنی ڈالی جائے گی۔ یہ ادوار درج ذیل ہیں:

- دور اول: جو حضورؐ اور خلفائے راشدین کے دور پر مشتمل ہے، یعنی 622ء سے 660ء تک
- دور دوم: (سیاسی بالادستی کا دور) خلفائے راشدین کے بعد 1440ء تک کا دور۔ یہ دور تقریباً آٹھ صدیوں پر مشتمل ہے، اسی دور میں مسلمان حکمرانوں کو عموماً سیاسی بالادستی حاصل رہی۔
- دور سوم: (سیاسی زوال کے آغاز کا دور) جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے، اس راقم کے نزدیک جب 1440ء میں گٹن برگ نے چھاپہ خانہ ایجاد کیا تو دوسرا دور اپنے اختتام کو پہنچا۔ یہاں سے مغرب نے اپنے عروج کا سفر شروع کیا اور عالمِ اسلام زوال کی طرف جانا شروع ہوا۔ یہ دور 1774ء تک جاری رہا۔ اس سال میں ترکی کی عثمانی سلطنت کو 'معاہدہ کوچک کینیری' پر مجبور ہونا پڑا جس کے تحت روس کو ترکی کی مقبوضات میں مداخلت کا حق مل گیا۔

سیاسی زوال کے آغاز کے لیے 1707ء کو بھی ایک حدِ فاصل مانا جا سکتا ہے۔ یہ وہ سال تھا جب اورنگزیب عالم گیر کی وفات ہوئی، اور اس کے فوراً بعد ہندوستان کی سلطنتِ مغلیہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔

Marfat.com

○ دورِ چہارم: (سیاسی زوال کا دور) ۔ یہ دور 1774ء سے آج تک جاری ہے۔ اس دوران میں ہندوستان میں مغل حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔ اکثر مسلمان ملک مغربی طاقتوں کے قبضے میں چلے گئے۔ سلطنتِ عثمانیہ کا خاتمہ ہوگیا۔ اگر چہ بعد میں مسلمان ملکوں کو آزادی مل گئی، لیکن اس کے باوجود وہ ابھی تک سارے اہم معاملات میں مغرب کے دست نگر ہیں۔ کئی مسلمان ممالک میں مغربی افواج موجود ہیں اور کئی علاقے عملاً مغرب کے زیرِ تسلط ہیں۔ یہ دور اُس وقت تک جاری رہے گا جب تک کم از کم آٹھ مسلمان ممالک یعنی انڈونیشیا، ملائیشیا، بنگلہ دیش، پاکستان، ایران، سعودی عرب، مصر اور ترکی سائنسی اور دفاعی طاقت کے اعتبار سے مغرب کے ہم پلہ نہیں بن جاتے۔ گویا جب تک اُن کے ''گروپ آف ایٹ'' کے مقابلے میں ہمارا ''گروپ آف ایٹ'' برابر کی سطح پر نہیں آجاتا، تب تک ہم دورِ زوال ہی میں رہیں گے۔

ان ادوار کی کچھ مزید تفصیل

مسلمانوں کے دورِ اول میں اُن کی کامیابی کی سب سے بڑی وجہ ایک واضح اور اعلیٰ مقصد کا شعور تھا۔ اس شعور نے اُن کو متحد کیا۔ مسلمانوں کے اندر ''ریاستِ مدینہ'' بنتے ساتھ ہی کامل شورائیت نے جنم لیا۔ حضورؐ نے اپنی پوری زندگی میں 'صلح حدیبیہ' کو چھوڑ کر کبھی جمہور کی رائے کے خلاف کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ اس نظام نے کامل انصاف کو جنم دیا۔ چنانچہ ان تین عوامل کی وجہ سے یہ ریاست اپنے وقت کی عظیم ترین طاقت بن گئی اور اس نے اپنے وقت کی دونوں سُپر پاورز کو زیر کرلیا۔

اس دور کو بھی دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا حصہ حضورؐ، حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عثمان غنیؓ کے دورِ حکومت کے پہلے پانچ برس پر مشتمل ہے۔ گویا یہ دور تقریباً تئیس (23) برس تک جاری رہا۔ دوسرا دور حضرت عثمانؓ کے آخری پانچ برس اور حضرت علیؓ کے ساڑھے چار برس پر مشتمل تھا۔ اس دور کو دورِ فتن کہا جاتا ہے، اس لیے کہ حضرت عثمانؓ کے آخری پانچ برس میں اندرونی ہنگامے اور شورشیں ہوئیں، جب کہ حضرت علیؓ کے پورے

Marfat.com

دور میں بھی اندرونی لڑائیاں ہوتی رہیں۔اسی دور میں جنگِ جمل اور جنگِ صفین ہوئی جس میں دونوں طرف سے لاکھوں مسلمان شہید ہوئے۔

اس پورے دور کو اس وجہ سے خلافتِ راشدہ کہا جاتا ہے کہ اس میں حکمرانوں کا تقرر عوام کی رائے سے ہوتا تھا، حکمران اپنے آپ کو قانون سے بالاتر نہیں سمجھتے تھے، ان کی ذاتی زندگی صداقت وامانت اور اخلاقِ عالیہ کا مظہر تھی، اور عوام کو انصاف دلانا مملکت کا فرضِ اولین سمجھا جاتا تھا۔

دورِ دوم:

(خلفائے راشدین کے بعد سے لے کر 1440 تک کا دور)

یہ دور مسلمانوں کے لیے عمومی سیاسی کامیابی کا دور تھا۔مختصر وقفوں کو چھوڑ کر مسلمان مملکتیں ہی دنیا میں سُپر پاور تھیں۔حضرت عمر بن عبدالعزیز کو چھوڑ کر اس پورے دور کے حکمرانوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔حضرت عمر بن عبدالعزیز کا دور اس وجہ سے ایک استثنائی حیثیت رکھتا ہے کہ اُن کے دور میں خلفائے راشدین کی ساری خوبیاں جمع ہوگئیں تھیں۔انہوں نے تخت نشین ہوتے ہی جامع مسجد میں یہ اعلان کردیا کہ وہ رضا کارانہ طور پر اپنے منصب سے دستبردار ہوتے ہیں، عوام چاہیں تو کسی بھی دوسرے فرد کو حکمران منتخب کرلیں۔اس موقعے پر موجود سبھی لوگوں نے بالاتفاق ان کو امیر المؤمنین مان لیا۔ان کے اسی رویے کی وجہ سے بجا طور پر اُن کو خلیفۂ سادس کہا جاتا ہے۔اُن کو چھوڑ کر باقی حکمرانوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

- اچھے حکمران: یہ وہ حکمران جو تھے تو غیر جمہوری، مگر علانیہ فسق و فجور میں مبتلا نہیں تھے، عوام کو انصاف دلاتے تھے، دوسری مسلمان حکومتوں پر حملہ نہیں کرتے تھے اور اپنی حکومت کے بارے میں بیدار مغزی سے کام لیتے تھے۔اس پورے دور میں ایسے حکمرانوں کی تعداد اندازاً دس فیصد تھی۔

- غیر معیاری حکمران: یہ وہ حکمران تھے جو کسی حد تک عوام کو انصاف دلاتے تھے اور

Marfat.com

مملکت کے معاملات پورے انہماک کے ساتھ چلاتے تھے۔ لیکن ان کی ذات، خاندان اوران کے امراء پر قانون کا اطلاق نہیں ہوتا تھا، یہ جس کو چاہتے قانون سے مبرا قرار دے سکتے تھے، وہ علانیہ فسق و فجور مثلاً شراب نوشی میں مبتلا ہوتے تھے، انہوں نے اوراُن کے امراء نے بیسیوں بلکہ سینکڑوں کنیزوں کو اپنے حرم کی زینت بنایا ہوتا تھا اور اکثر و بیشتر ان کے دربار میں خواجہ سرا بھی بڑی تعداد میں موجود ہوتے تھے۔ اسی فیصد (80%) حکمرانوں کا تعلق اسی طبقے سے تھا۔

O بہت بُرے حکمران: یہ وہ حکمران تھے جن میں درج بالا ساری کمزوریاں پائی جاتی تھیں اوراس کے ساتھ ساتھ وہ اپنی عیاشی میں ایسے ڈوبے ہوئے رہتے تھے کہ امورِ مملکت کی طرف سے بالکل ہی غافل ہوتے تھے۔ ایسے حکمرانوں کی تعداد بھی اندازاً دس فیصد تھی۔

بنوامیہ

حضرت امیر معاویہؓ کے بیس سالہ دورِ حکومت کے بعد ان کا بیٹا یزید تخت نشین ہوا۔ اس دور میں امامِ حسینؓ کی شہادت کا افسوس ناک سانحہ پیش آیا۔ اسی دور میں یزید نے مدینہ کو اپنی حکومت میں شامل کرنے کے لیے فوج بھیجی، جس نے مدینہ کو فتح کرنے کے بعد شہر میں قتلِ عام کیا اور تین دن تک شہر میں لوٹ مار کی۔ مدینہ منورہ کی پوری تاریخ میں ایسے قتلِ عام اور لوٹ مار کی مثال نہیں ملتی۔ اسی دور کے ایک اور حکمران عبدالملک نے بیت المقدس میں ایک چٹان کے اوپر گنبد تعمیر کیا، جسے قبۃ الصخرہ کہا جاتا ہے۔ یہ وہی گنبد ہے جس کی تصویر ہر جگہ نظر آتی ہے۔ جب کہ اس کے مقابلے میں مسجد اقصیٰ کی تصویر سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ عبدالملک نے انتہائی سفاکی کے ساتھ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے اقتدار کو ختم کیا۔ اس دور کے ایک حاکم حجاج بن یوسف کے ظلم وستم سے تو ساری دنیا واقف ہے۔ اسی عہد کے ایک حکمران سلیمان بن عبدالملک نے مشہور سپہ سالاروں، محمد بن قاسم اور موسیٰ بن نصیر کو انتقام کا نشانہ بنا کر قید کردیا جہاں ان کا انتقال ہوگیا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز کے بعد ہشام برسرِ اقتدار آیا۔ اُس نے چالیس دن بعد ہی حضرت عمر بن عبدالعزیز کی تمام اصلاحات کو منسوخ کر کے وہی پرانا استبدادی نظام پھر قائم

Marfat.com

کردیا۔ بنی امیہ کے دور میں نومسلموں پر بھی جزیہ لگایا جاتا تھا۔شراب نوشی عام تھی۔ بڑے بڑے حرم وجود میں آئے جو کنیزوں اور لونڈیوں سے بھرے ہوئے تھے۔رومی اور ایرانی اثرات کے تحت درباروں میں خواجہ سراؤں (ہجڑوں) کا شرم ناک رواج شروع ہوا۔ تاہم چونکہ اردگرد کے سارے ممالک کی نسبت یہ حکومت معاشی اور دفاعی اعتبار سے مضبوط تھی۔اس لیے یہی سُپر پاور رہی۔

اس دور میں اہلِ علم نے حکومتوں سے بے نیاز ہو کر دین کی خدمت کی اور یوں عوام کو دین پر پوری طرح راسخ رکھا۔عظیم علماء امام زین العابدینؒ، امام باقرؒ، امام جعفر صادقؒ، سعید بن مسیّبؒ، عروہ بن زبیرؒ، حسن بصریؒ، مجاہدؒ بن جبیر، شعبیؒ، قتادہؒ، مکحولؒ، یزیدؒ بن حبیب، حمادؒ اور عیسیٰؒ بن عمر اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔حکومتوں نے افواج کی طرف بھرپور توجہ دی۔ اُس دور میں مسلمان آسانی سے دو لاکھ بلکہ اس سے بھی زیادہ فوج بیک وقت میدانِ جنگ میں لا سکتے تھے۔ اسلحہ اور فوجی تنظیم بہت بہتر تھی۔مسلمانوں کے پاس وقت کے لحاظ سے جدید ترین اسلحہ موجود تھا۔ اس زمانے میں مسلمانوں کی بحری قوت بھی سب سے زیادہ تھی۔شام، مصر اور تیونس میں جہاز سازی کے کارخانے قائم تھے جنہیں ''دارالصناعہ'' کہا جاتا تھا۔حکومت کے پاس ہر وقت ہزاروں جنگی جہازوں پر مشتمل بیڑہ تیار رہتا تھا۔ مالی اعتبار سے لوگ عام طور پر خوش حال تھے۔ اپنے وقت کے سائنسی علوم کی طرف پوری توجہ دی جاتی تھی۔ مثلاً ایک اموی شہزادہ خالد بن یزید نے یونانیوں سے فلسفہ، طب اور علم کیمیا کی تعلیم حاصل کی اور خود بھی علم کیمیا پر کتابیں لکھیں۔

بنوعباس

بنوامیہ **661ء** سے لے کر **750ء** تک برسراقتدار رہے۔اس کے بعد بنوعباس اقتدار میں آئے۔اس کے پہلے حکمران ابوالعباس سفاح نے بنوامیہ کے اقتدار کو ختم کرنے کے لیے چھ لاکھ انسانوں کو ہلاک کیا۔دمشق کو فتح کر کے کئی دن تک وہاں قتلِ عام کیا گیا۔ بنی امیہ کے بچے بچے کو قتل کر دیا گیا اور اموی سرداروں کی تڑپتی لاشوں پر فرش بچھا کر کھانے کی دعوت کی گئی۔

Marfat.com

سفاح کا مطلب ہی خون ریزی کرنے والا ہے۔

اس دور کا دوسرا حکمران منصور امور مملکت چلانے میں بڑا ماہر لیکن برتاؤ میں بہت سخت تھا۔ اُس نے اپنے سب سے بڑے ساتھی ابومسلم خراسانی کو قتل کر دیا۔ اس دور کا سب سے مشہور حکمران ہارون الرشید تھا۔ اُس کی زندگی تضادات کا مجموعہ تھی۔ ایک طرف وہ بڑا عیش پرست تھا اور دوسری طرف وہ علم دوست بھی تھا۔ ہارون الرشید نے اپنے وزیر اعظم جعفر برمکی کو بالکل بے قصور قید خانے میں ڈال کر قتل کرا دیا۔ ہارون الرشید نے اپنی سلطنت اپنے دو بیٹوں امین اور مامون میں تقسیم کر دی۔ ان دونوں بھائیوں کی لڑائی کئی سال تک جاری رہی۔ بالآخر مامون الرشید جیت گیا اور امین کو قتل کر دیا گیا۔ مامون نے بیس برس تک حکومت کی۔ اس کے دور میں پہلی مرتبہ مذہبی اختلافِ رائے میں حکومت نے اپنے مخالفین پر بے جا سختیاں کر کے مذہبی آزادی میں مداخلت کر دی۔

اسی سلسلے کے ایک اور حکمران متوکل نے کربلا میں حضرت امام حسینؓ کا مزار ڈھا دیا اور عیسائیوں پر یہ پابندی لگا دی کہ وہ ایک مخصوص لباس پہنا کریں گے۔ بنو عباس کے دورِ زوال میں بڑی ہنگامہ آرائیاں ہوئیں۔ حبشیوں اور عراقیوں کی لڑائی میں پچیس لاکھ بے گناہ شہری مارے گئے۔ بنو عباس کے اکثر حکمران تن آسان، عیش پرست اور شراب کے رسیا تھے۔ ایک حکمران مقتدر باللہ کے دور میں شاہی محل میں گیارہ ہزار خواجہ سرا تھے۔ اس دور میں غلامی کے نظام نے باقاعدہ کاروبار کی صورت اختیار کر لی۔ محض غلام حاصل کرنے کے لیے مختلف علاقوں میں چھاپے مارے جاتے تھے۔ تمام بڑے شہروں میں باقاعدہ بازار لگتے تھے، جہاں لونڈی غلاموں کی فروخت ہوتی تھی۔

تاہم ان تمام خرابیوں کے باوجود چونکہ حکومت دفاعی اور معاشی اعتبار سے مضبوط تھی، اسی لیے یہی حکومت سُپر پاور رہی۔ اس دور میں بہت بڑے صاحبانِ علم و فن پیدا ہوئے جنہوں نے حکومتوں سے تعرض کیے بغیر سوسائٹی کی تعمیر و ترقی میں اپنا عظیم کردار ادا کیا۔ امامِ ابوحنیفہؒ، امام

Marfat.com

مالکؒ، امامِ شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور امام بخاریؒ نے اپنے کارنامے اسی دور میں انجام دیے۔ اگر حکومتوں نے کبھی ان کے کام میں رکاوٹ ڈالی تو انہوں نے ڈٹ کر اختلاف کیا، تاہم عام حالات میں انہوں نے حکومتوں سے کبھی جھگڑا مول نہیں لیا۔ احادیث کے چھ بنیادی مجموعے یعنی جامع بخاری، جامع مسلم، ترمذی، ابوداؤد، ابنِ ماجہ اور نسائی اسی دور میں لکھی گئیں۔ موطا امام مالکؒ بھی اسی دور میں تحریر کی گئی۔ ابن ہشام نے ''سیرت النبیؐ'' لکھی، ابن سعد نے ''طبقات ابنِ سعد'' لکھی، بلاذری نے ''فتوح البلدان'' تحریر کی اور ابن جریر طبری نے چودہ جلدوں پر مشتمل تاریخِ اسلام لکھی۔ اسی دور میں مشہور جغرافیہ دان مسعودی نے اپنی تحقیقات پیش کیں۔ ابوالحسن اشعری نے عقلی بنیاد پر اسلامی نظریات کی صداقت ثابت کی۔ اسی دور میں مشہور ریاضی دان محمد بن موسیٰ خوارزمی پیدا ہوئے۔ مشہور کیمیادان جابر بن حیان بھی اسی دور میں تھے اور علم طب میں محمد بن زکریا رازی نے بنیادی تحقیقات کیں۔ ان کی کتابوں کا یورپ کی کئی زبانوں میں ترجمہ ہوا جن کی مدد سے دنیا نے علمِ طب سیکھا۔

عباسی دور یوں تو تقریباً پانچ سو برس یعنی 750ء تا 1285ء تک قائم رہا لیکن اس کے عروج کا دور درحقیقت صرف سو برس تک رہا۔ اس کے بعد مزید سو برس عہدِ زوال کے تھے۔ پھر دو سو برس تک عباسی حکمران دوسری مسلمان حکومتوں کے محکوم رہے۔ اس کے بعد مزید سو برس تک وہ دوبارہ خودمختار بن گئے، اگرچہ اس دور میں ان کی حکومت صرف عراق پر ہی مشتمل تھی۔ بغداد کا آخری حکمران معتصم باللہ ایک مغرور اور بے صلاحیت انسان تھا۔ اس نے اپنی ہی فوج توڑ کر ختم کردی۔ چنانچہ منگول حکمران ہلاکو خان نے 1285ء میں بغداد کو فتح کر کے اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔

جب سو برس کی حکومت کے بعد سلطنتِ عباسیہ کمزور پڑ گئی تو ہر صوبے کے حکمران نے اپنی خودمختار حکومت قائم کرلی۔ اس میں ایک بڑی حکومت کو ''سامانی عہد'' کہا جاتا ہے۔ یہ حکومت 874ء سے لے کر 1005ء تک قائم رہی۔ یہ افغانستان، ایران اور بخارا پر مشتمل تھی۔ عظیم فلسفی

Marfat.com

فارابی کا تعلق اسی دور سے تھا۔ دوسری بڑی حکومت جو اس زمانے میں قائم ہوئی، وہ "بنی بویہ" کی تھی۔ یہ حکومت 934ء سے لے کر 1055ء تک بغداد اور ایران کے کچھ علاقوں میں قائم رہی۔ عظیم طبیب اور فلسفی بوعلی سینا اسی دور میں تھے۔ مشہور سائنس دان ابن ہیثم کا تعلق بھی اسی دور سے تھا۔ اس دور میں بغداد فرقہ وارانہ فسادات کا گڑھ بن گیا تھا۔ ہر مسلک دوسرے کو کافر قرار دیتا تھا۔

اُس زمانے کی تیسری بڑی سلطنت "سلطنتِ فاطمیہ" تھی۔ یہ حکومت 909ء سے لے کر 1171ء تک قائم رہی۔ مصر اور شمالی افریقہ کے دوسرے علاقے اسی سلطنت کے تحت تھے۔ قاہرہ کی بنیاد اسی زمانے میں پڑی۔ جامعہ ازہر بھی اسی دور میں 975ء میں قائم کیا گیا۔

1250ء سے 1382ء تک مصر و شام پر مملوک بادشاہوں کی حکومت رہی جو نسلاً ترک اور منگول تھے۔ امام ابن تیمیہؒ اسی دور میں 1263ء میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک عظیم عالمِ دین تھے۔ فلسفۂ تاریخ کے بانی ابن خلدون بھی اسی دور میں 1332ء میں تیونس میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے مملوک بادشاہوں اور بعد میں امیر تیمور کے پاس بطور چیف جسٹس کام کیا۔

جب ایک سلطنت ٹوٹتی ہے اور اس کے بطن سے بہت سی دوسری حکومتیں وجود میں آتی ہیں، تو یہ ایک تکلیف دہ اور ہنگامہ خیز دور ہوتا ہے۔ گویا ان چار سو برسوں میں مسلمانوں کی مختلف حکومتیں آپس میں لڑتی بھڑتی رہیں۔ درمیان درمیان میں بہت سے اچھے حکمران بھی گزرے، لیکن ایک بڑی اکثریت ایسے حکمرانوں کی تھی جن کا مقصدِ اولین اپنی سلطنت کو بچانا اور اس کی توسیع تھی۔ اس مقصد کے لیے وہ سب کچھ کرنے پر آمادہ رہتے تھے۔ تاہم ان سلطنتوں کی وجہ سے اسلام بھی پھیلتا رہا، کیونکہ جو علاقہ فتح ہوجاتا تھا وہاں علماء اور تاجروں کی وجہ سے اسلام کی روشنی پہنچ جاتی تھی۔

○ غزنیوں، سلجوقیوں اور غوریوں کی حکومتیں

سامانی حکومت کے ایک صوبہ دار سبکتگین نے 976ء میں غزنی میں ایک خودمختار حکومت قائم کرلی اور پھر اردگرد کے علاقوں پر بھی قبضہ کرلیا۔ اس کا بیٹا محمود غزنوی 997ء میں تخت

Marfat.com

نشین ہوا اور اس نے تقریباً پینتیس برس حکومت کی۔ اگرچہ ہماری تاریخوں میں اُسے بہت بڑا ہیرو بنا کر پیش کیا جاتا ہے، تاہم اُس نے اکثر لڑائیاں مسلمان حکومتوں کے خلاف حملے کر کے لڑیں۔ اُس کا یہ کارنامہ قابلِ تحسین ہے کہ اس نے پنجاب اور سندھ کو اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔ تاہم اُس نے ہندوستان پر جتنے بھی حملے کیے، وہ محض مالِ غنیمت کے حصول کے لیے تھے۔ سومنات کے بت کو توڑنا اس کا ایک بہت بڑا کارنامہ سمجھا جاتا ہے اور اسی لیے اسے بت شکن کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ حالانکہ اسلامی لحاظ سے یہ ایک غلط اقدام تھا۔ مسلمانوں پر یہ لازم ہے کہ جزیرہ نمائے عرب سے باہر غیر مسلموں کی ہر عبادت گاہ کا احترام کریں اور اُس کی پوری حفاظت کریں۔

مشہور محقق اور سائنس دان البیرونی کا تعلق اسی زمانے سے تھا۔ اُس نے ریاضی، فلکیات، تاریخ اور جغرافیے پر انتہائی اہم تحقیقات کیں۔

غزنوی حکومت دو سو دس برس تک قائم رہی۔

غزنوی حکمرانوں کے زوال کے وقت ایران میں سلجوقی ابھرنے لگے۔ سلجوقی سردار طغرل نے غزنوی حکمران مسعود کو شکست دے کر اپنی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ سلجوقیوں کا عہدِ عروج 1037ء سے لے کر 1157ء تک یعنی اندازاً ایک سو بیس برس جاری رہا۔ اس دور میں کچھ بہت اچھے حکمران گزرے۔ مشہور وزیر اعظم نظام الملک طوسی کا تعلق بھی اسی دور سے تھا۔ اس نے تعلیم کی ترقی پر بہت توجہ دی اور ملک کے ہر حصے میں بڑے بڑے مدرسے قائم کیے جو اس کے نام پر "مدارسِ نظامیہ" کہلاتے تھے۔ بلند پایہ، صوفی اور فلسفی امام غزالیؒ (1059-1111)ء کا تعلق اسی دور سے تھا۔ عظیم مصلح عبدالقادر جیلانیؒ (1077-1166)ء بھی اسی دور سے تعلق رکھتے تھے۔ فارسی کے مشہور شاعر عمر خیام اور مولانا جلال الدین رومیؒ کا تعلق بھی اسی دور سے تھا۔

سلطنت غزنی کے آخری دور میں افغانستان کے علاقہ غور کے حکمران ملک عزالدین نے خود مختاری حاصل کر لی۔ اس کے بیٹے علاؤالدین نے غزنی پر حملہ کر کے شہر کو آگ لگا دی اور

Marfat.com

سات دن تک شہر کے لوگوں کا قتلِ عام کیا۔ اسی لیے اس کو ''جہاں سوز'' کا لقب دیا گیا۔ اس خاندان کا سب سے مشہور حکمران شہاب الدین غوری گزرا ہے کیونکہ اُس نے اپنی حکومت کی سرحدیں ہندوستان اور بنگال تک وسیع کرلیں۔ دوسری طرف شہاب الدین غوری کی لڑائیاں مغربی سرحدوں پر مسلسل دوسری مسلمان حکومتوں مثلاً خوارزم شاہی خاندان سے جاری رہیں۔

خواجہ معین الدین چشتیؒ اور امام فخر الدین رازیؒ کا تعلق اسی دور سے ہے۔

○ نورالدین زنگی اور صلاح الدین ایوبی

1099ء میں عیسائیوں نے فلسطین پر قبضہ کرلیا۔ اس کے بعد ایک سو اٹھاسی سال تک اس علاقے میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان جنگیں ہوتی رہیں۔ ان کو تاریخ میں صلیبی جنگیں کہا جاتا ہے۔ عیسائیوں کے مقابلے میں شام کے حکمران عماد الدین زنگی نے بڑا نام پیدا کیا۔ اس کے بعد اس کے بیٹے نورالدین زنگی (1147-1174)ء نے اس سلسلے کو آگے بڑھایا۔ نورالدین زنگی ایک اچھا حکمران تھا، تاہم اس نے دوسری مسلمان حکومتوں کے خلاف بھی خوب لڑائیاں لڑیں۔ چونکہ نورالدین زنگی کی اولاد نالائق تھی، اس لیے اس کا جرنیل صلاح الدین ایوبی، جو نسلاً کرد تھا، سلطنت پر قابض ہوگیا۔ اس نے اکتوبر 1187ء میں یروشلم پر دوبارہ قبضہ کرلیا۔ چھ لاکھ فوجیوں پر مشتمل یورپ کی متحدہ فوج نے جوابی حملہ کیا، مگر تین سال کی لڑائی کے باوجود عیسائی بیت المقدس لینے میں کامیاب نہ ہوئے اور سلطان صلاح الدین ایوبی سے صلح کرکے واپس چلے گئے۔ سلطان صلاح الدین ایک اچھے حکمران تھے۔ انہوں نے محلات میں موجود لونڈیوں کو آزاد کردیا، اکثر محلات کو عام استعمال کے لیے وقف کردیا، بہت کثرت سے تعلیمی ادارے اور ہسپتال قائم کیے۔ وہ بالکل سادہ زندگی بسر کرتے تھے اور محل کے بجائے ایک معمولی سی مکان میں رہتے تھے۔ تاہم صلاح الدین ایوبی کی سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ انہوں نے اپنی سلطنت اپنے تین بیٹوں میں تقسیم کردی جس کا نتیجہ اس سلطنت کی تباہی کی شکل میں نکلا۔

اندلس کی سلطنتیں

Marfat.com

سپین، جسے ہسپانیہ اور اندلس بھی کہا جاتا ہے، پر طارق بن زیاد کی سرگردگی میں پہلا حملہ 711ء میں کیا گیا، جس میں سپین کے ایک بڑے حصے پر قبضہ ہوگیا۔ یہ بنوامیہ کا دور تھا۔ جب بنوعباس نے دمشق میں بنوامیہ کو شکست دے دی تو وہاں سے ایک اموی شہزادہ عبدالرحمان سپین پہنچا اور وہاں اپنی حکومت قائم کی۔ یہ 756ء کی بات ہے۔ اندلس کی اموی حکومت تقریباً ڈھائی سو برس قائم رہی اور اس کا دارالحکومت قرطبہ تھا۔ درمیان میں مرکزی حکومت بہت کمزور بھی ہوگئی تھی اور آخر میں تو ہر طرف بدامنی پھیل گئی، اس لیے کہ خود شاہی خاندان کے لوگ ایک دوسرے سے لڑنے لگے۔ اس حکومت کے زوال کے بعد سپین ٹکڑوں میں بٹ گیا اور اس کے مختلف حصوں میں کئی خودمختار حکومتیں قائم ہوگئیں۔ ان حکومتوں کی آپس میں بھی لڑائیاں ہوتی تھیں اور اردگرد کی عیسائی ریاستوں سے بھی یہ برسرِ پیکار رہتے تھے۔ یہ حکومتیں بھی تقریباً دوسو سال موجود رہیں اور اس کے بعد اندلس میں مسلمانوں کا پوری طرح زوال شروع ہوگیا۔ اب مسلمانوں کی حکومت ایک چھوٹے سے علاقے میں محدود ہوکر رہ گئی جس کا صدر مقام غرناطہ تھا۔ بالآخر ڈھائی سو برس بعد یعنی 1492ء میں یہ سلطنت بھی ختم ہوگئی۔ قابض عیسائیوں نے ہزاروں مسلمانوں کو قتل کردیا اور اعلان کردیا کہ سب مسلمان یا تو عیسائیت قبول کرلیں اور یا جلاوطن ہوجائیں۔ اندازہ ہے کہ جلاوطن ہونے والے مسلمانوں کی تعداد تیس لاکھ تک تھی۔ باقی آبادی نے جان کے خوف سے عیسائیت قبول کرلی۔

یوں تو سپین میں مسلمانوں کی حکومتیں آٹھ سو برس تک رہی، لیکن ابتدائی دوسو برس کے بعد ہی یہ حکومت نااتفاقی اور خانہ جنگی کا شکار ہوگئی۔ اسی خانہ جنگی کا آخری نتیجہ چھ سو برس بعد ایک ایسے زوال کی صورت میں نکلا کہ آج وہاں اُس عہد کی چند عمارتوں کے سوا ایک بھی مسلمان باقی نہیں بچا۔

اندلس کے اندر مسلمانوں نے بہت ترقی یافتہ تہذیب کو جنم دیا۔ صنعت وحرفت، زراعت اور تجارت کو خوب ترقی ہوئی۔ ایک بہت بڑے طبیب الزہراوی نے سرجری میں کمال

Marfat.com

حاصل کیا۔ یورپ میں سرجری کا آغاز الزہراوی کی کتاب ''الصریف'' سے ہوا۔ مشہور مورخ ابن حیان، فلسفی ابن رشد اور تصوف کے ایک بڑے عالم ابنِ عربی اسی دور میں پیدا ہوئے۔ اندلس کاغذ سازی کا ایک بڑا مرکز تھا۔ یورپ نے یہیں سے کاغذ بنانے کا فن سیکھا۔ یہ وہ دور تھا جب یورپ میں سوائے پادریوں اور امیر لوگوں کے کوئی لکھنا پڑھنا نہیں جانتا تھا لیکن اس کے بالکل برعکس اندلس میں تعلیم عام تھی۔

چنگیز خان کے جانشین اور وسطِ ایشیا کا تیموری خاندان

1223ء میں منگولوں نے ترکستان، افغانستان اور شمالی ایران کو فتح کر لیا۔ حتیٰ کہ ہلاکو خان نے 1258ء میں بغداد کو بھی فتح کر کے تباہ و برباد کر دیا لیکن چونکہ مسلمانوں کی تہذیب بہت ترقی یافتہ تھی، اس لیے تاریخ کا یہ عجیب واقع ہوا کہ فاتحین نے مفتوحوں کا مذہب قبول کر لیا، اور یہ پورا علاقہ ایک دفعہ پھر مسلمانوں ہی کے تسلط میں آ گیا۔

تیموری سلطنت کا بانی تیمور ایک تُرک قبیلے برلاس سے تعلق رکھتا تھا جو چنگیز خان کے خاندان کی سپہ سالاری کے فرائض انجام دیتا تھا۔ چونکہ تیمور ایک بہت اچھا سپہ سالار تھا، اس لیے اس نے 1366ء میں موجودہ افغانستان کے مقام بلخ میں تخت نشینی کا اعلان کر دیا۔ اس کی ساری زندگی اردگرد کے ملکوں کو فتح کرنے میں گزری، جن کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ اگرچہ ہماری تاریخوں میں تیمور کو ایک ہیرو کی حیثیت سے یاد کیا جاتا ہے، تاہم حقیقت یہ ہے کہ وہ بہت ظالم اور سفاک حکمران تھا۔ 1398ء میں اس نے دہلی اور میرٹھ کو فتح کرنے کے بعد لاکھوں ہندوؤں کا قتل عام کیا۔ سلطنت عثمانیہ کے ساتھ بھی اس کی لڑائیاں رہیں۔ سلطنت عثمانیہ کے ایک شہر سیورس پر جب اس کا قبضہ ہو گیا تو اس نے چار ہزار قیدی سپاہیوں کو زندہ دفن کر دیا۔ یہ سب کے سب مسلمان تھے۔ اصفہان، بغداد اور دمشق میں اس نے لاکھوں مسلمانوں کا قتل عام کیا۔ وہ انتقام کے جوش میں شہر کے شہر ڈھا دیتا تھا۔ خوارزم، بغداد اور سرائے کے ساتھ اس نے یہی کچھ کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان ہونے کے باوجود وہ خونریزی اور سفاکی میں چنگیز خان اور

Marfat.com

ہلاکو خان سے کم نہیں تھا۔

انڈونیشیا اور ملائشیا میں اشاعت اسلام

اِس پورے علاقے میں تیرہویں صدی اور چودھویں صدی میں مسلمان تاجروں کی بدولت اسلام کی دعوت پھیلی۔ تیرہویں صدی میں ایک مبلغ مولانا برہان الدین نے سماٹرا کے بادشاہ کو مسلمان کیا۔ ان مبلغین میں ایک اہم نام مَلک ابراہیم کا بھی ہے۔ انہوں نے 1391ء میں جاوا میں اسلام کی دعوت کا کام شروع کر دیا۔ وہاں کے ہندو راجہ نے ان کے ہاتھوں پر اسلام قبول کر لیا۔ چنانچہ ان دو سو برسوں میں اس پورے علاقے کے کروڑوں لوگوں نے مسلمان تاجروں اور مبلغین کے ذریعے اسلام قبول کیا۔

سلطنتِ عثمانیہ

1260ء کے لگ بھگ قسطنطنیہ کے قریب ایک بہادر خانہ بندوش سردار اُرطغرل کی ایک جاگیر تھی۔ 1288ء میں وہ فوت ہو گیا اور اس کے بیٹے عثمان خان نے اپنے جاگیر کو ایک سلطنت قرار دے دیا اور بہت جلد ارد گرد کے علاقوں کو فتح کر دیا۔ اسی سے سلطنت عثمانیہ کی بنیاد پڑی۔ یہ سلطنت کسی نہ کسی طرح 1923ء تک، یعنی اگلے تقریباً ساڑھے چھ سو برس جاری رہی۔ درمیان میں اس سلطنت پر آزمائش کے بھی بڑے دور آئے۔ اس کے ابتدائی کئی حکمران انتظامِ سلطنت کے لحاظ سے بڑے باصلاحیت تھے، لیکن اسلام کے حوالے سے ان کو کوئی مقام نہیں دیا جا سکتا۔ اس دور کا سب سے بڑا حکمران محمد فاتح تھا۔ اس نے باقاعدہ یہ قانون بنایا کہ جب کوئی بادشاہ تخت پر بیٹھے تو وہ اپنے بھائیوں کو قتل کر دے تاکہ لڑائیاں نہ ہوں۔ اس دور کے ابتدائی دو سو برسوں میں عثمانی حکمرانوں نے یورپ پر بہت سے حملے کیے اور البانیہ، بلغاریہ، یونان، سربیا، بوسنیا، کوسوو، کریمیا اور اٹلی کے بہت سے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ ان میں سے کچھ علاقے درمیان میں ہاتھ سے نکلتے رہے اور دوسری طرف مسلمان ریاستوں سے بھی لڑائیاں جاری رہیں۔ عثمانی سلطنت اپنے وقت کی ایک بہت بڑی ریاست تھی۔

Marfat.com

1512ء میں سلطنت عثمانیہ میں سلیم اول حکمران ہوا۔ اُس نے اپنی فتوحات کا رُخ مشرق کی طرف کرلیا اور ساری زندگی مسلمان حکومتوں کو فتح کرتا رہا۔ 1517ء میں سلیم اول نے مصر اور حجاز پر بھی قبضہ کرلیا اور وہاں سے واپسی پر وہ عباسی خلیفہ متوکل سوم کو اپنے ساتھ استنبول لے گیا۔ وہاں متوکل ایک تقریب کے دوران میں سلیم اول کے حق میں خلافت سے دستبردار ہو گیا۔ اس کے بعد سلطنتِ عثمانیہ کو خلافت عثمانیہ کا نام دیا گیا۔ اگلے دوسو برسوں میں یہ سلطنت پورے آب وتاب سے جاری رہی، حتیٰ کہ 1699ء میں معاہدہ کارلووٹز کے تحت یورپ میں ترکوں کی پیش قدمی رک گئی۔ اس دور میں 1737ء میں استنبول میں پہلا چھاپہ خانہ قائم ہوا۔ یہ اسلامی دنیا کا پہلا چھاپہ خانہ تھا، لیکن مفتی اعظم نے اس شرط پر اس کو قائم کرنے کی اجازت دی کہ اس میں قرآن مجید اور دینی کتابوں کو شائع نہیں کیا جائے گا۔ کیونکہ مفتی صاحب کے خیال میں چھاپہ خانہ بنیادی طور پر ایک شیطانی مشین کی حیثیت رکھتا تھا۔

سلطان عبدالحمید اول کے زمانے میں 16 جولائی 1774ء کو ترکی کو معاہدہ کوچک کناری پر مجبور ہونا پڑا۔ اس معاہدے کی رو سے کریمیا کو ایک آزاد مملکت قرار دیا گیا اور روس کو یہ حق دیا گیا کہ وہ سلطنت عثمانیہ کی عیسائی رعایا کی حقوق کی حمایت کرسکتا ہے۔ گویا اس معاہدے کے ذریعے روس کو سلطنت عثمانیہ کے اندرونی معاملات میں مداخلت کا حق مل گیا۔ چنانچہ اس معاہدے کے آخری نتیجے کے طور پر اگلی صدی میں ترکی کو اپنے تمام مقبوضات سے دستبردار ہونا پڑا۔

سلطنت عثمانیہ، اپنے خاتمے تک

اس مکمل دورِ زوال کو سلطنت عثمانیہ کے حکمران سلطان سلیم ثالث نے روکنے کی بہت کوشش کی۔ اس نے تعلیم اور جدید سائنسی علوم کی طرف توجہ دی۔ اس نے جنگی فنون سے متعلق یورپی کتابوں کا ترکی زبان میں ترجمہ بھی کیا اور فرانسیسی انجینیروں کی مدد سے توپ ڈھالنے کے جدید طرز کے کارخانے بھی قائم کیے۔ سلطان سلیم نے جاگیرداری نظام کو بھی ختم کردیا۔ ایک ایسے

Marfat.com

اہم وقت میں ترکی کے صوفیوں اور علماء نے مذہب کے نام پر ان سب اصلاحات کی مخالفت کی۔ انھوں نے یورپی طرز پر فوج کی تنظیم کو بے دینی سے تعبیر کیا، جدید فوجی وردیوں کے متعلق فتویٰ دیا کہ یہ دراصل نصاریٰ کی مشابہت اختیار کرنا ہے۔ انھوں نے یہ فتویٰ بھی دیا کہ کافروں کے ایجاد کردہ اسلحے کو استعمال کرنا گناہ ہے۔ چنانچہ سلطان سلیم کے خلاف یہ کہہ کر نفرت پھیلائی گئی کہ وہ کفار کے طریقے رائج کر کے اسلام کو خراب کر رہا ہے۔ بالآخر شیخ الاسلام کے فتوے پر عمل کرتے ہوئے 1807ء میں سلطان سلیم کو معزول کر کے قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد سلطنتِ عثمانیہ نے زوال کی طرف اپنا سفر جاری رکھا۔ یہ سلطنت بہت پہلے ختم ہو جاتی، لیکن چونکہ اس سلطنت کے مستقبل کے متعلق بڑی طاقتوں کے درمیان اتفاق رائے نہیں ہوا اس لیے یہ سلطنت قائم رہی۔

1876ء میں سلطان عبدالحمید خان نے عوامی دباؤ پر ایک جمہوری دستور کا اعلان کیا اور دو ایوانوں پر مشتمل پارلیمنٹ قائم کی گئی جس کا افتتاح مارچ 1877ء میں ہوا۔ مسلم دنیا میں مغربی انداز کی یہ پہلی پارلیمنٹ تھی۔ لیکن چند ہی مہینے بعد جنوری 1878ء میں سلطان نے دستور کو معطل کر دیا، پارلیمنٹ برخواست کر دی، اہم ترین سیاسی رہنما مدحت پاشا کو گرفتار کر لیا اور چند برس بعد اس کو قید خانے میں قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد سلطان نے اپنے سیاسی مخالفین کچلنے کے لیے ہر طرح کی سختیاں کیں، ہزاروں لوگوں کو قید میں ڈال دیا اور بے شمار لوگوں کو دور دراز کے علاقوں میں جلاوطن کر دیا۔ اس نے ایک زبردست جاسوسی نظام بھی قائم کیا اور سب اختیارات پر کڑی نگرانی قائم کر دی۔ تاہم عوامی بے چینی بڑھتی رہی۔ فوج میں بھی بے چینی اتنی بڑھی کہ فوج نے بھی دستور کی بحالی کا مطالبہ کر دیا۔ چنانچہ تیس برس بعد یعنی جولائی 1908ء میں سلطان نے مجبوراً دستور کو بحال کر دیا۔ مذہبی طبقہ دستور اور جمہوریت کے بالکل خلاف تھا، چنانچہ اپریل 1909ء میں مذہبی گروہوں نے کچھ فوجی دستوں کو ساتھ ملا کر نئی جمہوری حکومت کے خلاف بغاوت کر دی اور شریعت کی حکمرانی کا مطالبہ کر لیا۔ فوج نے جلد ہی اس بغاوت پر قابو پا لیا۔ چونکہ سلطان عبدالحمید اس بغاوت کی پشت پر تھا، اس لیے اسے معزول کر کے اس کے

Marfat.com

بھائی رشاد کو نیا خلیفہ اور بادشاہ مقرر کر دیا گیا۔

جب 1914ء میں جنگ عظیم اول شروع ہو گئی تو اس میں سلطنتِ عثمانیہ جرمنی کی حلیف بن گئی۔ حالانکہ سلطنت عثمانیہ کے لیے صحیح حکمت عملی یہ تھی کہ وہ اس جنگ میں مکمل طور پر غیر جانبدار رہتی۔ جرمنی کے شکست کھانے کے بعد ترکوں کو بھی ہتھیار ڈالنے پڑے اور اتحادی فوجیوں نے سلطنت کے دارالحکومت استنبول پر قبضہ کر لیا۔ اس دوران میں مصطفیٰ کمال اتاترک نے آزادی کی جنگ شروع کر دی اور بالآخر 1922ء میں اس نے اصل ترکی کو دشمنوں سے آزاد کر لیا۔ مارچ 1924ء میں بادشاہت اور خلافت کو ختم کرنے کا اعلان کر دیا گیا۔ یوں عثمانی سلطنت 625 سال قائم رہنے کے بعد ختم ہو گئی۔

ایک بڑے عرصے سے سارا عالمِ عرب، عثمانی سلطنت کے تحت تھا اور عثمانیوں نے کافی سختی کے ساتھ عربوں کو دبایا ہوا تھا۔ اُس وقت عرب اپنے آپ کو سلطنتِ عثمانیہ کا غلام سمجھتے تھے۔ اس دوران میں آزادی حاصل کرنے کے لیے کئی بغاوتیں ہوئیں، تاہم عثمانی حکمرانوں نے ان بغاوتوں کو بڑی سختی سے کچل دیا۔ پہلی جنگ عظیم میں انگریزوں نے عربوں سے وعدہ کیا کہ اگر وہ ان کا ساتھ دیں تو جنگ کے خاتمے کے بعد سب عرب ممالک کو سلطنتِ عثمانیہ کے پنجے سے آزاد کر دیا جائے گا۔ چنانچہ پہلی جنگ عظیم میں سب عربوں نے سلطنتِ عثمانیہ کے خلاف انگریزوں کا ساتھ دیا۔ اس طرح وہ عرب ممالک وجود میں آئے جن کو آج ہم دنیا کے نقشے پر دیکھتے ہیں۔ اس دور میں ایسے لوگ بھی موجود تھے جو ایک طرف سچے مسلمان تھے اور دوسری طرف آزادی اور جمہوریت کے علمبردار تھے۔ ان متوازن فکر کے حامل لوگوں میں نامق کمال اور سعید حلیم پاشا کے نام بہت اہم ہیں۔ اسی طرح احمد رضی اور محمد متوفی نے بھی اس زمانے میں بہت متوازن خیالات کا اظہار کیا۔ ان سب نے اس بات پر زور دیا کہ ہمیں ایک طرف اسلامی تعلیمات کو بھی پوری طرح اختیار کرنا چاہیے اور دوسری طرف ہمیں جمہوریت، آزادی اور جدید علوم کی طرف بھی بھرپور توجہ دینی چاہیے۔ بعض نومسلموں نے بھی اس کام میں پورا حصہ لیا۔ مثلاً مسلمان دنیا میں جس شخص نے

Marfat.com

1726ء میں پہلا چھاپہ خانہ لگایا، وہ ہنگری کا ایک نومسلم ابراہیم متفرقہ تھا۔ اس نے ایک بہت اہم کتاب لکھی جس میں اس نے عثمانی سلطنت کے سیاسی اور فوجی نظام کو یورپ کے نمونے پر ڈھالنے کی سفارش کی۔

اُس زمانے میں مسلم دنیا میں ایسے اور لوگ بھی منظر عام پر آئے جنہوں نے یورپ کی ترقی کے اسباب کا گہری نظر سے مطالعہ کیا۔ ان میں تیونس کے خیرالدین پاشا اور مصر کے جناب رافع طہطاوی بہت قابل ذکر ہیں۔ یہ دونوں اسلامی علوم سے بھی باخبر تھے اور انہوں نے یورپ کا بھی قریب سے مطالعہ کیا تھا۔ انہوں نے اس امر پر زور دیا کہ مسلمانوں کو ایسے اہل علم کی ضرورت ہے جو ایک طرف جدید علوم اور جدید مسائل سے واقف ہوں اور دوسری طرف دینی علوم پر بھی ان کی نظر ہو۔ انہوں نے اس بات پر بھی زور دیا کہ مسلمان ممالک میں ملوکیت اور استبدادی نظام کی جگہ جمہوری حکومت کو لینی چاہیے جو قانون اور دستور کی پابند ہو۔ انھوں نے یورپ سے ان تمام علوم اور فنون کو حاصل کرنے کی حمایت کی جو اسلام سے مطابقت رکھتے ہیں۔ اس زمانے میں مصر پر فرانس کا قبضہ تھا، چنانچہ طہطاوی نے ایک طرف فرانسیسی استعمار کی ڈٹ کر مخالفت کی مگر دوسری طرف فرانسیسیوں کی صداقت، انصاف، کردار اور محنت کی بھی خوب تعریف کی۔ انہوں نے کہا کہ اسلامی حدود کی پابندی میں رہ کر مغربی تہذیب کی اچھی چیزوں کو اپنانے میں کوئی ہرج نہیں۔ انھوں نے مغربی لبرل ازم کے بارے میں کہا کہ یہ وہی چیز ہے جیسے اسلام میں عدل وانصاف کہا گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ایک آئینی اور نمائندہ حکومت ہی دراصل ایک شورائی حکومت ہوتی ہے۔ تیونس کے خیرالدین پاشا نے ایک اہم کتاب ''اقوم المما لک فی معرفۃ احوال المما لک'' لکھی۔ اس کتاب میں خیرالدین پاشا نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ حکمت مومن کا گم شدہ مال ہے اس لیے یورپ میں ہمیں جو چیز اچھی اور مفید نظر آئے اسے قبول کرنا چاہیے اور جو ناپسندیدہ ہو وہ رد کردینی چاہیے۔ انھوں نے اس کتاب میں ایک اور پتے کی بات یہ لکھی ہے کہ مسلمانوں کی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ وہ دو ایسے گروہوں میں تقسیم ہوگئے ہیں جو

Marfat.com

ایک دوسرے کے مخالف ہیں۔ایک گروہ علمائے دین کا ہے جو شریعت سے واقف ہیں لیکن دنیا سے ناواقف اور دوسرا گروہ سیاست دانوں کا ہے جو دنیا سے واقف ہیں لیکن دین سے واقف نہیں اور چاہتے ہیں کہ یورپ کا نظام پورے کا پورا دین کی طرف رجوع کیے بغیر مسلمانوں پر تھوپ دیں۔خیر الدین پاشا لکھتے ہیں کہ ان دونوں گروہوں کا یہ فرق دور ہونا چاہیے۔علماء کو دنیا سے واقفیت پیدا کرنا چاہیے اور سیاست دانوں کو دین سے واقف ہونا چاہیے۔خیر الدین پاشا کے یہ خیالات تقریباً وہی تھے جو ترکی میں ان کے ہمعصر نامق کمال اور تنظیمات کے بعض رہنماؤں کے تھے۔اسی دور کا ایک اہم نام ضیا گوک الف ہے۔اگرچہ ایک طرف وہ سیکولرزم کے حامی تھے لیکن دوسری طرف وہ خلافت کے ادارے کے بھی حامی تھے، وہ ترکی زبان سے عربی اور فارسی الفاظ نکالنے کے حق میں نہیں تھے اور مسلمان طلبہ کے لیے دینی تعلیم کو ضروری سمجھتے تھے۔

تاہم اس دور کے عظیم ترین صاحب علم جمال الدین افغانی تھے، جو 1839ء میں افغانستان میں پیدا ہوئے اور وہاں وزارت کے منصب پر فائز رہے۔جمال الدین افغانی مغربی استعمار کے بہت سخت خلاف تھے۔وہ اتحادِ اسلامی کے بڑے داعی تھے۔لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ جمہوریت پر پختہ یقین رکھتے تھے، وہ جدید دنیا کے اجتماعی مسائل کو قدیم اور جدید اندازِ فکر کو ملا کر حل کرنا چاہتے تھے۔وہ یورپ سے ہر اُس چیز کو حاصل کرنے کے حق میں تھے جو اسلام سے متضاد نہ ہو۔1870ء میں جب وہ ترکی پہنچے تو وہاں کے علماء اور صوفیوں نے ان پر کفر کا فتویٰ لگا دیا اور ان کو ترکی چھوڑنے پر مجبور ہونا پڑا۔اس کے بعد وہ مصر، ہندوستان، ایران، روس اور برطانیہ بھی گئے۔ہر جگہ سے ان کو جلاوطن کیا گیا اس لیے کہ اُس وقت کی مسلمان دنیا اُن کے افکار ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔جس جگہ حکمران جمہوریت کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہوں، علماء تقلید، ذہنی جمود، تعصب اور تنگ نظری کا شکار ہوں اور اہل تصوف لوگوں کو مابعد الطبعاتی مسائل میں مسلسل لوگوں کو الجھانے کے درپے ہوں، وہاں ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔

Marfat.com

ہندوستان کی مسلمان سلطنتیں

موجودہ پاکستان اور شمالی بھارت میں سب سے پہلے مسلمان حکومت شہاب الدین غوری نے قائم کی۔ اس کے بعد اس کا غلام قطب الدین ایبک حکمران بنا۔ اس دور کو عام طور پر خاندان غلامان کہا جاتا ہے اور یہ تقریباً ایک سو برس جاری رہا۔ اس کے بعد خاندان تغلق کی حکومت شروع ہوئی جس کا پہلا حکمران غیاث الدین تغلق تھا۔ یہ دور بھی تقریباً ایک سو برس تک جاری رہا۔ اس دور میں فیروز شاہ تغلق جیسا حکمران بھی آیا جس کو مسلمانوں کے انتہائی نیک دل حکمرانوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ اس خاندان کی حکومت کو تیمور نے ختم کیا۔ جب تیمور نے دہلی کو فتح کیا تو یہاں بہت بڑا قتلِ عام کیا اور پورے شہر کی یوں اینٹ سے اینٹ بجادی کہ یہ عظیم الشان شہر ملبے کے ایک ڈھیر تبدیل ہو گیا۔ معین الدین چشتیؒ، بابا فرید شکر گنجؒ اور خواجہ نظام الدین اولیاءؒ اسی دور میں گزرے۔ امیر خسرو بھی اس دور سے تعلق رکھتے تھے۔

تیمور کے ہاتھوں خلجی خاندان کی تباہی کے بعد برِ صغیر کئی حصوں میں بٹ گیا اور ہر جگہ مسلمانوں کی حکومتیں قائم ہو گئیں۔ یہ دور بھی تقریباً ایک سو برس تک رہا۔ اسی دور میں 1498ء میں پرتگال کا مشہور جہاز ران واسکوڈے گاما کالی کٹ کے بندرگاہ پر لنگر انداز ہو گیا اور اگلے دس بارہ برسوں میں پرتگالیوں نے گوا کے بندرگاہ سمیت اس ساحلی علاقے پر قبضہ کر لیا۔

دورِ زوال کے آغاز میں برصغیر کی حالت

اپریل 1524ء کو پانی پت کی پہلی لڑائی میں بابر نے ابراہیم لودھی کو شکست دے کر برصغیر میں تیموری یا مغل سلطنت کی بنیاد رکھ دی۔

بابر ثمرقند کے قریب ایک چھوٹی سی جگہ فرغانہ کا حاکم تھا۔ 1504ء میں اس نے کابل کو فتح کر کے وہاں ایک مضبوط حکومت قائم کر لی اور اس کے بائیس برس بعد اُس نے ہندوستان کا رُخ کیا۔ اورنگزیب کی وفات (1707ء) تک یہ سلطنتِ مغلیہ تقریباً ایک سو اسی برس سے کچھ زیادہ پورے آب و تاب سے قائم رہی۔ البتہ درمیان میں شیر شاہ سوری اور اس کے بیٹے اسلام

Marfat.com

شاہ نے پندرہ برس تک دہلی پر حکومت کی۔ بابر نے مسلمانوں سے ہی برصغیر کی حکومتیں چھینی تھیں۔ چونکہ زمین زرخیز تھی اور حکمران بیدار مغز تھے اس لیے عمومی خوش حالی کا دوردورہ رہا۔ تاہم بادشاہت کی تمام خامیاں موجود تھیں۔ اورنگزیب بہت دیانت دار اور رعایا پرور تھا، تاہم اس کی بھی بارہا اپنے بھائیوں سے لڑائیاں ہوئیں جس میں اس نے سب کو شکست دے دی اور داراشکوہ کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس نے اپنے باپ شاہ جہان کو زندگی کے آخری برسوں میں نظر بند رکھا۔ اگرچہ انہوں نے ''فتاویٰ عالمگیری'' کے نام سے اسلامی قانون کا بہت اہم مجموعہ تیار کروایا، تاہم انہوں نے غیر مسلموں میں اسلام کی اشاعت کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ اپنی وفات پر اورنگزیب نے اپنی حکومت اپنے تین بیٹوں میں تقسیم کر دی جن کے درمیان سخت لڑائیاں ہوئیں۔ آخر میں ایک بیٹا بہادر شاہ اول کامیاب ہوا اور اس نے لڑائیوں میں اپنے باقی بھائیوں شہزادہ اعظم اور شہزادہ کام بخش کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اورنگ زیب کے ایک اور بیٹے شہزادہ اکبر نے اپنے باپ کی زندگی میں اس کے خلاف بغاوت کی تھی، مگر ناکامی کی صورت میں ایران فرار ہو گیا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب یورپ میں چھاپہ خانے کی ایجاد کو دو ڈھائی سو برس گزر چکے تھے لیکن ہندوستان میں ابھی اس کی بھنک تک نہیں پڑی تھی، اور عام طور پر اورنگ زیب کی ایک بڑی صفت یہ بیان کی جاتی ہے کہ وہ اپنے ہاتھ سے قرآن مجید کی کتابت کر کے اس کی فروخت سے حاصل شدہ رقم اپنے ذاتی استعمال میں لاتے تھے۔ ان دو صدیوں میں انگلستان کے اندر جمہوریت کی بنیادیں پڑ گئی تھیں لیکن برصغیر کے مغل بادشاہوں میں اس کا کوئی تصور تک بھی نہیں تھا۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، پرتگالی ملاح بابر کی حکومت قائم ہونے سے بھی پچیس برس پہلے ہندوستان میں آئے تھے اور انھوں نے نوآبادی بنالی تھی۔ اُن کے بعد فرانسیسیوں اور انگریزوں نے بھی برصغیر کا رخ کیا۔ اکبر کے زمانے میں 1600ء میں برطانیہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی تشکیل کی گئی۔ 1609ء میں انگریزی سفیر ولیم ہانس جہانگیر کے دربار میں حاضر ہوا۔ اس کے بعد انگریز مسلسل اپنی تجارتی کوٹھیاں، قلعے اور فیکٹریاں بناتے رہے لیکن مغل بادشاہوں نے قطعاً یہ سوچنے کی زحمت

Marfat.com

گوارا نہیں کی کہ یورپ میں کیا ہو رہا ہے۔

اورنگزیب کی وفات کے تیس برس بعد ایران کے حکمران نادر شاہ نے افغانستان پر قبضہ کرنے کے بعد دہلی پر بھی حملہ کیا۔ اُس وقت اورنگزیب کا پوتا محمد شاہ رنگیلا یہاں حکمران تھا جو ایک آرام طلب اور عیش پسند انسان تھا۔ نادر شاہ نے دہلی پر قبضہ کر کے لاکھوں انسانوں کا قتلِ عام کیا اور اُس کے فوجیوں نے سب کچھ لوٹ لیا۔ یہ تباہی پھیلا کر وہ خود بھی کروڑوں کا خزانہ ساتھ لے کر ایران چلا گیا اور اپنے پیچھے ایک برباد شدہ ملک کو چھوڑ گیا۔ 1761ء میں احمد شاہ ابدالی نے پانی پت کی تیسری لڑائی میں مرہٹوں کو شکست دے کر دہلی کو ان سے چھڑا لیا، لیکن بدقسمتی سے اس نے بھی یہاں اپنی حکومت قائم نہیں کی بلکہ واپس قندہار چلا گیا۔ یوں اس نے میدان انگریزوں کے لیے چھوڑ دیا۔

چنانچہ وہ انگریز جو 1600ء میں یہاں آئے تھے، اپنی تنظیم، منصوبہ بندی اور سائنسی ترقی کی بدولت آہستہ آہستہ ہندوستان میں اپنے پنجے میں پھیلاتے رہے۔ حتیٰ کہ ڈھائی سو برس کی جدوجہد کے بعد پورا ہندوستان 1857ء میں ان کے قبضے میں آ گیا۔

مغلیہ دور میں عمارتوں اور باغات کی طرف بہت توجہ دی گئی، لیکن سائنسی ترقی کے اعتبار سے یہ پورا دور مکمل طور پر نا قابلِ ذکر ہے۔ اس دور کی سب سے بڑی شخصیت مجدد الف ثانیؒ ہیں جنہوں نے اپنی ذاتی جدوجہد سے اصلاح کا بہت کام سرانجام دیا۔

دورِ زوال کے کچھ مزید حالات

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، اسی دوران میں ہندوستان میں مغلیہ دور کا خاتمہ ہوا۔ اس سے پہلے جون 1757ء میں پلاسی کے میدان جنگ میں کلائیو کی تین ہزار افراد پر مشتمل انگریزی فوج نے بنگال کے حکمران سراج الدولہ کی ستر ہزار فوج کو شکست دے کر بنگال پر قبضہ کر لیا۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ سراج الدولہ کی شکست میں اس کے رشتہ دار میر جعفر کی غداری کا بڑا حصہ ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ انگریزوں کی کامیابی کی سب سے بڑی وجہ اُن کی فوجی برتری اور عسکری تنظیم

Marfat.com

تھی۔ سراج الدولہ کی فوج محض ایک بھیڑ تھی، جب کہ انگریزوں کے پاس جدید ترین ہتھیاروں سے لیس ایک منظم فوج تھی۔ واضح رہے کہ تین ہزار افراد پر مشتمل انگریزی فوج میں محض چند سو انگریزی سپاہی شامل تھے۔ اسی زمانے میں اودھ میں بھی ایک نیم خودمختار حکومت قائم ہوئی۔ یہ دور اِس وجہ سے قابلِ ذکر ہے کہ ملا نظام الدین نے تعلیم کا وہ مشہور نصاب اسی زمانے میں مرتب کیا جو درس نظامیہ کے نام سے مشہور ہے۔

جنوبی ہند میں واقع میسور کی حکومت بھی قابل ذکر تھی۔ اس ریاست کی نوے فیصد آبادی ہندوؤں پر مشتمل تھی۔ وہاں کے ہندو راجہ کی فوج میں سپاہی کی حیثیت سے عملی زندگی کا آغاز کرنے والا ایک شخص حیدر علی اپنی بہادری اور قابلیت کی بدولت جلد ہی سپہ سالار بن گیا اور پھر اس نے میسور کی حکومت پر قبضہ بھی کر لیا۔ حیدر علی کی وفات کے بعد اس کا بیٹا ٹیپو سلطان تخت نشین ہوا۔ ٹیپو سلطان بہت ہوش منداور دینی اعتبار سے نہایت قابلِ تعریف حکمران تھے۔ اُن کو شکست دینے کے لیے انگریزوں نے نظام حیدرآباد اور مرہٹوں کے ساتھ مل کر میسور پر حملہ کر دیا۔ بالآخر ٹیپو سلطان نے انگریزوں سے صلح کر لی اور اپنی آدھی ریاست ان کے حوالے کر دی۔ اس کے ساتھ انہوں نے اپنے دو بیٹے بھی بطور یرغمال انگریزوں کے پاس بھیج دیے۔ اس کے بعد ٹیپو سلطان نے انتہائی کوشش کی کہ انگریزوں کے خلاف ایک متحدہ محاذ بنایا جائے۔ انہوں نے افغانستان، ایران، فرانس اور ترکی تک اپنے سفیر بھیجے لیکن کہیں سے بھی اُن کو مدد نہ مل سکی۔ انگریزوں نے الزام لگایا کہ ٹیپو سلطان ان کے خلاف فرانسیسیوں سے ساز باز کر رہے ہیں۔ اسی کو جواز بنا کر انگریزوں نے دوبارہ ان پر حملہ کر دیا۔ بالآخر سلطان کو شکست ہوگئی اور وہ شہید ہو گئے۔

اسی زمانے میں حیدرآباد دکن میں ایک خودمختار ریاست "مملکت آصفیہ" کے نام سے بنی۔ اس کے حکمران نظام کہلاتے تھے۔ 1798ء میں اس حکومت نے انگریزوں کی ماتحتی قبول کر لی۔ جب کہ ٹیپو سلطان نے اس ماتحتی کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ بہرحال نظام کی مصلحت آمیز پالیسی نے اس کی ریاست کو محفوظ کر لیا۔ اگرچہ اس ریاست میں بھی نوے فیصد

Marfat.com

آبادی ہندوؤں کی تھی، تاہم برطانوی ہند کی محکوم ریاست کی حیثیت سے حیدرآباد کا وجود مزید ڈیڑھ سو سال تک قائم رہا، حتیٰ کہ بھارت نے 1948ء میں اُس کو ضم کرلیا۔ اس طرح 232 سال تک قائم رہنے کے بعد یہ سلطنت ختم ہوگئی۔ اس سلطنت میں دین کی خدمت کا بہت کام ہوا۔ شبلی نعمانی، مولوی چراغ علی، سید علی بلگرامی، ڈپٹی نذیر احمد، عبدالحلیم شرر، مولانا مناظر احسن گیلانی اور مولانا ظفر علی خان نے حیدرآباد سے وابستہ ہوکر علمی کام کیا۔ ریاست حیدرآباد کا ایک اور بڑا کارنامہ جامعہ عثمانیہ کا قیام ہے جو عالم اسلام میں جدید طرز کی ایک اہم یونی ورسٹی تھی۔ حیدرآباد میں دائرۃ المعارف کے نام سے ایک اور علمی ادارہ بھی قائم تھا جس کا کام عربی کی نایاب قلمی کتابوں کو جمع کرنا اور ان کو شائع کرنا تھا۔ نظام حیدرآباد نے مولانا مودودیؒ کی بھی کافی مالی مدد کی۔

یہاں ہمارے سامنے ایک بے حد اہم سوال آتا ہے، وہ یہ کہ کسی کمزور ترین دور میں ٹیپو سلطان کی حکمت عملی صحیح تھی یا سلطنت حیدرآباد کی، یا ان دونوں کے علاوہ کسی اور حکمت عملی کو اختیار کیا جانا چاہیے تھا۔ کیا 1857ء کی جنگ آزادی والی حکمت عملی ٹھیک تھی، یا اس کے علاوہ کوئی اور حکمت عملی اختیار کرکے اس دور میں مسلمانوں کو بچایا جاسکتا تھا اور ان کی تعلیم و تربیت کی طرف بہتر توجہ دی جاسکتی تھی۔

اس دور کا ایک عظیم نام شاہ ولی اللہؒ (متوفی 1763ء) کا ہے جنہوں نے پہلی مرتبہ قرآن مجید کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ انہی کے مشورے پر احمد شاہ ابدالی نے حملہ کرکے پانی پت کی جنگ میں مرہٹوں کو شکست دی تھی۔ لیکن افسوس کہ اس فتح کے بعد وہ واپس چلے گئے۔ شاہ ولی اللہ کے تینوں بیٹوں نے اسلام کی بہت بڑی خدمت کی۔ شاہ عبدالعزیزؒ حدیث کے بہت بڑے عالم تھے اور عیسائی پادریوں کے اسلام پر حملوں کا انھوں نے بڑی کامیابی سے مقابلہ کیا۔ شاہ رفیع الدینؒ نے پہلی مرتبہ اردو زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ کیا اور شاہ عبدالقادرؒ نے پہلی مرتبہ قرآن مجید کی اردو تفسیر لکھی۔

اسی دور کی انتہائی اہم شخصیت سید احمد شہیدؒ ہیں۔ وہ دہلی کے قریب بریلی نامی جگہ کے

Marfat.com

رہنے والے تھے۔ اس زمانے میں پنجاب پر سکھوں کا قبضہ تھا جس میں آج کا صوبہ سرحد (پختون خوا) بھی شامل تھا۔ سید احمد نے فیصلہ کیا کہ وہ ان مسلمانوں کو سکھوں کی غلامی سے نجات دلائیں گے۔ چنانچہ وہ مجاہدین کی جماعت کے ساتھ سندھ کے راستے سے افغانستان میں داخل ہوکر درہ خیبر سے 1827ء میں پشاور پہنچ گئے اور یہاں انھوں نے ایک حکومت کی بنیاد ڈال دی۔ بہت جلد پشاور، مردان اور ہزارہ پر بھی ان کا قبضہ ہوگیا جو چار برس تک جاری رہا۔ اس موقعے پر سید احمد شہید سے حکمت عملی کی ایک غلطی ہوگئی۔ وہ یہ کہ انھوں نے نہایت سختی کے ساتھ اور فوری طور پر پورے علاقے میں اسلامی قوانین نافذ کردیے اور تدریج اور لوگوں کی تعلیم و تربیت کا پورا خیال نہیں رکھا۔ (میرے دادا نے مجھے بتایا کہ اُن کو اُن کے والد نے بتایا کہ اگر مکئی کی فصل آنے سے پہلے کوئی شخص فصل سے تازہ بھٹے توڑ کر کھالیتا اور ابھی فصل سے حکومت نے زکواۃ وصول نہ کی ہوتی تو اس شخص کو سزا دی جاتی۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ بھٹے کھائے گئے ہیں یا نہیں، ہر شخص کا منہ کھول کر دیکھا جاتا جس میں بچے بھی شامل ہوتے)۔ چنانچہ عام لوگ سید احمد شہید کے خلاف ہوگئے اور ان کو بے سروسامانی کی عالم میں ہزارہ جانا پڑا، جہاں بالاکوٹ کے قریب سکھوں نے حملہ کرکے سید احمدؒ، شاہ اسماعیلؒ اور بے شمار دوسرے مجاہدین کو شہید کردیا۔ یہ مئی 1831ء کا واقعہ ہے۔ تحریکِ مجاہدین کا مشاہدہ کرنے والوں کی یہ متفقہ گواہی ہے کہ ان کی زندگیوں میں اسلام کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ بہت سے لوگ تو کہتے ہیں کہ انھوں نے لوگوں کو ایک دفعہ پھر صحابہ کرامؓ جیسے زندگیاں دکھا دی تھیں۔ چنانچہ اگر کامیابی کے لیے صرف دینی حمیت اور ذاتی کردار کافی ہوتا تو سید احمد شہیدؒ اور ان کے ساتھی لازماً کامیاب ہوجاتے۔ لیکن اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دنیوی کامیابی کے لیے صحیح حکمت عملی، فوجی تنظیم اور جدید ترین اسلحہ بھی لازم ہے۔

سرزمین عرب میں سعودی حکومت کا قیام

جزیرہ نمائے عرب میں سعودی خاندان کی حکومت بھی اسی زمانے میں قائم ہوئی۔ اس کے بانی نجد کے ایک شہر درعیہ کے امیر محمد بن سعود (متوفی 1765ء) تھے جنہوں نے امام محمد بن

Marfat.com

عبدالوہاب کے ہاتھ پر بیعت کرلی تھی۔ ان کی وفات کے بعد 1765ء میں ان کا بیٹا امیر عبدالعزیز تخت نشین ہوا جس نے اردگرد کے بہت سے علاقوں کو فتح کر کے اپنی حکومت کی سرحدیں بہت پھیلا دیں۔ امیر عبدالعزیز کی وفات کے بعد اس کے بیٹے سعود بن عبدالعزیز (متوفی 1814ء) کے دور میں سرزمینِ حجاز یعنی مکہ اور مدینہ پر بھی سعودیوں کا قبضہ ہوگیا۔

چونکہ اس وقت حجاز یعنی مکہ اور مدینہ سلطنتِ عثمانیہ کے تحت تھے، اس لیے سلطنتِ عثمانیہ اور آلِ سعود میں جنگ چھڑ گئی۔ یہ جنگ سات برس تک جاری رہی۔ بالآخر عثمانی افواج نے 1818ء میں آلِ سعود کے دارالحکومت دُرعیہ پر قبضہ کر کے اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی، عورتوں کی بے آبروئی کی اور ہزاروں عام مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس طرح سرزمینِ حجاز ایک دفعہ پھر سلطنت عثمانیہ کے قبضے میں آگئی۔ کچھ مدت کے بعد آلِ سعود نے ایک دفعہ پھر نجد میں اپنا اقتدار قائم کرلیا۔ نجد دراصل موجودہ دارالحکومت ریاض کے اردگرد کے علاقے کا نام ہے۔ اس کے بعد اگلے ایک سو برس تک سلطنت عثمانیہ اور آلِ سعود اور دوسری طرف آلِ سعود کی اندرونی لڑائیاں جاری رہیں۔ حتیٰ کہ 1915ء میں پہلی جنگ عظیم کے درمیان میں وہاں کے حکمران عبدالعزیز السعود کا عثمانی سلطنت کے خلاف برطانوی حکومت سے دوستی کا معاہدہ ہوگیا۔ یوں انگریزوں کی مدد سے یہ حکومت مستحکم ہوگئی۔

اسی اثنا میں سرزمینِ حجاز پر شریف حسین کی حکومت قائم تھی۔ اس نے بھی سلطنتِ عثمانیہ کے خلاف انگریزوں سے دوستی کا معاہدہ کرلیا اور انگریزوں نے اسے حجاز کا حکمران تسلیم کرلیا۔ جنگ عظیم اول کے بعد دونوں حکومتیں قائم رہیں، حتیٰ کہ 1924ء میں دونوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی، جس میں آلِ سعود کامیاب ہوئے، چنانچہ سارے جزیرۂ نمائے عرب پر آلِ سعود کا قبضہ ہوگیا۔ 1927ء میں ایک نئے معاہدۂ دوستی کے تحت برطانیہ نے ابنِ سعود کو اس پورے علاقے کا جائز حکمران تسلیم کرلیا۔ یہ سلطنت آج تک قائم ہے۔

Marfat.com

مختلف مسلمان ممالک آزادی کے راستے پر

1857ء کی جنگ آزادی میں شکست کے بعد سارا برصغیر برطانوی حکومت کے براہ راست تسلط میں چلا گیا۔ اس سوال کا بھی جائزہ لینا چاہیے کہ کیا اُس وقت، جب کہ برطانیہ اور برصغیر کے مسلم حکمرانوں کی طاقت میں سواور ایک سے بھی زیادہ فرق موجود تھا، کوئی اور ایسا راستہ نہیں تھا جس سے مسلمانوں کی رہی سہی طاقت کو بچایا جا سکتا اور انہیں تعلیم کے ذریعے مستقبل میں اوپر اٹھانے کا کام سرانجام دیا جاتا۔ وہ وقت جب کہ برطانوی فوجوں کے پاس ہر طرح کا اسلحہ اور منظم فوج موجود تھی، دہلی کے اندر مغلیہ افواج کا یہ حال تھا کہ بڑی بڑی کڑائیوں میں بارود بنانے کی کوشش کی جاتی۔ سلطنت کے خزانے میں فوجیوں کو تنخواہ دینے کے لیے رقم موجود نہیں تھی۔ پہلے مہینے کی تنخواہ بہادر شاہ ظفر نے شہزادیوں کے زیورات فروخت کر کے دی۔ ظاہر ہے کہ آئندہ کے لیے تنخواہ تو کیا سامانِ رسد کا بھی کوئی انتظام نہ تھا۔

برصغیر کو اگست 1947ء میں آزادی ملی اور یوں پاکستان بھی وجود میں آ گیا۔ پاکستان کے دو حصے، جن کے درمیان میں بھارت کا ملک تھا، ایک دوسرے سے دسمبر 1971ء میں علیحدہ ہو گئے۔ مشرقی پاکستان، بنگلہ دیش بن گیا اور مغربی پاکستان، پاکستان ہی بنا۔ اس سانحہ پر بھی اگلے صفحات میں تفصیل سے بحث کی جائے گی۔

موجودہ انڈونیشیا اور ملائیشیا پر ولندیزیوں یعنی ہالینڈ کے رہنے والوں نے 1700ء سے قبضہ جما لیا تھا۔ اس کے بعد اس علاقے کے مختلف حصوں پر انگریزوں نے بھی قبضہ جما لیا۔ دوسری جنگ عظیم میں جاپان نے انڈونیشیا پر قبضہ کر لیا اور جاتے جاتے انڈونیشیا کو آزادی دے دی۔ اگرچہ انڈونیشیا کی آزادی کا اعلان اگست 1945ء میں ہو چکا تھا، تاہم کچھ مہینے بعد ولندیزیوں نے دوبارہ اپنی فوج داخل کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ انڈونیشی حکومت اور ولندیزی حکومت کے درمیان جنگ شروع ہو گئی۔ یہ جنگ اگلے تین برس تک جاری رہی۔ اقوام متحدہ نے بھی انڈونیشیا کی آزادی کے حق کو تسلیم کر لیا اور یوں عالمی رائے عامہ کے دباؤ کے تحت

Marfat.com

دسمبر 1949ء میں ہالینڈ کی افواج واپس چلی گئیں۔

موجودہ ملائیشیا کے علاقے 1786ء کے بعد برطانوی حکومت کے قبضے میں چلے گئے، تاہم یہاں کی ریاستوں نے انگریزوں کی عمل داری تسلیم کر کے اپنے اندرونی خودمختاری قائم رکھی، جس کی وجہ سے یہاں مسلمانوں کا مالی وجانی نقصان بہت کم ہوا۔ (گویا یہاں کی ریاستوں نے اُسی پالیسی پر عمل کیا جس پر برصغیر کے اندر نظام حیدر آباد، کشمیر اور ریاستِ سوات سمیت کئی دوسری ریاستوں نے عمل کیا)۔ اگست 1957ء میں ملائیشیا آزاد ہو گیا اور اگست 1965ء میں سنگاپور کی ریاست وفاق سے علیحدہ ہو گئی۔

جنگِ عظیم اول سے پہلے عالمِ عرب نظری طور پر سلطنت عثمانیہ کے تحت رہا، اگرچہ اس کے بہت سے حصے خودمختار یا نیم خودمختار ہو چکے تھے۔ جنگ عظیم کے دوران میں برطانوی حکومت نے عربوں سے وعدہ کیا کہ اگر وہ سلطنت عثمانیہ کے خلاف برطانیہ کی حمایت کریں تو جنگ کے بعد انہیں آزادی دے دی جائے گی۔ چنانچہ جنگ کے بعد عراق، اُردن، شام، لبنان، نجد اور حجاز کی مملکتیں آزاد ہو گئیں۔ ارضِ فلسطین کے متعلق تفصیلی بحث بعد کے صفحات میں آئے گی۔ کویت، متحدہ عرب امارات، بحرین، قطر اور عمان جیسے ممالک ساٹھ اور ستر کی دہائی میں آزاد ہو گئے۔

سیاسی آزادی ملنے کے بعد اکثر مسلمان ملکوں میں آمریتیں قائم ہو گئیں۔ کچھ مسلمان ممالک ابتدا میں جمہوریت پر گامزن تھے، مگر بہت جلد وہاں بھی فوجی حکومتیں قائم ہو گئیں۔ مثلاً پاکستان میں 1958ء میں فوجی حکومت قائم ہو گئی۔ اسی طرح مملکتِ شام میں جناب شکری القوتلی کو مارچ 1943ء میں پہلا صدر منتخب کیا گیا اور یہاں جمہوری حکومت قائم ہو گئی۔ تاہم مارچ 1949ء میں اس جمہوری حکومت کا خاتمہ کر کے فوجی آمریت قائم کر دی گئی۔

اس وقت مسلمان ملکوں کی صورت حال یہ ہے کہ سوائے ملائیشیا اور کسی حد تک ترکی کے، باقی سارے ملک صنعتی اعتبار سے غیر ترقی یافتہ ہیں۔ دفاع کے حوالے سے ملائیشیا، پاکستان، ایران، ترکی، اور مصر کسی حد تک اپنا دفاع کر سکتے ہیں، جب کہ باقی ممالک درحقیقت

Marfat.com

عالمی طاقتوں کے رحم و کرم پر ہیں۔ عالم اسلام کی آبادی دنیا کا بیس فیصد ہے، مگر دنیا کی صرف چھ فیصد دولت اُس کے پاس ہے۔ سیاسی نظام کے حوالے سے یہ صورت حال ہے کہ سوائے ملائیشیا کے، باقی سارے ممالک میں فوجی، نیم فوجی یا بادشاہت پر مبنی مطلق العنان حکومتیں قائم ہیں۔ ترکی اور انڈونیشیا بھی جمہوریت کے راستے پر کسی حد تک گامزن ہیں، مگر کچھ معلوم نہیں کہ کس وقت یہاں جمہوریت کی بساط الٹ دی جائے۔

تعلیم اور صحت کے اعتبار سے بھی مسلمان ممالک ایک ناقابل رشک حالت میں ہیں۔ بہت سے مسلمان ممالک میں بدترین غربت پائی جاتی ہے۔ بہت سے مسلمان ممالک مثلاً بنگلہ دیش، پاکستان، افغانستان، عراق، سوڈان اور صومالیہ بری طرح اندرونی خلفشار کا شکار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ راقم الحروف کے نقطہ نظر میں عالم اسلام ابھی تک دورِ زوال کے اندر ہے۔

مسلمانوں کے دورِ زوال و عروج میں مسلم دنیا اور یورپ کے درمیان فرق

750ء سے لے کر 1440ء کے درمیان میں مسلمان حکومتیں ہر اعتبار سے دوسروں کی نسبت ترقی یافتہ تھیں۔ مسلمانوں کے پاس بہترین زمینیں موجود تھیں۔ تعلیم، انصاف، اور اسلحہ کی صنعت میں مسلمان دوسروں سے آگے تھے۔ مسلمان مملکتوں میں دو درجن سے زیادہ ایسے شہر تھے جن کی آبادی ایک لاکھ سے زیادہ تھی۔ اس کے برعکس پورے یورپ میں صرف قسطنطنیہ کی آبادی ایک لاکھ تھی۔ مسلمانوں کے پاس ہر شہر میں پختہ عمارتیں ہوتی تھیں، پانچ سے آٹھ منزلہ عمارتیں عام تھیں، شہروں میں پختہ سڑکیں ہوتی تھیں اور گندے پانی کے نکاس کے لیے بڑی بڑی نالیاں ہوتی تھیں۔ اس کے برعکس یورپ کے اکثر شہروں میں کچے مکانات ہوتے تھے، سڑکیں بھی زیادہ تر کچی ہوتی تھیں اور گندے پانی کے نکاس کا کوئی انتظام ہی نہیں ہوتا تھا۔ مسلمان ممالک میں تعلیم کی طرف توجہ تھی، ہر شہر میں قطب خانے موجود تھے، کاغذ بنایا جاتا تھا اور علم ہیئت (Astronomy) کی تحقیق کے لیے رصدگاہیں موجود ہوتی تھیں۔ جب اس کے بالکل برعکس یورپ میں بہت کم مدرسے تھے، کوئی قابل ذکر کتب خانہ یا رصدگاہ نہیں تھا اور وہاں کاغذ بھی

Marfat.com

نہیں بنایا جاتا تھا۔ مسلمان ممالک میں بہت سے عالی شان ہسپتال تھے، لیکن یورپ میں پہلا ہسپتال تیرہویں صدی میں کہیں جا کر روم میں بنا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان اور چین میں بھی بڑی ترقی ہوئی تھی۔ مسلمانوں نے ان دونوں ملکوں سے بھی بہت کچھ سیکھا۔ مثلاً ہندسوں کا استعمال اور صفر کا استعمال مسلمانوں نے ہندوستان ہی سے سیکھا۔ اسی طرح کاغذ بنانے کا فن اور قطب نما کا استعمال مسلمانوں نے چین سے سیکھا۔ تاہم اگر اس پورے دور کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان ممالک بحیثیتِ مجموعی ہندوستان اور چین سے بھی بہت آگے تھے۔

پندرہویں صدی کے بعد یورپ میں کیا ہوا

چودہویں صدی سے پہلے یورپ کا وہ وقت تھا جب یورپ انتہائی برے حالات سے گزر رہا تھا۔ عام طور پر رائی کی روٹی کھائی جاتی تھی جب کہ گیہوں کی روٹی کو ایک عیاشی سمجھا جاتا تھا۔ کپڑے دھونے کا رواج بہت کم تھا۔ لوگ بہت کم نہاتے تھے۔ شرح اموات بہت زیادہ تھی۔ عام طور پر لوگوں کی عمریں زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ حتیٰ کہ امیر لوگ بھی محض پچپن سال کی عمر تک زندہ رہتے تھے۔ لوگ گوشت بھی کم کھاتے تھے۔ سال میں سات آٹھ مہینے سخت سردی ہوتی تھی جس سے بچاؤ کے لئے اُون کا بھاری لباس پہنا جاتا تھا، جس کی وجہ سے جلد کی بیماریاں ہو جاتی تھی۔ شہروں میں ہر طرف بدبو ہوتی تھی۔ ماحول میں ہر طرف تشدد ہوتا تھا۔ لوگوں میں بے شمار توہمات موجود تھے۔ علاج کے لیے جادو ٹونے پر عمل کیا جاتا۔ بہت سے لوگ یہ دعویٰ کرتے تھے کہ انہوں نے ہر بیماری کے موثر علاج کے لیے ''اکسیر'' تیار کر لی ہے۔ (قارئین نے یہ نوٹ کیا ہوگا کہ ہمارے ہاں ''اکسیر'' بنانے کی اشتہار بازی اب بھی پورے عروج پر ہے)۔

یورپ کے لیے یہ انتہائی پریشان کن دور تھا۔ آبادی تیزی سے بڑھ رہی تھی اور ذرائع معاش بہت کم تھے۔ اکثر زمینیں بے کار تھیں اور سال میں صرف ایک فصل اگائی جا سکتی تھی۔ چنانچہ اس خراب ماحول سے نمٹنے کے لیے کچھ لوگوں میں شعور بیدار ہونا شروع ہوا۔ چنانچہ چودہویں

Marfat.com

صدی میں شیشہ سازی کی ترقی کے نتیجے میں عینک ایجاد ہوئی۔ اس سے پہلے یورپ میں وقت کا کوئی خاص تصور نہیں تھا۔ صرف مخصوص جگہوں پر سورج اور پانی کی گھڑیاں ہوتی تھیں۔ تاہم تیرہویں صدی میں میکینکل گھنٹے وجود میں آئے۔ اگرچہ گھنٹہ، منٹ اور سیکنڈ کی تقسیم ابھی نہیں ہوئی تھی۔ 1440ء میں گٹن برگ نے جرمنی میں چھاپہ خانہ ایجاد کیا۔ پچاس برس کے اندر اندر یہ ایجاد پورے یورپ میں پھیل گئی اور اس کی وجہ سے ایک انقلاب برپا ہو گیا۔ ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں کتابیں چھپنے لگیں۔ کئی نئے پیشے وجود میں آئے۔ خواندگی کی شرح بڑھنے لگی اور عام لوگوں کا رجحان تعلیم کی طرف ہونے لگا۔

یہ وہ وقت تھا جب یورپ کے اندر بنیادی طور پر طاقت کے تین مراکز تھے، یعنی بادشاہ، امراء اور چرچ۔ تاجر طبقہ ابھی آہستہ آہستہ ابھر رہا تھا۔ تعلیم عام ہونے کی وجہ سے سب سے بڑا خطرہ بادشاہوں اور چرچ کے لیے پیدا ہوا، لیکن اس سے پہلے یہ ہوا کہ چرچ اور بادشاہ آپس میں ٹکرا گئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ چرچ کے پاس بے انتہا دولت اور جاگیریں آ گئی تھیں۔ اس طرح ہر چرچ نے ریاست کے اندر ایک ریاست کی حیثیت اختیار کر لی، جہاں ان کے اپنے قوانین اور ٹیکس سسٹم نافذ ہوتا تھا۔ بادشاہوں نے اسے اپنے لیے ایک بڑا چیلنج جانا اور یوں دونوں کے درمیان کشمکش شروع ہو گئی۔ لیکن اس زمانے میں سب سے پہلا انقلاب خود مذہب کے اندر آیا۔ وہ یوں کہ اس سے پہلے مذہب پر صرف پادریوں کی اجارہ داری تھی۔ وہی بائبل کو پڑھ سکتے تھے اور اس کی تشریح و تعبیر کا اختیار بھی صرف انہیں حاصل تھا۔ جب بائبل ہر ایک ہاتھ میں پہنچی اور دوسری مذہبی کتب تک بھی سب کی رسائی ہو گئی تو یہ خیال پیدا ہونے لگا کہ مذہب پر صرف پادریوں ہی کی اجارہ داری کیوں ہو۔ چونکہ اس وقت چرچ کے بہت سے طبقے اندرونی تضادات، عیاشیوں اور دوعملیوں کا شکار تھے، اس لیے اس تحریک کو مزید بڑھاوا ملا۔ اس بغاوت کا سرخیل جرمنی کا رہنے والا ایک شخص مارٹن لوتھر نامی ایک شخص بنا جو خود مذہبیات کا پروفیسر تھا۔ اکتوبر 1517ء میں اس نے چرچ کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا۔ اس کے پیروکاروں کو پروٹسٹنٹ کہا جانے لگا۔ جلد ہی یہ تحریک

Marfat.com

سارے یورپ میں پھیل گئی۔ اس کو Reformation یعنی تحریکِ اصلاحِ مذہب کہا جاتا ہے۔ اس تحریک کے نتیجے میں بے شمار لوگوں نے مذہب کو چھوڑے بغیر چرچ کی قیادت کو خیر باد کہہ لیا۔

اسی اثنا میں معاشرے کے اندر ایک اور تبدیلی بھی آتی رہی۔ اس تبدیلی کو اب ریناساں (Renaissance) کہا جاتا ہے، جس کا مطلب ہے ''نشاۃ ثانیہ''۔ کتابوں کے پھیلاؤ کے ساتھ معیشت اور معاشرت میں بہت بنیادی تبدیلیاں آئیں۔ پرانی فراموش کردہ کتابوں کو از سرِ نو شائع کیا گیا۔ لوگوں کی توجہ نئے نئے علوم کی طرف گئی۔ سب سے پہلے معاشرتی علوم کی طرف توجہ گئی۔ اسے ہیومن ازم (Humanism) یعنی انسان دوستی کی تحریک کہا جاتا ہے۔ معاشرتی علوم کے ساتھ ساتھ لوگوں کی توجہ سائنسی علوم کی طرف بڑھنے لگی۔ پہلے تو پرانے سائنس دانوں مثلاً افلاطون کی کتابیں چھپ گئیں اور پھر بہت سے مہم جوؤں نے براہ راست سائنس کی طرف اپنی توجہ مرکوز کر لی۔ مثلاً اینڈریاس ویلیکس (Andreas vesalius) نے 1543ء میں انسانی بدن کی ساخت پر کتاب لکھی۔ اٹلی کی ایک یونی ورسٹی ''پیڈوا (Padua) نے بالخصوص ابتدائی بڑے سائنس دان پیدا کیے، مثلاً کوپرنیکس، گلیلیو، ولیم ہاروے۔ انہی تحقیقات پر بعد میں نیوٹن نے بڑے قیمتی اضافے کیے۔

یہ ساری کشمکش ڈھائی تین سو برس تک جاری رہی۔ اس تنازعے میں بہت سے لڑائی جھگڑے ہوئے، بہت سا خون بہا اور دونوں طرف کے ہزاروں لاکھوں افراد نے ایک دوسرے کا خون بہایا۔ کبھی پرانے لوگ غالب آجاتے تھے اور کبھی نئے لوگوں کو کامیابی ملتی تھی، لیکن یہ بات واضح ہے کہ آخری کامیابی سائنس اور عقل ہی کی تھی۔ مثلاً گلیلیو کو پوپ کی جانب سے اس کی ایجادات کے جرم میں گناہ گار ٹھہرایا گیا۔ اس کا جرم یہ تھا کہ وہ زمین کے بجائے سورج کو کائنات کا مرکز مانتا تھا۔ اگرچہ 1633ء میں اس نے اپنے سارے خیالات سے ''توبہ'' کر لی، تاہم اس نے تجربے اور لکھنا جاری رکھا، اگرچہ اب اس کی تحریریں اٹلی کے بجائے ہالینڈ سے چھپتی تھیں۔ گلیلیو

Marfat.com

کی تحقیقات کی وجہ سے دور بین، خورد بین اور کئی دوسرے آلات بھی ایجاد ہوئے۔ درج بالا تبدیلیوں کی وجہ سے انسانی سوچ میں بھی بہت تبدیلی آئی اور دانش وروں نے اس بات پر زور دینا شروع کیا کہ کسی قسم کی سنسر شپ اور دباؤ کے خوف سے آزاد ہو کر ہر معاملے پر آزادانہ مکالمے کی اجازت ہونی چاہیے۔ اس تحریک کو بعد میں Enlightenment یعنی روشن خیالی کا نام دیا گیا۔ اس تحریک کی وجہ سے لوگوں میں ملکی معاملات پر سوچ بچار اور پڑھنے لکھنے کا شوق بہت بڑھ گیا۔ چنانچہ اٹھارہویں صدی کے خاتمے میں، گویا 1799ء سے پہلے پہلے، یورپ کے اکثر ممالک کے دو تہائی مرد تعلیم یافتہ ہو گئے۔ عورتوں میں بھی تعلیم یافتہ خواتین کی تعداد ایک تہائی تک ہو گئی۔ مکالمے اور اظہار رائے کی آزادی کی وجہ سے لوگوں میں قوت برداشت پیدا ہو گئی، چنانچہ تخلیقی سرگرمیاں بہت تیزی سے زور پکڑنے لگیں۔

پندرہویں صدی کے خاتمے سے پہلے پہلے یورپ نے بحری راستوں پر اپنی اجارہ داری بڑی حد تک قائم کر لی تھیں۔ اگرچہ اس وقت سلطنت عثمانیہ کے پاس بھی ایک بڑی بحری قوت موجود تھی، تاہم اس نے اپنی قوت کو صرف جنگی مقاصد تک محدود رکھا۔ اس کے برعکس یورپی جہاز رانوں نے اپنے ملک سے نکل کر باقی دنیا کو دریافت کرنے، اس سے تجارت کرنے اور بالآخر اس پر قبضہ کرنے کو اپنا مقصد بنالیا۔ اس راقم کے نزدیک Industrial Revolution یعنی صنعتی انقلاب کی ابتدا یہاں سے ہوئی۔ اس ارتقاء نے زمین کی حیثیت بدل دیا۔ اس سے پہلے یہ قانون تھا کہ جاگیر کی وراثت صرف بڑے بیٹے کو ملتی تھی، مگر اب جائیداد سب میں تقسیم ہونے لگی۔ کئی یورپی ملکوں مثلاً ڈنمارک، سویڈن اور ناروے نے 1780ء کی دھائی میں جاگیرداری نظام کو ختم کر دیا گیا اور زمین کو ٹکڑوں میں تقسیم کر کے کسانوں کو فروخت کر دیا گیا۔ یہ انقلاب کن ایجادات کی بدولت ہوا، اس کا مختصر جائزہ مفید رہے گا۔

O_1769ء: جیمز واٹ نے بھاپ سے چلنے والا انجن ایجاد کیا۔

O_1776ء: ہنری کیونڈش نے ہائیڈروجن گیس تیار کر لی۔ اور سٹیفن اور ماؤنٹ

Marfat.com

گالفیا نے غبارہ ایجاد کیا۔

O۔1784ء: ابتدائی شکل کا پہلا ہوائی جہاز بنا جس میں ہائیڈروجن بھری جاتی تھی۔

O۔1785ء: جیمز ہٹن نے اپنی کتاب ''نظریۂ ارض'' شائع کی۔ اس میں ولیم سمتھ اور لامار نے مزید اضافے کر کے چٹانوں کی ساخت وغیرہ کے متعلق معلومات بہم پہنچائیں۔

O۔1786ء: گالوانی نے بجلی کی رو ایجاد کی اور وولٹا نے سب سے پہلی بیٹری ایجاد کی۔

O۔1794ء: فرانس میں کلارڈ شیکے نے تار برقی (Telegram) کی ابتدائی شکل ایجاد کر لی۔

O۔1797ء: امریکہ کے ایک شخص چارلس نیو بولٹ نے لوہے کا ہل تیار کیا۔

O۔1798ء: سٹین نے لوہے کے ڈھانچے والا چھاپہ خانہ بنایا۔

O۔1802ء: بھاپ سے چلنے والی پہلی کشتی تیار ہوئی۔

O۔1803ء: بڑے پیمانے پر کاغذ سازی کی مشین بنی۔

O۔1804ء: ٹریوی تھک نے پہلا انجن ایجاد کیا اور اسے ریلوے میں استعمال کیا۔

O۔1805ء: رابرٹ فلٹن نے پہلی تارپیڈو بنائی۔

O۔1807ء: لندن کے اندر پہلی مرتبہ گیس کی روشنی لگائی گئی۔ 1820ء تک شہر کے بڑے حصے میں یہ بلب لگا دیے گئے۔

O۔1809ء: ہمفرے ڈیوی نے ایک ایسا لیمپ ایجاد کیا جو کھدائی کے دوران میں کانوں کے اندر محفوظ طریقے پر استعمال ہو سکتا تھا۔

O۔1820ء: بیلن والا چھاپہ خانہ ایجاد کیا گیا، جسے لندن ٹائمز نے فوراً اپنے ہاں لگا دیا۔

O۔1814ء: سٹیفن سن نے ریل گاڑی میں استعمال کے لیے بھاپ کا انجن مکمل

Marfat.com

کرلیا۔

O۔1816ء: دو پہیوں والا بائی سائیکل بنایا گیا۔

O۔1818ء: بحری جہازوں میں لوہا استعمال ہونے لگا۔

O۔1819ء: بھاپ سے چلنے والا یعنی پہلا دخانی بحری جہاز امریکہ سے برطانیہ کے شہر لیور پول پہنچا۔

O۔1819ء: رینی لائی نیک نے سٹیتھوسکوپ ایجاد کیا جس سے میڈیکل سائنس میں دل کی دھڑکن سننے کا آغاز ہوا۔

O۔1821ء: فیراڈے نے بجلی کی موٹر اور بجلی پیدا کرنے والا آلہ ایجاد کیا۔

O۔1822ء: ولیم چرچ نے ٹائپ کی پہلی مشین بنائی۔

O۔1824ء: فرانس میں توپ کا نیا پھٹنے والا گولہ اور اس کی توپ ایجاد ہوئی جس نے جنگ کی تاریخ میں انقلاب برپا کیا۔

O۔1825ء: انگلستان میں سب سے پہلی ریلوے لائن کا افتتاح ہوا۔

O۔1825ء: جیمز مل کی میڈیکل سائنس کے متعلق کتاب شائع ہوئی جس میں اس نے انسانی دل کے بارے میں معلومات پیش کیں۔

O۔1827ء: کیمرہ ایجاد ہوا۔

O۔1830ء: سر چارلس لائل نے زمین کی مختلف تہوں کی ساخت کے متعلق اپنی تحقیقات پیش کی۔

O۔1832ء: مورس نے مکمل ٹیلی گرام ایجاد کیا۔

O۔1834ء: فصل کاٹنے والی مشین بنائی گئی۔

O۔1835ء: فیراڈے نے برقی مقناطیس کی طاقت کا مظاہرہ کیا جس سے Magnetic Electro کی سائنس کی بنیاد پڑی۔

Marfat.com

O۔ 1836ء: سوئی دار بندوق ایجاد ہوئی۔ یہی بندوق اب تک استعمال کی جاتی ہے۔

O۔ 1836ء: امریکہ میں ریوالور ایجاد ہوا۔

O۔ 1838ء: حیوانی خلیے یعنی Cell کا نظریہ دریافت ہوا۔

O۔ 1839: ربر میں گندھک ملا کر اس میں لچک پیدا کی گئی اور اس سے ٹائر بنائے گئے۔

O۔ 1839ء: محوری گردش والی موٹر کو کشتی میں لگایا گیا۔

O۔ 1839ء: ایسٹ انڈیا کمپنی نے انگلستان سے مصر تک دخانی جہاز چلانے شروع کیے۔ وہاں سے مسافروں اور سامان کو سویز پہنچایا جاتا تھا، جہاں دوسرے جہاز ان کو ہندوستان لے جاتے تھے۔

O۔ 1840ء: بجلی کی روشنی ایجاد ہوگئی۔

O۔ 1842ء: فلپس نے ہیلی کاپٹر بنایا جو بھاپ کی قوت سے چلتا تھا۔

O۔ 1846ء: امریکہ میں سیونگ مشین ایجاد ہوئی۔

O۔ 1848ء: یہ دریافت ہوا کہ ایتھر کو انسانی جسم کے سن کرنے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

O۔ 1851ء: امریکہ اور برطانیہ کے درمیان سمندر کے نیچے ٹیلی گراف لائن بچھائی گئی۔

O۔ 1855ء: رائفل بنانے کا اصول توپوں اور دوسرے اسلحے میں استعمال ہونے لگا۔ اس سے دور مار توپیں وجود میں آئیں جن کا نشانہ بالکل ٹھیک تھا۔ (یہاں یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ اسی دور میں یعنی 1857ء میں ہندوستان کی جنگ آزادی ہوئی تھی۔ اُس وقت سارا عالمِ اسلام ان ایجادات اور تحقیقات سے بالکل بے خبر تھا)۔

O۔ 1859ء: چارلس ڈارون نے اپنی کتاب (Origion of the

Marfat.com

(species)یعنی ''اصلِ انواع'' شائع کی۔

O۔1859ء: مشین کے ذریعے سے پٹرول نکالنے کا سلسلہ جاری ہوا۔اسی سال میں فرانس میں نپولین نے پہلی مرتبہ ایسی کشتی تیار کرائی جو پوری کی پوری لوہے سے منڈھی ہوئی تھی۔

O۔1860ء: ایک سے زیادہ گولیاں چلانے والی رائفل ایجاد ہوئی۔

O۔1862ء: کلدار توپ بنائی گئی اور گیس سے چلنے والا انجن ایجاد ہوا۔

O۔1864ء: ریل گاڑی کے ایسے ڈبے بنائے گئے جن میں سونے کا انتظام موجود تھا۔

O۔1865ء: ایتھر کے ذریعے انسانی جسم کے مختلف حصوں کو سن کر کے ان پر سرجری کا طریقہ ایجاد کیا گیا۔

O۔1869ء: کیمرے میں رنگ دار تصویروں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

O۔1869ء: نہر سویز کا افتتاح ہوا۔

O۔1875ء: چھاپے کی روٹری مشین ایجاد ہوئی۔

O۔1876ء: گراہم بیل نے ٹیلی فون ایجاد کیا۔

O۔1877ء: ایڈیسن نے فونوگراف ایجاد کیا اور دو برس بعد بجلی کا بلب بنا لیا۔

O۔1880ء: ملیریا بخار کے جراثیم اور اس کے مچھر کو دریافت کیا گیا۔

O۔1883ء: فوٹو گرافی کے لیے سیلولائیڈ فلم بنی۔

O۔1883ء: خناق (diphtheria) کے جراثیم کا پتہ لگا لیا گیا، اور ان کو ختم کرنے کے لیے سیرم تیار کر لیا گیا۔

O۔1884ء: دور دراز کے علاقوں کو ٹیلی فون کے ذریعے ملا دیا گیا۔

O۔1884ء: تپ دق (T.B) اور ہیضے (Cholera) کے جراثیم دریافت کیے

Marfat.com

گئے۔

O۔1885ء: لوئی پاسچر نے باولے کتوں کے کاٹنے کے جراثیم دریافت کر لیے اور ان کے لیے ٹیکہ بھی تیار کر لیا۔

O۔1885ء: آبدوزیں تیار کر لی گئیں۔

O۔1886ء: بغیر دھوئیں کے بارود کو ایجاد کر لیا گیا۔

O۔1887ء: ایڈیسن نے متحرک تصاویر کی مشین ایجاد کیں، جس سے آگے چل کر سینما کی فلمیں بنیں۔

O۔1887ء: موٹر کاریں بنیں۔

O۔1892ء: برق پاروں کا نظریہ پیش کیا گیا۔

O۔1894ء: پٹرول سے چلنے والی موٹر کاریں بنیں۔ایک سال بعد ڈیزل انجن بھی ایجاد ہوا۔

O۔1894ء: طاعون (Plague) کے جراثیم کا پتہ لگا لیا گیا۔

O۔1895ء: مارکونی نے تار کے بغیر برقی پیغامات بھیجنے کا کامیاب تجربہ کر لیا۔

O۔1895ء: ایکسریز (X-Rays) دریافت کی گئیں۔

O۔1896ء: ٹائی فائیڈ کے جراثیم دریافت کر لیے گئے اور اس کا ٹیکہ ایجاد کر لیا گیا۔

O۔1898ء: مادام کیوری نے ریڈیائی لہروں سے ریڈیم کو الگ کر لیا۔

O۔1903ء: دو امریکی بھائیوں ولبر رائٹ اور اورو رائٹ نے پہلا صحیح ہوائی جہاز تیار کیا۔

O۔1904ء: آواز کے ساتھ متحرک تصویریں ایجاد کی گئیں۔

O۔1905ء: آئن سٹائن نے نظریۂ اضافیت (Theory of

Marfat.com

(Relativity) پیش کیا۔

O۔ 1906ء: پہلی مرتبہ برطانیہ میں ایسے بحری جہاز بنائے گئے جن پر بھاری توپیں نصب تھیں۔

O۔ 1906ء: وٹامن دریافت کیے گئے۔

O۔ 1911ء: ردرفورڈ نے ایٹم کو پھاڑنے کے لیے پہلا قدم اٹھایا۔

O۔ 1913ء: آسمان میں موجود ستاروں اور سیاروں کا زمین سے فاصلہ معلوم کرنے کا طریقہ دریافت کرلیا گیا۔

O۔ 1913ء: ٹائفس بخار کا علاج دریافت کیا گیا۔

O۔ 1920ء: ردرفورڈ نے ایٹم کو توڑنے کے ضمن میں مزید کامیابی حاصل کرلی۔

O۔ 1920ء: ریڈیو ایجاد ہوا۔

O۔ 1920ء: امریکہ کے چار فوجی ہوائی جہازوں نے پوری زمین کا چکر لگایا۔

O۔ 1927ء: ٹیلی ویژن شروع ہوا۔

O۔ 1944ء: کونین دریافت ہوئی۔

O۔ 1945ء: امریکہ نے ایٹم بم تیار کرلیا۔

1950ء کے بعد ترقی یافتہ دنیا میں جو ایجادات ہوئیں ان سے عام طور پر ہم واقف ہیں۔ مثلاً 1951ء میں پہلی مرتبہ کمپیوٹر بنالیا گیا۔ اس کے بعد اس میں مسلسل ترقی ہوتی رہی۔ حتیٰ کہ 1971ء میں گھریلو استعمال کے لیے بھی کمپیوٹر بننے لگے۔ اس کے بعد کمپیوٹر کی دنیا میں دن بدن جو ترقی ہورہی ہے، اس سے ساری دنیا واقف ہے۔ اسی طرح میزائل، مصنوعی خلائی سیارے، انسان کا چاند پر جانا، موبائل ٹیلی فون، فیکس، مریخ اور دوسرے سیاروں کی طرف خلائی جہاز بھیجنا اور اسی طرح کے دوسرے بے شمار ایجادات مثلاً مصنوعی سیاروں کے ذریعے بیک وقت سینکڑوں ٹیلی ویژن چینلز اور لاکھوں کروڑوں ٹیلی فون کے پیغامات بھیجنے کی داستان تو ہمارے

Marfat.com

سامنے ہی ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا اس پورے دور میں مسلمان دنیا کے اندر بھی کوئی ایجاد کی گئی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اسلامی دنیا کا یہ پورا دور ہر طرح کی ایجاد، دریافت اور انکشاف سے مکمل طور پر خالی ہے۔ یہ فی الوقت بھی خالی ہے اور مستقبل میں بھی کسی پیش رفت کی توقع نظر نہیں آتی۔

جمہوریت کی طرف پیش قدمی

چھاپہ خانے کی ایجاد سے یورپ میں علم پھیلا۔ علم کے پھیلنے کے نتیجے میں لوگوں نے مذہبی پیشواؤں سے بغاوت کر لی اور ساتھ ہی یہ سوال اٹھایا کہ ہمارے بادشاہ آخر کس اتھارٹی کی رو سے ہم پر حکومت کر رہے ہیں۔ اس کے نتیجے میں یہ فکر پھیلی کہ حکومت کا حق صرف ایک خاص طبقے کو نہیں بلکہ اس ضمن میں ہر انسان کی رائے لینی ضروری ہے اس مقصد کے لیے یورپ میں بہت بڑا فکری کام ہوا۔ سینکڑوں دانش وروں اور مفکرین نے اس سلسلے میں شعور اور آگہی پھیلانے میں اپنا حصہ ادا کیا۔ ہابز، لاک، مانٹسکو (1748ء) اور روسو (1762ء) اس میں چند اہم نام ہیں۔

جمہوریت کی طرف سب سے بڑی اور سب سے پہلی پیش رفت برطانیہ میں ہوئی، جہاں اگرچہ 1500ء کے لگ بھگ پارلیمانی انتخابات شروع ہو چکے تھے، مگر 1668ء کے شاندار انقلاب نے بادشاہ کے اختیارات کو بہت محدود کر دیا۔ 1669ء میں ''بل آف رائٹس'' (Bill of Rights) پاس کیا گیا، جس کے تحت بادشاہ پارلیمنٹ کے انتخابات میں کوئی دخل نہیں دے سکتا تھا اور پارلیمنٹ کی منظوری کے بغیر کوئی ٹیکس بھی نہیں لگا سکتا تھا۔ اس کے بعد مسلسل جمہوریت کی طرف پیش قدمی ہوتی رہی۔ یہ وہ وقت تھا جب برصغیر میں اورنگ زیب کی حکومت تھی۔

اس سلسلے میں دوسری اہم ترین پیش رفت ''فرانسیسی انقلاب'' ہے۔ یہ

Marfat.com

انقلاب 1780ء میں امراء اور بادشاہ کے درمیان تصادم سے شروع ہوا، لیکن بہت جلد یہ متوسط طبقہ، عوام اور کسانوں کی بغاوت کی نتیجے میں ظاہر ہوا۔ اس انقلاب کے لیے کوئی منصوبہ بندی نہیں کی گئی تھی اور ہر مرحلے پر اس کے راہنما بدلتے رہے، تاہم اپنی بنیاد میں یہ ایک مکمل عوامی انقلاب تھا۔ اگست 1789ء کے پارلیمنٹ کے اجلاس میں جاگیرداری نظام کے خاتمے کا اعلان ہوا، چرچ کی جائیداد کو ضبط کرلیا گیا، امراء نے اپنی مراعات سے دستبرداری کا اعلان کیا اور ''قراردادِ حقوق انسانی وشہری'' (Declaration of Rights of Man and Citizen) پاس ہوا۔ اس میں اعلان کیا گیا کہ ہر فرد آزاد ہے، قانون کی نظر میں سب برابر ہیں، اقتدارِ اعلیٰ قوم کا حق ہے، کسی فرد کو بھی بغیر کسی وجہ کے قید نہیں کیا جائے گا اور نجی جائیداد کا تحفظ کیا جائے گا۔ اس انقلاب کے تین نعرے تھے، یعنی آزادی، مساوات اور اخوت۔ اس انقلاب نے فرانس کے طبقاتی نظام پر زبردست ضرب لگادی اور ساری قوم کو متحد کر کے اس کو ایک نئی توانائی دی۔ اس انقلاب کے ذریعے دنیا میں پہلی مرتبہ ایک ملک یعنی فرانس نے جھنڈا اور قومی ترانہ روشناس کرایا۔ اس کے بعد دنیا کے باقی ملکوں میں بھی یہ رواج شروع ہوا۔ اگرچہ اس انقلاب کے بعد بار بار ''ردِ انقلاب'' آتے رہے، لیکن وہ شعور وآگہی کو آگے بڑھنے سے نہ روک سکے۔ اس انقلاب کے اثرات، سوائے روس کے، سارے یورپ میں پھیل گئے اور 1844ء تک اکثر ممالک میں عوام کو پارلیمنٹ میں نمائندگی دی گئی۔

بہت جلد یہ شعور بھی پیدا ہوا کہ جمہوریت صرف انتخابات کا نام نہیں بلکہ یہ تو ایک پورا کلچر ہے، جس کا ایک جزو یہ بھی ہے کہ حکمرانوں کے احتساب کے لیے آزاد ادارہ قائم ہو، عدلیہ آزاد ہو، پریس پر کسی قسم کی قدغن نہ ہو اور بنیادی انسانی حقوق کو کسی حالت میں بھی ختم یا معطل نہ کیا جاسکے۔ گویا رفتہ رفتہ یہ بات مان لی گئی کہ سوسائٹی کے ہر ادارے کی بنیاد جمہوریت پر ہو اور سارے ادارے جمہوریت کو مضبوط بنانے کے لیے کام کریں۔ یہ بات بھی سب کی سمجھ میں آگئی کہ تعلیم، سماجی انصاف، معاشی انصاف، عدالتی انصاف، آزادیٔ رائے، آزاد پریس اور جمہوریت

Marfat.com

کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔

یہ سارا عمل کسی ہموار طریقے سے پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچا، بلکہ اس کے راستے میں بہت بڑی رکاوٹیں آتی رہیں۔ مفادات، جذباتیت اور تعصب کی وجہ سے بہت سے حکمران جمہوریت کی پٹڑی سے اترتے رہے۔ اس کا خمیازہ دنیا نے جنگ عظیم اول اور دوم کی شکل میں اور اس کے علاوہ بے شمار دوسری جنگوں کی شکل بھگتا، جس میں کروڑوں انسان ہلاک اور زخمی ہوئے۔ تاہم پچھلی چھ صدیوں کا مطالعہ اور تجزیہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ انسان بحیثیت مجموعی جمہوری کلچر کے راستے پر مسلسل رواں دواں ہے۔

(اس باب کی تیاری میں درج ذیل ماخذوں سے مدد لی گئی ہے

- کولیئرز انسائیکلوپیڈیا
- اردو دائرہ معارف اسلامیہ
- ملتِ اسلامیہ کی مختصر تاریخ از ثروت صولت
- انسائیکلوپیڈیا تاریخ عالم از ولیم ایل لینگر۔ اردو ترجمہ غلام رسول مہر
- سلطنتِ مغلیہ کا زوال از ڈاکٹر سید شاہد حسن رضوی)

Marfat.com

- سپین پر طارق بن زیاد کا پہلا حملہ 711ء
- 756ء میں سپین میں اموی حکومت کا قیام۔ ابتدائی سو برس مضبوط حکومت۔ اس کے بعد یہ حکومت کئی کمزور خود مختار ٹکڑوں میں بٹ گئی۔ مزید سات سو برس بعد 1492ء میں اس سلطنت کا خاتمہ ہوگیا۔

انڈونیشیا میں تاجروں اور مبلغین کے
1250ء میں ہوا، اور سماٹرا کے حکمرا
1391: میں جاوا کے حکمران نے

- 1440ء: جرمنی میں چھاپہ خانے کی ایجاد۔ یہاں سے مسلمانوں کے دورِ سوم اور یورپ کی ترقی کا آغاز ہوگیا۔
- اگلے تین سو برس میں تحریکِ اصلاحِ مذہب، نشاۃ ثانیہ اور روشن خیالی کو حتمی کامیابی حاصل ہوئی۔
- 1490ء: یورپی جہاز رانوں نے باقی دنیا کو دریافت کرنے کو اپنا مقصد بنالیا۔
- 1668ء: برطانیہ میں بل آف رائیٹس کے ذریعے جمہوریت کو بادشاہت پر فتح حاصل ہوئی۔
- 1769ء: بھاپ سے چلنے والے انجن کی ایجاد سے سائنسی ایجادات میں انتہائی تیز رفتاری آئی۔
- 1780ء: یورپ کے کئی ملکوں میں جاگیرداری نظام کا خاتمہ ہوا۔
- 1789ء: انقلاب فرانس، جاگیرداری کا خاتمہ، جمہوریت کی فتح۔

Marfat.com

دورِ اول۔ (حضورؐ اور خلفائے راشدین) 622ء یعنی

دورِ دوم۔ بنو امیہ 660ء سے

بنو عباس۔ دور عروج 750ء سے 850

چار سو برس کمزوری و گمگوی کے تھے۔ اس

تین حکومتوں نے خود مختاری حاصل کرلی۔

...شیخ تاجروں اور مبلغین کے ذریعے دعوت اسلام کا آغاز

12... میں ... اور سماٹرا کے حکمران نے اسلام قبول کرلیا۔

... میں جاوا کے حکمران نے اسلام قبول کرلیا۔

سامانی سلطنت

(افغانستان، ایران، بخارا)

874ء سے 1005ء تک

غزنوی دور

976ء تا 1186ء

سلجوقی ترک

1037ء تا 1157ء

غوری دور

1157ء تا 1223ء

1223ء ہلاکو خان نے یہ علاقہ فتح کرلیا

خاندان غلامان ہندوستان

1206ء تا 1290ء

امیر تیمور

1366ء تا 1405ء

خاندان تغلق

1321ء تا 1413ء

بنو بویہ

(ایران اور عراق کے

934ء سے 55

1099ء سے صلیبی جنگوں کا آغاز

1258ء: ہلاکو خان نے بغداد کو فتح

مسلمان ہوگئے

سعودی حکومت

آغاز: 1765ء۔ اگلے ڈیڑھ سو برس تک

عثمانیوں میں جنگیں ہوتی رہیں۔ 1924ء

درمیان جنگ کے نتیجے میں سارے جزیرہ

قبضہ

- 1413ء سے 1526ء تک متفرق حکومتیں رہیں۔
- 1498ء: واسکوڈے گاما کی ہندوستان آمد
- 1526ء تا 1707ء مغلیہ دور
- 1600ء: ایسٹ انڈیا کمپنی کا قیام
- 1730ء میں نادر شاہ کا حملہ اور دہلی کی تباہی
- 1757ء: سراج الدولہ کی شکست
- 1857ء: جنگ آزادی کی شکست
- 1947ء: قیام پاکستان

Marfat.com

ت مدینہ کے آغاز سے 660ء تک

7ء تک

ں کے بعد

درج ذیل

(

ں تک جاری رہیں

مدت بعد منگول

یوں اور

حجاز کے

سعود کا

فاطمی عہد

(مصر اور شمالی افریقہ)

909ء سے 1171ء

مملوک بادشاہ

1250ء سے 1517ء تک

سلطنتِ عثمانیہ

1288ء تا 1923ء

ابتدائی چار سو برس مضبوط حکومت رہی۔ پھر ڈھائی سو برس کمزوری اور زوال کے رہے۔

- 1774ء میں معاہدہ کوچک کناری کے ذریعے سلطنت عثمانیہ کو سب نوآبادیوں ہاتھ دھونا پڑا۔ یوں مسلمانوں کے دورِ سوم کی تکمیل ہوگئی۔
- 1923ء: جمہوریہ ترکی کا قیام

- ... کا پہلا ... 711ء
- ...36 ... حکومت کا قیام۔ ابتدائی سو برس مضبوط حکومت۔ اس کے بعد یہ ... میں بٹ گئی۔ مزید سات سو برس بعد 1492ء میں ...
- ...40 ... چھاپہ خانے کی ایجاد۔ یہاں سے مسلمانوں کے دورِ سوم اور یورپ ...
- ... یک اصلاحِ مذہب، نشاۃ ثانیہ اور روشن خیالی کو حتمی کامیابی حاصل ہوئی۔
- ... جہازرانوں نے باقی دنیا کو دریافت کرنے کو اپنا مقصد بنالیا۔
- ...68 ... بل آف رائیٹس کے ذریعے جمہوریت کو بادشاہت پر فتح حاصل ہوئی۔
- ...69 ... سے چلنے والے انجن کی ایجاد سے سائنسی ایجادات میں انتہائی تیز رفتاری آئی۔
- ...50 ... یورپ کے ... ملکوں میں جاگیرداری نظام کا خاتمہ ہوا۔
- ...89 ... انقلاب فرانس، جاگیرداری کا خاتمہ، جمہوریت کی فتح۔

Marfat.com

پانچواں باب

امریکہ بحیثیت سپر پاور

آج دنیا میں امریکہ بلاشرکتِ غیرے عظیم ترین طاقت ہے۔ یہ وسیع وعریض ملک، جس میں بیک وقت چار مختلف ٹائم زون ہیں، آج دنیا کا سب سے ترقی پذیر دولت مند اور طاقت ور ملک ہے۔ یہ حیثیت اُسے 1945ء سے حاصل ہے، اوراس حیثیت کی وجہ سے دنیا کے ہر معاملے میں اس کی سب سے بڑی اہمیت ہے۔ اسی لیے تو فرانس کے ایک سابق صدر ڈیگال نے کہا تھا کہ ''امریکہ ہر ملک کا ہمسایہ ہے''۔ دنیا کی پوری تاریخ میں کوئی ملک اتنا امیر اور اتنا طاقتور کبھی نہیں بنا تھا جتنا آج امریکہ ہے۔ دنیا کے چھ بڑے ممالک یعنی برطانیہ، فرانس، جرمنی، جاپان، روس اور چین کی مجموعی ٹیکنالوجی کی طاقت اُس سے کم ہے۔ دنیا بھر کی تجارت میں اُس کا بہت بڑا حصہ ہے۔ صنعت وحرفت میں یہ سب سے آگے ہے۔ سائنس میں اُس کا کوئی ثانی نہیں۔ اسلحہ سازی میں کوئی دوسرا ملک اُس کا پاسنگ بھی نہیں۔ دنیا بھر کے ہر معاملے میں وہ سرگرمی کے ساتھ دلچسپی لیتا ہے۔ اقوام متحدہ کے اندر اس کا موقف سب سے زیادہ وزن رکھتا ہے۔ چنانچہ ہم ہی پر کیا موقوف، ہر ملک کے لیے امریکہ سے تعلق اہم ترین ایشوز میں سے ایک بن گیا ہے۔

امریکی موقف، اقدام اور کردار کو سمجھنے، اس کا تجزیہ کرنے اور اس کے مطابق اپنی حکمت عملی بنانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہمیں امریکہ سے بھرپور واقفیت ہو۔ اس کی تاریخ، اُس کے جمہوری نظام، اس کی اقدار، اُس کے کلچر، اس کے طرز زندگی، اس کے اداروں اور اس کی سوچ کے مختلف زوایوں پر ہماری پوری گرفت ہو۔ ان تمام چیزوں کو مدنظر رکھتے ہوئے جب ہم کوئی حکمت عملی بنائیں گے تو وہ ہمارے مفادات، امنِ عالم اور انصاف سے قریب تر ہوگی۔

امریکہ دوسری جنگ عظیم کے بعد سپر پاور بنا۔ دراصل دوسری جنگ عظیم کے بعد دنیا کے اندر ایک نئی مساوات نے جنم لیا۔ اس جنگ میں برطانیہ، فرانس، جرمنی، اٹلی اور روس کو سخت

Marfat.com

نقصان پہنچا، جب کہ اس جنگ میں امریکہ کو کوئی خاص نقصان نہیں پہنچا تھا۔ دوسری جنگ عظیم کا خاتمہ بھی امریکہ کی طرف سے جاپان پر ایٹم بموں کے گرانے کی وجہ سے ہوا۔ چونکہ روس کے پاس اب بھی بہت بڑا علاقہ، زمین اور وسائل موجود تھے اور کاروبارِ حکومت چلانے کے لیے لاکھوں افراد پر مشتمل کمیونسٹ پارٹی کے جانبازوں اور مخلص ترین افراد کی ٹیم اور نظریہ حیات کے طور پر ایک توانا، پر عزم اور کروڑوں لوگوں کے دلوں کو گرمانے اور متحد رکھنے والا نظریہ موجود تھا، اس لیے جب چند سال بعد روس نے بھی ایٹم بم بنالیا تو وہ بھی امریکہ کے مقابلے میں سپر پاور بن گیا۔

یہ دونوں ممالک ایک دوسرے سے بالکل متضاد معاشی نظریے کے حامل ملک تھے، اس لیے دونوں کے درمیان آویزش قدرتی تھی۔ تاہم اس آویزش کو جس چیز نے مہمیز دی، وہ روس کی توسیع پسندانہ پالیسی تھی، جس کے مطابق یہ اس کی نظریاتی ذمہ داری تھی کہ وہ اس انقلاب کو پوری دنیا میں برپا کرے اور اس کا قاید بنے۔ اس پالیسی نے امریکہ کو یہ اخلاقی جواز فراہم کیا کہ چونکہ روس کی اس پالیسی کی وجہ سے پوری آزاد دنیا کو خطرہ لاحق ہوگیا ہے، اس لیے یہ ضروری ہے کہ امریکہ اُسے لگام دے اور اس کے بین الاقوامی عزائم کے مقابلے میں رکاوٹ بنے۔ چنانچہ اگلے چالیس برس یہ مقابلہ جاری رہا جس میں امریکہ کو 1991ء میں اُس وقت فیصلہ کن فتح حاصل ہوئی جب کمیونسٹ سویت یونین کے حصے بخرے ہوگئے۔ اس راقم کے نزدیک اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ کمیونسٹ نظریے کی وجہ سے لوگوں کے اندر ذاتی محنت کا جذبہ مفقود ہو چکا تھا۔ چنانچہ جلد یا بدیر اس نظام کو ختم ہونا ہی تھا۔

تعلیم اور جمہوریت

ہسپانوی ملاح کولمبس نے 1500ء کے لگ بھگ امریکی سرزمین دریافت کر لی تھی۔ اس وسیع و عریض سرزمین کے دریافت ہونے کے تقریباً سو سال بعد یورپی لوگوں میں امریکہ جانے اور وہاں آباد ہونے کا شوق شروع ہوا۔ امریکہ جانے والے لوگوں کی بہت بڑی اکثریت ان مہم جوؤں پر مشتمل تھی جو یورپ میں معاشی یا مذہبی تنازعات کی وجہ سے بہت تنگ تھے۔ یہ

Marfat.com

سارے کے سارے لوگ تعلیم یافتہ تھے۔ان آبادکاروں کی اکثریت انگریزوں پر مشتمل تھی، تاہم دوسرے ملکوں سے بھی لوگ امریکہ جانا شروع ہو گئے۔اُس وقت امریکہ کے اندر مقامی باشندے موجود تھے، جن کو ریڈ انڈینز کہا جاتا تھا۔ چنانچہ زمین اور قدرتی وسائل پر قبضے کے لیے نئے آبادکاروں اور ریڈ انڈینز کے درمیان تنازعات اور جنگیں شروع ہو گئیں۔ چونکہ ریڈ انڈینز کے پاس کوئی جدید اسلحہ نہیں تھا، اس لیے ہر جنگ میں انہیں شکست ہوتی رہی۔ یہ آبادکار اپنے ساتھ یورپ سے مختلف بیماریوں کے جراثیم بھی لے کر گئے۔ ریڈ انڈینز کے جسموں میں ان جراثیم کے خلاف کوئی قوتِ مدافعت موجود نہیں تھی۔ چنانچہ اندازاً ایک کروڑ کے قریب ریڈ انڈینز ان بیماریوں سے ہلاک ہو گئے، جب کہ اندازاً دس لاکھ افراد جنگوں کی نذر ہو گئے۔ (اس وقت بھی امریکہ میں تقریباً تیس لاکھ ریڈ انڈینز موجود ہیں۔ یورپیوں اور ریڈ انڈینز کے درمیان آپس کی شادیوں کی وجہ سے مخلوط نسل والے بے شمار لوگ بھی موجود ہیں)۔

جب امریکہ کے اندر مختلف آبادیاں بن گئیں تو لوگوں کے سامنے یہ سوال پیدا ہوا کہ وہ اپنی تنظیم کس طرح کریں۔ چنانچہ ہر جگہ خود بخود ایک بلدیاتی جمہوریت نے جنم لیا۔ درحقیقت اس کے بغیر اُن کے پاس زندہ رہنے کا اور کوئی راستہ ہی نہیں تھا۔گویا امریکہ کے اندر یورپی آبادکاروں کی زندگی کی ابتدا ہی جمہوریت سے ہوئی۔ چونکہ یہ لوگ جانتے تھے کہ ایک نئے ملک میں زندہ رہنے کے لیے تعلیم بھی از حد ضروری ہے، اس لیے ان لوگوں نے پہلے دن سے ہی تعلیم کی طرف بے انتہا توجہ دی۔ مثلاً ہارورڈ کالج کی بنیاد 1636ء میں میساچوسٹس میں رکھی گئی۔ اہم ترین بات یہ ہے کہ 1647ء میں انگریز آبادکاروں نے اپنی آبادیوں میں ابتدائی تعلیم لازمی قرار دے دی۔ (تاریخی تقابل کے لیے یہ بات یاد رہے کہ یہ وہ وقت تھا جب برصغیر میں مغل بادشاہ شاہ جہاں حکمران تھا)۔ اسی صدی کے آخر میں امریکہ میں کئی کالج اور یونیورسٹیاں بنائی گئیں۔ چونکہ اس وقت کوئی مرکزی حکومت وجود میں نہیں آئی تھی، اس لیے یہ سب کچھ لوگ اپنی مدد آپ کے تحت کر رہے تھے۔ اُس وقت یہ سسٹم بھی بنایا گیا کہ عام طالب علموں سے فیس لی جاتی تھی لیکن

Marfat.com

غریبوں کے لیے مفت تعلیم کی سہولت مہیا کی گئی۔ بہت جلد بڑی بڑی لائبریریاں وجود میں آنے لگیں۔ 1704ء میں بوسٹن میں پہلا اخبار شروع ہوا، اور اس کے بعد ہر شہر سے اخباروں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ (اُس وقت برصغیر میں اورنگزیب کی حکومت تھی)۔

یورپی ممالک خصوصاً برطانیہ یہ چاہتا تھا کہ امریکہ اس کی کالونی بنا رہے، چنانچہ برطانوی حکومت نے امریکیوں پر کچھ ٹیکس عائد کرنے چاہے۔ اگرچہ امریکہ جانے والوں کی اکثریت انگریزی بولنے والوں پر مشتمل تھی، لیکن چونکہ ان کی اکثریت سلطنت برطانیہ کی باغی تھی، اس لیے انہوں نے مزاحمت کا فیصلہ کر لیا۔ اس مخالفت کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ مختلف امریکی ریاستیں ایک دوسرے کے قریب آ گئیں۔ واضح رہے کہ یہ ریاستیں بھی بس ایک قدرتی انداز میں ہی وجود میں آ گئی تھیں۔ چنانچہ 1765ء میں سب لوگوں کے نمائندوں پر مشتمل ایک کانگریس منعقد کی گئی، جس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ نمائندہ اسمبلیوں کے سوا کسی اور حکومت کو ان پر ٹیکس عائد کرنے کا قانونی اختیار حاصل نہیں۔ یہ اختلاف چلتا رہا۔ اپریل 1775ء میں برطانوی حکومت اور امریکیوں کے درمیان جنگ شروع ہو گئی۔ یہ جنگ اگلے آٹھ برس تک جاری رہی، حتیٰ کہ اس جنگ میں برطانیہ کو شکست ہوئی اور 1783ء میں برطانیہ نے امریکہ کو ایک آزاد ملک تسلیم کر لیا۔ اس جنگ میں دونوں طرف سے ہزارہا لوگ ہلاک ہوئے۔ اس جنگ میں امریکی افواج کی کمان جارج واشنگٹن کے ہاتھ میں تھی۔ 1787ء میں ایک نمائندہ وفاقی کنونشن میں جارج واشنگٹن کو صدر منتخب کر لیا گیا۔ پہلے دن سے ہی یہ فیصلہ کیا گیا کہ امریکہ ایک جمہوری آئین کے تحت زندہ رہے گا اور اس میں تعلیم اور انصاف کو سب سے زیادہ اہمیت دی جائے گی۔ اگرچہ جارج واشنگٹن خود بھی ایک سپہ سالار تھا، لیکن اسے بھی باقاعدہ جمہوری طریقے سے منتخب کیا گیا۔ صدارت کی دو مدت یعنی آٹھ برس گزارنے کے بعد اُس نے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ اب دوسرے رہنماؤں کے لیے کرسی خالی کر دے گا۔ یہ وہ وقت تھا جب سارے امریکی یہ چاہتے تھے کہ جارج واشنگٹن ہی صدارت کی کرسی پر فائز رہے، لیکن اُس نے کہا کہ جمہوریت کی ترقی کے لیے یہ ضروری ہے کہ میں

Marfat.com

اقتدار سے علیحدہ ہو جاؤں۔ چنانچہ اقتدار سے علیحدگی کے بعد وہ واشنگٹن سے ڈیڑھ سو میل کے فاصلے پر اپنی جاگیر ماؤنٹ ورنن چلا گیا، جہاں وہ زندگی کے آخری لمحے تک اپنی زراعت کو ترقی دیتا رہا اور اس کے لیے تجربات کرتا رہا۔

1812ء میں ایک دفعہ پھر برطانیہ اور امریکہ کے درمیان کینیڈا کے مسئلے پر جنگ چھڑ گئی۔ یہ جنگ تین برس تک جاری رہی اور اس میں بھی دونوں طرف سے ایک لاکھ کے قریب افراد قتل ہوئے۔ اس جنگ میں نہ کوئی جیتا اور نہ ہارا۔ بالآخر دونوں طاقتوں کو آپس میں صلح کرنی پڑی۔

امریکہ کی جنوبی ریاستوں کے پاس بہت بڑی زرعی زمین تھی۔ ان زمینوں کی کاشت کے لیے صرف سفید فام لوگ کافی نہیں تھے۔ چنانچہ جنوبی ریاستوں نے اپنی زمینوں کو آباد کرنے کے لیے ایک انتہائی ظالمانہ اور سفاکانہ فیصلہ کیا۔ وہ یہ کہ انہوں نے بحری جہازوں کے ذریعے افریقہ پہنچ کر وہاں سے لاکھوں لوگوں کو اغوا کیا اور انہیں بطورِ غلام لا کر اپنی زمینوں کو ان کے ذریعے آباد کیا۔ ان غلاموں کو انتہائی ناگفتہ بہ حالات میں افریقہ سے امریکہ لایا جاتا تھا، چنانچہ بے شمار افریقی راستے ہی میں مر جاتے تھے۔ واضح رہے کہ امریکہ کی تیرہ شمالی ریاستوں نے اس میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ گویا اُس وقت امریکہ دو حصوں میں تقسیم ہو گیا، ایک شمالی آزاد پسند حصہ، اور دوسرا جنوب کا غلامی پسند علاقہ۔ (ان غلاموں کی اولاد آج بھی امریکہ کی آبادی کا گیارہ فیصد ہے۔ اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اُس زمانے میں کتنے بڑے پیمانے پر غلاموں کی تجارت ہوئی ہوگی)۔ رفتہ رفتہ یہ مسئلہ امریکہ کا سب سے بڑا مسئلہ بن گیا اور شمالی ریاستوں نے اعلان کر دیا کہ وہ غلامی کو مٹا کر رہیں گے۔ اس تحریک کو 1830ء میں اُس وقت پہلی کامیابی حاصل ہوئی جب کانگریس میں یہ فیصلہ ہوا کہ آئندہ افریقہ سے غلاموں کو لانا اور غلاموں کی تجارت جرم ہوگا۔ اس وقت شمالی علاقوں میں دو ہزار سے بھی زیادہ ایسی تنظیمیں بنیں جو غلاموں کو فرار ہونے میں مدد دیتی تھیں اور پھر ان کو بحیثیت آزاد انسان جائے پناہ مہیا کرتیں۔ شاعروں، قانون سازوں، اخباروں

Marfat.com

اور افسانہ نگاروں نے اس میں بھرپور حصہ ادا کیا۔ مثلاً ایک کتاب ''انکل ٹام نامی ایک غلام کی موت'' نامی کتاب 1852ء میں شائع ہوئی اور ایک سال کے اندر اندر اُس کی تیس لاکھ سے زیادہ کاپیاں چھپ کر فروخت ہوگئیں۔ 1860ء میں ری پبلکن پارٹی نے ابراہیم لنکن کو عہدہ صدارت کے لیے نامزد کرتے وقت اعلان کر دیا کہ اب وہ ہر صورت میں امریکہ سے غلامی کی لعنت ختم کر کے دم لے گی۔ چنانچہ لنکن کی کامیابی کے فوراً بعد شمالی اور جنوبی ریاستوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ اس جنگ میں شمالی ریاستوں کی طرف سے بیس لاکھ سے زیادہ افراد نے شرکت کی۔ ان میں وہ پچاس ہزار سفید فام اور ایک لاکھ افریقی بھی شامل تھے جو اگرچہ جنوبی ریاستوں سے تعلق رکھتے تھے، لیکن غلامی کے خلاف ہونے کی وجہ سے انہوں نے شمالی ریاستوں کی فوج میں شامل ہو کر جنگ لڑی۔ اس لڑائی میں جنوب کی طرف سے بھی تقریباً آٹھ لاکھ سپاہی موجود تھے۔ اُس وقت شمالی ریاستوں کی تعداد تیس تھی اور اُن کی مجموعی آبادی دو کروڑ بیس لاکھ تھی۔ اس کے مقابلے میں غلامی پسند جنوبی ریاستوں کی تعداد گیارہ تھی اور ان کی آبادی نوے لاکھ تھی۔ یہ جنگ اگلے چار برس تک جاری رہی۔ اس میں دونوں طرف سے لاکھوں سپاہی ہلاک ہوئے، جن کی بہت بڑی اکثریت سفید فاموں پر مشتمل تھی۔ اس جنگ میں شمالی ریاستوں کو لنکن کی سرکردگی میں فیصلہ کن فتح حاصل ہوئی اور اس کے نتیجے میں غلامی کو مکمل طور پر ختم کر دیا گیا۔

اس جنگ کے نتیجے میں امریکہ حقیقی معنوں میں ایک ملک بن گیا۔ اور اس کے بعد سب لوگوں نے تعمیرِ نو کی طرف توجہ دی۔ خصوصاً سائنسی علم کی طرف اتنی بڑی توجہ دی گئی کہ اگلے چالیس برس میں چھ لاکھ سے بھی زیادہ نئی ایجادات کو پیٹنٹ کرایا گیا۔ اب یہ ایڈیسن، مورس اور گراہم بیل جیسے سائنس دانوں کا دور تھا۔ یہ ترقی مسلسل جاری رہی، حتیٰ کہ پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی۔ اس جنگ کی ابتدا میں امریکہ شریک نہیں تھا۔ تاہم جرمنی نے امریکہ سے مطالبہ کیا کہ وہ برطانیہ اور فرانس سے ہر طرح کے تجارتی تعلقات ختم کر دے۔ امریکہ نے اس سے انکار کیا۔ چنانچہ جرمن آبدوز کشتیوں نے امریکی تجارتی جہازوں پر حملے شروع کر دیے۔ جنگ کے آخری

Marfat.com

سال میں امریکہ نے بھی جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کیا اور اپنے بیس لاکھ سے زیادہ سپاہی فرانس اور برطانیہ کے دفاع کے لیے بھیجے۔ اس کی وجہ سے جرمنی کو فیصلہ کن شکست ہوگئی۔

دوسری جنگ عظیم کی ابتدا میں بھی امریکہ نے حصہ نہیں لیا۔ تاہم جنگ شروع ہونے کے تین سال بعد، جب جاپان نے امریکی بندرگاہ پرل ہاربر پر ایک زبردست حملہ کر کے ہزاروں امریکی فوجیوں اور سینکڑوں امریکی بحری جہازوں کو تباہ کرلیا، تو امریکہ نے جاپان کے خلاف اعلان جنگ کرلیا۔ اس جنگ میں ساڑھے چھ لاکھ امریکی سپاہیوں نے حصہ لیا۔ اس جنگ کا خاتمہ امریکہ کی طرف سے ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم کے حملے سے ہوا۔ اس حملے میں ان دونوں شہروں کے تقریباً دو لاکھ عام شہری بھی ہلاک ہوئے۔ ظاہر ہے کہ امریکہ کی طرف سے یہ ایک کھلی دہشت گردی تھی، کیونکہ اس حملے کے بغیر بھی جاپان کو شکست دی جاسکتی تھی۔

امریکی جمہوریت

جیسا کہ ہم نے دیکھا، امریکہ کی زندگی میں کئی اندرونی لڑائیاں ہوئی ہیں۔ تاہم اس کے باوجود پہلے دن سے ہی امریکی جمہوریت پختہ بنیادوں پر قائم ہے۔ پچھلے سو برس سے ہر چار سال بعد نومبر کے مہینے کے پہلے ہفتے میں صدارتی انتخاب ہوتا ہے۔ کانگریس کا انتخاب ہر چھ برس بعد ہوتا ہے۔ یہ انتخاب آبادی کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ سینٹ کا انتخاب ہر دو برس بعد ہوتا ہے اور ہر ریاست سے دو سینیٹرز منتخب ہوتے ہیں۔ دونوں بڑی پارٹیوں کے اندر بھی کامل جمہوریت ہے۔ شروع سے ہی دھاندلی کا تصور نہیں ہے۔ تاہم اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہاں سب کچھ پہلے دن سے ہی ٹھیک ہے۔ وہاں کے منتخب ارکانِ پارلیمنٹ اور دوسرے ذمہ دار افراد کی ایک بڑی تعداد بہت عرصے تک کرپٹ رہی ہے، اور اس خامی پر ایک لمبی جدوجہد کے بعد ہی جا کر قابو پایا جاسکا ہے۔ ایک زمانے میں منتخب امریکی حکمران اپنے ذاتی مفادات کے لیے وہ سب کچھ کرتے تھے، جو آج پاکستان کے منتخب حکمران کرتے ہیں۔

امریکی جمہوریت کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ اس کی بنیاد سرمائے پر ہے۔ ہر

Marfat.com

انتخاب میں اربوں ڈالر لگتے ہیں۔ یورپی ممالک کے برعکس یہاں پیسے کے بغیر کوئی سیاست دان ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اگر چہ اس سارے سسٹم کو قانون کے دائرے میں لایا گیا ہے اور چندے کے ہر ڈالر کا حساب رکھا جاتا ہے۔ تاہم اپنی بنیاد میں یہ ایک کامل سرمایہ دارانہ جمہوریت ہے۔ ظاہر ہے کہ کانگریس اور سینٹ کا ہر ممبر اُن تمام اداروں کے مفادات کا پورا پورا خیال رکھتا ہے جنہوں نے اُسے انتخاب کے لیے چندہ دیا ہوتا ہے۔

امریکہ اور ویت نام کی جنگ

دوسری جنگ عظیم میں ویت نام جاپانی قبضے میں آ گیا تھا۔ جاپان کی شکست کے بعد جنوبی حصے کو فرانس نے اپنی تحویل میں لے لیا۔ جب کہ شمالی حصے میں چین کے زیرِ اثر ایک آزاد کمیونسٹ حکومت قائم ہوگئی۔ جنوبی حصے کے اکثر لوگ بھی کمیونزم کو پسند کرتے تھے اور شمالی ویت نام کے ساتھ ملنا چاہتے تھے۔ فرانس اور امریکہ دونوں ہی اس کے مخالف تھے۔ اگر چہ درمیان میں اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے کئی بین الاقوامی کانفرنسیں ہوئیں، تاہم ان میں سے اکثر معاہدوں کی فرانس اور امریکہ نے پابندی نہیں کی۔ بالآخر امریکہ نے اپریل 1965ء میں جنوبی ویت نام کی حکومت کو بچانے کے لیے اپنی افواج بھیجیں۔ دوسری طرف روس اور چین نے شمالی ویت نام کی حمایت شروع کر دی۔ اُس وقت جنوبی ویت نام کے اندر ایک بہت بڑی گوریلا تحریک ''ویت کانگ'' کے نام سے شروع ہوئی۔ یہ لڑائی کم وبیش آٹھ برس تک جاری رہی اور اس میں امریکہ کے لاکھوں فوجیوں نے حصہ لیا۔ ایک وقت میں وہاں امریکی فوجیوں کی تعداد پانچ لاکھ چھتیس ہزار تک بھی پہنچ گئی تھی۔ اس لڑائی میں امریکہ کو شکست فاش ہوئی اور 1973ء میں امریکہ کو وہاں سے نکلنا پڑا۔ اس لڑائی میں امریکہ کے اڑسٹھ ہزار (68000) فوجی ہلاک ہوئے۔ اس سے زخمی فوجیوں اور دوسرے نقصان کا بخوبی اندازہ لیا جا سکتا ہے۔ اپنی پوری تاریخ میں یہ امریکہ کی سب سے بڑی شکست تھی۔ تاہم یہ بات بھی اپنی جگہ پر اہم ہے کہ اس شکست سے امریکہ کو نہ تو معاشی طور پر کوئی نقصان پہنچا اور نہ اس کے سپر پاور ہونے میں کوئی مسئلہ پیدا ہوا۔

Marfat.com

افغانستان میں امریکی مداخلت

ظاہر شاہ کے وقت میں افغان فوج کے اندر کمیونسٹوں کا اثر ونفوذ بہت بڑھ گیا تھا۔ 1973ء میں ظاہر شاہ کے چچازاد بھائی سردار داؤد نے کمیونسٹوں کی مدد سے اقتدار پر قبضہ کرلیا۔ اس کے پانچ برس بعد یعنی اپریل 1978ء میں نور محمد ترکئی کی سربراہی میں کمیونسٹوں نے ایک فوجی انقلاب کے ذریعے اقتدار پر قبضہ کرلیا۔ ڈیڑھ سال بعد یعنی ستمبر 1979ء میں کمیونسٹوں کے ایک اور دھڑے کے سربراہ اور وزیر دفاع حفیظ اللہ امین نے حکومت پر قبضہ کرلیا۔ چونکہ حفیظ اللہ امین کے لیے حالات کو اپنے کنٹرول میں رکھنا ممکن نہیں تھا، اس لیے تین مہینے بعد روسی افواج افغانستان میں داخل ہوگئیں اور ببرک کارمل کو صدارت پر فائز کردیا گیا۔

اس تبدیلی کے فوراً بعد پاکستان کے فوجی صدر جنرل ضیاء الحق نے کمیونزم مخالفت طاقتوں کی مدد کے ذریعے روسی افواج کی مزاحمت کا فیصلہ کرلیا۔ واضح رہے کہ افغان حکومت کے مخالف دھڑوں کے اکثر لیڈر مثلاً استاد ربانی اور گلبدین حکمت یار 1974ء سے ہی پاکستان میں مقیم تھے۔ یہ لوگ سردار داؤد کی حکومت کے بھی مخالف تھے، لیکن اب تو مسلح مزاحمت کے لیے ایک بہت بڑا جواز بھی مل گیا تھا۔

اُس وقت امریکہ میں ڈیموکریٹک پارٹی کے صدر جمی کارٹر کی حکومت تھی۔ اس نے روسی افواج کے خلافت مزاحمت میں پاکستان کی مدد کرنے میں کوئی خاص گرم جوشی نہ دکھائی۔ لیکن جب 1980ء میں ری پبلکن صدر ریگن اقتدار میں آیا تو اس نے اس کو روسیوں سے ویت نام کی جنگ میں امریکی شکست کا بدلہ لینے کا بہترین سنہری موقع جانا اور اس نے اس مزاحمت کی کامیابی کو اپنی خارجہ پالیسی کا سب سے بڑا کام بنا دیا۔ اس پالیسی کے تحت امریکہ نے مزاحمت کرنے والی آٹھ تنظیموں اور جنرل ضیاء الحق کی حکومت کو اربوں ڈالر کا اسلحہ اور دوسری امداد دی۔ اس وقت امریکہ کو 'مجاہدین' کا لفظ بہت بھلا لگتا تھا۔ پاکستانی حکومت نے اس مزاحمت کو کفر اور اسلام کے مقابلے کا نام دیا۔ دوسری طرف امریکہ نے بھی اسے خدا پرستوں اور ملحدین کے درمیان مقابلے کا

Marfat.com

نام دیا۔ یوں امریکہ نے اس جنگ میں اپنے مفادات کو پورا کرنے کے لیے مذہب کا خوب خوب استعمال کیا۔ اس وقت امریکہ، مجاہدین اور پاکستان تینوں طاقتیں یہ سوچ رہی تھی کہ وہ ایک دوسرے کو استعمال کر رہے ہیں۔ امریکہ کا خیال تھا کہ وہ اپنے ایک سپاہی کو بھی مروائے بغیر افغانستان میں روس کو شکست دے دے گا۔ دوسری طرف پاکستانی حکمرانوں کا یہ خیال تھا کہ اس مزاحمت کی کامیابی کی صورت میں افغانستان عملاً ہمارا پانچواں صوبہ بن جائے گا۔ اس وقت کے پاکستانی جرنیل اس مقصد کے لیے Strategic Depth کی اصطلاح استعمال کرتے تھے۔ تیسری طرف افغان مجاہدین کا یہ خیال تھا کہ وہ کامیابی کے بعد افغانستان میں ایک اسلامی حکومت تشکیل دے دیں گے۔ مجاہدین کی آٹھوں کی آٹھ جماعتیں آپس میں ایک دوسرے کی بھی سخت دشمن تھیں، اور ان میں سے ہر ایک گروہ یہی سمجھتا تھا کہ روسیوں کو شکست دینے کے بعد وہ باقی ماندہ تنظیموں پر بھی غالب آجائے گی اور یوں وہ بلاشرکت غیرے افغانستان میں اپنی حکومت قائم کرلے گی۔

اُس وقت امریکی یہ بھول گئے تھے کہ مذہبی جذبات کی بنیاد پر برپا کی گئی تحریک کا رخ کسی خاص موڑ پر اس کے خلاف بھی مُڑ سکتا ہے۔ پاکستانی حکمران یہ بھول گئے تھے کہ افغانستان اپنی صدیوں پرانی تاریخ بھول کر پاکستان کا پانچواں صوبہ بننے پر کیسے رضامند ہوسکے گا۔ اور افغان مجاہدین نے بھی اس وقت یہ بات فراموش کرلی تھی کہ کیا امریکیوں کے دل میں اسلام کے لیے یک بیک اتنی محبت کیسے پیدا ہوگئی ہے کہ وہ اپنے اربوں ڈالر دے کر خود اپنے ہاتھ سے ایک اسلامی حکومت کی تعمیر کرنے چلے ہیں۔ پاکستان اور افغان مجاہدین تاریخ کا یہ سبق بھی بھول گئے تھے کہ جب بھی مختلف طاقتیں آپس میں اتحاد کرتی ہیں تو ہمیشہ سب سے بڑی طاقت ہی کے مفادات پورے ہوتے ہیں۔ چنانچہ تاریخ نے اِن تینوں طاقتوں کو اپنی اپنی منافقت اور خودغرضی کا بھرپور سبق سکھایا۔

1990ء کی خلیجی جنگ میں کویت کو آزاد کرانے کے لیے، اقوامِ متحدہ کے تحت، سب

Marfat.com

سے بڑا کردار امریکہ نے ادا کیا۔ ظاہر ہے کہ اس سے امریکہ کا اصل مقصد یہ تھا کہ مغرب کو تیل کی فراہمی بغیر کسی رکاوٹ کے جاری رہے۔ خلیجی جنگ میں کامیابی کے فوراً بعد امریکہ نے سعودی عرب میں اپنے فوجی اڈے بنا لیے۔ ان فوجی اڈوں سے عالمِ اسلام میں بڑا غم و غصہ پیدا ہوا، اس لیے کہ سرزمینِ عرب کو سب مسلمان بہت مقدس مانتے ہیں۔ یہ امریکہ کی ایک بھیانک غلطی بلکہ جُرم تھا، کیونکہ اسی اقدام نے بن لادن کو امریکہ دشمنی پر آمادہ کیا اور القاعدہ کی بنیاد پڑی۔

گیارہ ستمبر 2001ء کو نیویارک میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے دونوں ٹاوروں پر ہوائی جہازوں کے ٹکرانے کے ذریعے خودکش حملہ کیا گیا۔ اسی دن امریکی وزارت دفاع کے واشنگٹن میں مرکزی بلڈنگ پینٹا گان پر بھی ایسا ہی خودکش حملہ کیا گیا، جب کہ خودکش حملے کے لیے استعمال کیا جانے والا ایک اور جہاز خودکش حملہ آوروں اور مسافروں کے درمیان جھگڑے کے دوران میں زمین پر گر کر تباہ ہو گیا۔ ان حملوں، جن کو اب مختصراً نائن الیون کا نام دیا جاتا ہے، موجودہ حالات کا پورا دھارا بدل دیا۔ امریکہ نے فوراً کہا کہ ہمارا سب بڑا شک بن لادن اور اس کے ساتھیوں پر ہے، چنانچہ اس نے افغانستان کی طالبان حکومت کو الٹی میٹم دیا کہ وہ ان لوگوں کو تحقیقات اور مقدمہ چلانے کے لیے امریکہ کے حوالے کر دے۔ طالبان نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا، چنانچہ دو مہینے بعد یعنی نومبر 2001ء میں امریکہ نے افغانستان پر بمباری شروع کر دی اور طالبان حکومت کو گرانے کے لیے شمالی اتحاد کی عملی مدد بھی شروع کر دی۔ چار مہینے کے اندر اندر، امریکہ، غیر پختون شمالی اتحاد اور ان کے پختون ساتھی حامد کرزئی کی مدد سے طالبان حکومت کو ختم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

طالبان حکومت تو ختم ہو گئی لیکن نہ بن لادن کو پکڑا جا سکا اور نہ اس کے کسی قریبی ساتھی کو پکڑا جا سکا۔ حتیٰ کہ ملا عمر بھی امریکیوں کے ہاتھ نہیں آ سکے۔ گویا اس جنگ کے ذریعے امریکہ اس حد تک تو کامیاب رہا کہ اس نے القاعدہ کو وقتی طور پر نقصان پہنچا دیا، لیکن اس پہلو سے وہ ناکام رہا کہ نائن الیون کے ذمہ دار ابھی تک کٹہرے سے بہت دور ہیں۔

Marfat.com

افغان کے اندر اپریل 1978ء سے جو غیر یقینی صورت حال پیدا ہوئی تھی، وہ اب تک باقی ہے۔ افراتفری اور خانہ جنگی موجود ہے۔ امریکی اور نیٹو کی افواج افغان سرزمین پر موجود ہیں ۔فی الوقت نہ وہ جاسکتی ہیں اور شاید جانا بھی نہیں چاہتیں۔

حامد کرزئی کی حکومت بننے کے فوراً بعد امریکہ نے افغانستان میں تعمیرِ نو کے لیے جو وعدے کیے تھے، ان کو پورا کرنے میں بھی وہ ناکام رہا۔ اس لیے کہ اس کے ایک سال چار مہینے بعد امریکہ نے، بغیر کسی حقیقی وجہ کے، عراق پر حملہ کردیا۔ اس حملے کے نتیجے میں وہ عراق میں بری طرح پھنس گیا اور اب اسے عراق میں سالانہ کم از کم ایک سو ارب ڈالر خرچ کرنے پڑ رہے ہیں۔ چنانچہ اس وجہ سے افغانستان کی تعمیرِ نو سے اس کی توجہ ہٹ گئی۔

سوال یہ ہے کہ کیا نائن الیون کے بعد افغانستان پر حملہ کر کے امریکہ نے اپنے حق میں اچھا کیا یا برا کیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حملہ امریکہ کے لیے مزید مصیبتیں پیدا کرنے کا باعث بن گیا ہے۔ چونکہ اس حملے کے نتیجے میں ہزاروں بے گناہ افغانی بھی ہوائی بمباری کا شکار ہوئے، اس لیے پشتو بولنے والے علاقوں میں خصوصاً، اور عالم اسلام میں عموماً غم وغصہ پیدا ہوگیا۔ اس غم وغصے کی وجہ سے بے شمار جگہوں میں علاقائی خودمختار القاعدہ جیسی تنظیموں نے جنم لیا۔ دوسری طرف عوام کے اندر بھی امریکہ کے خلاف ایک بڑی نفرت کی لہر دوڑ گئی۔ چونکہ افغانستان میں تعمیر نو کا کام بھی حسب توقع نہ ہوسکا، اس لیے افغان عوام کے اندر بھی مایوسی نے جنم لیا جس سے طالبان کو دوبارہ منظم ہونے میں مدد ملی۔

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اگر نائن الیون کے بعد امریکہ افغانستان پر حملہ نہ کرتا اور غیر حربی طریقوں مثلاً اقتصادی ناکہ بندی کے ذریعے افغان حکومت پر دباؤ ڈالتا تو یہ طریقہ زیادہ نتیجہ خیز ثابت ہوسکتا تھا۔

مسئلہ افغانستان کا درج بالا تجزیہ خالصتاً امریکہ کے حوالے سے تھا۔ جہاں تک پاکستان اور افغانستان کے مفادات کا تعلق ہے، اس حوالے سے مفصل تجزیہ ایک علیحدہ باب میں کیا جائے گا۔

Marfat.com

عراق میں امریکی مداخلت

ابھی افغانستان میں القاعدہ اور طالبان کا مسئلہ پورے عروج پر تھا کہ امریکہ نے یک دم عراق کی صدام حکومت کے خلاف ایک پروپیگنڈا مہم شروع کر دی۔ کچھ شواہد یہ بتاتے ہیں کہ امریکہ کی ری پبلکن حکومت نے نائن الیون سے پہلے ہی عراق پر حملہ کر کے صدام حکومت کے خاتمے کا فیصلہ کر لیا تھا، لیکن نائن الیون کی وجہ سے اس منصوبے کو موخر کرنا پڑا۔ 2002ء کے اواخر میں امریکہ نے دعویٰ کیا کہ عراق کے پاس وسیع پیمانے پر تباہی کے ہتھیار Weapons of Mass Destruction موجود ہیں۔ برطانوی وزیر اعظم ٹونی بلیئر نے بھی صدر بش کی ہاں میں ہاں ملا دی۔ اور یوں ان دونوں نے ایک نام نہاد مقدمہ تیار کر لیا۔ فرانس اور جرمنی سمیت اکثر مغربی ملکوں، روس، چین، عالم اسلام اور انٹرنیشنل اٹامک انرجی کمیشن کے ذمہ دار افراد سمیت سبھی ممالک اور اداروں نے امریکی دعوے کو غلط قرار دیا۔ تاہم چونکہ امریکہ اس حملے پر تلا بیٹھا تھا اس لیے اس نے اپریل 2003ء میں ایک لاکھ سے زیادہ افواج کے ساتھ عراق پر حملہ کر دیا اور یوں صدام حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

آخر امریکہ نے یہ حملہ کیوں کیا؟ ظاہر ہے کہ امریکہ کو خود بھی یہ معلوم تھا کہ (W.M.D,s) کا اس کا دعویٰ سراسر جھوٹ ہے، تو پھر اسے کیا ضرورت پڑی تھی کہ وہ عراق پر حملہ کرے۔ اس کے عموماً تین جواب دیے جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس طریقے سے دراصل اسرائیل کو عراق کے متوقع حملے سے بچانا مقصود تھا۔ دوسرا یہ کہ امریکہ عراق کے تیل پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ اور تیسرا یہ کہ اس طریقے سے دراصل امریکہ کی خواہش یہ تھی کہ عالم عرب میں امریکی چھتری کے تحت ایک نام نہاد جمہوری دور شروع ہو جائے، کیونکہ اس کے خیال میں آمرانہ حکومتوں کے زیر اثر انتہا پسندانہ خیالات جنم لیتے ہیں اور القاعدہ جیسی تنظیموں کا جنم ہوتا ہے۔ اس راقم کے خیال میں یہی تیسری بات جزوی طور پر صحیح ہے۔ عراق میں اسرائیل کے مقابلے کا کوئی دم خم نہیں تھا۔ 1980ء میں اسرائیل نے عراق کے نیوکلیئر پلانٹ کو دو منٹ کی بمباری کے ذریعے

Marfat.com

ملیا میٹ کر کے اس کے نیوکلیئر پروگرام کو ختم کر دیا تھا۔ رہی سہی کسر 1991ء میں اُس وقت پوری ہوگئی تھی جب عراق نے کویت پر قبضہ کر لیا تھا اور اتحادی فوجوں کے حملے کے نتیجے میں عراق کی صدام حکومت بالکل بے دست و پا ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اسرائیل کو عراق سے فی الحال کوئی خطرہ نہیں تھا۔ جہاں تک دوسری وجہ یعنی تیل کا تعلق ہے، تو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ 1991ء کے بعد تیل کے کنوؤں پر عملاً صدام حکومت کا کوئی اختیار باقی نہیں رہا تھا۔ تیل کے اکثر کنوئیں شیعہ اکثریتی علاقوں میں تھے، جو 1991ء کے بعد عملاً خودمختار ہو چکے تھے۔ تیل کے بقیہ کنوئیں بھی، اقوام متحدہ کی ریزولیشن کے تحت صرف اور صرف 'تیل برائے خوارک' کے پروگرام کے تحت استعمال کیے جا سکتے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ عراقی تیل بہت عرصے سے عملاً امریکی قبضے میں تھا۔ تیل پیدا کرنے والے سارے بڑے ممالک مثلاً سعودی عرب، کویت اور متحدہ عرب امارات وغیرہ پہلے سے ہی امریکہ کے پوری طرح زیرِ اثر تھے، اس لیے امریکہ کو تیل کی کمی کا کوئی مسئلہ درپیش نہیں تھا اور مستقبلِ قریب میں بھی کوئی مسئلہ درپیش ہونے کا امکان نہیں تھا۔

چنانچہ اس راقم کے خیال میں امریکہ کا مقصد یہ تھا کہ عراق میں صدام حکومت کا تختہ الٹ کر امریکہ کے زیر اثر ایک نیم جمہوری حکومت قائم کر دی جائے تا کہ اس طرح انتہا پسندی کو روکا جا سکے اور ممکن ہے کہ اس کے مابعد اثرات کے ذریعے عرب حکومتوں اور اسرائیل کے درمیان ایک ایسا معاہدہ امن بھی عمل میں آ سکے جو سراسر اسرائیل کے مفاد میں ہو۔

عراق کے متعلق امریکی تجزیہ خامیوں سے بھرپور اور نہایت سطحی تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ منصوبہ خودفریبی کے سوا کچھ نہ تھا تو یہ مبالغہ نہیں ہوگا۔ امریکہ اس بات کو فراموش کر بیٹھا تھا کہ عراق کے اندر ساٹھ فیصد عرب اہل تشیع، بیس فیصد عرب اہل سنت اور بیس فیصد کرد اہل سنت موجود ہیں جن کے درمیان طاقت کا نہایت نازک توازن موجود رہا ہے۔ اس توازن کے ٹوٹنے کے نتیجے میں ان تینوں طاقتوں کو متحد رکھنا ناممکن حد تک مشکل ہوگا۔ صدام حسین کے دور میں عراق پر

Marfat.com

عملاً سنی عرب برسراقتدار تھے۔ ان کے اقتدار کے خاتمے کے نتیجے میں وہ لازماً نئے سیٹ اپ کے خلاف ایڑی چوٹی کا زور لگائیں گے، کیونکہ آئندہ کسی بھی سیٹ اپ میں ان کی حیثیت ایک اقلیت کی ہوگی۔ تیل کے چشمے بھی زیادہ تر اہل تشیع کے علاقے میں موجود ہیں۔ دوسری طرف جب اہل تشیع کو آزادی ملے گی تو لازماً ان کا جھکاؤ ایران کی طرف ہوگا جو امریکہ کا دشمن ہے۔ تیسری طرف جب کردوں کو خودمختاری ملے گی تو اس کے نتیجے میں اردگرد کے ہمسایہ ممالک میں موجود کردوں، خصوصاً ترکی میں موجود کرد گروہوں کی طرف سے بھی ایسا اقدام ہوسکتا ہے جس کے اثرات کی پیش گوئی ناممکن ہے۔

چونکہ امریکہ نے یہ سارے عوامل مدنظر نہیں رکھے تھے، اور دوسری طرف اس نے عراقی آرمی اور پولیس کو بھی تحلیل کردیا، چنانچہ اس کے نتیجے میں شیعہ اور سنی مسلح گروہوں کے درمیان ایک خونریز لڑائی چھڑگئی جو تادم تحریر جاری ہے۔ دونوں گروہوں کے اندر، خصوصاً سنیوں کے اندر ایسے مسلح گروہ موجود ہیں جو امریکہ کے کٹر دشمن ہیں۔ چنانچہ امریکہ ایک ایسی گہری دلدل میں پھنس گیا ہے جس سے نکلنے کے لیے اسے بہت بڑے فیصلے کرنے ہوں گے اور شاید ان فیصلوں کے نتیجے میں اسے ایک بڑی سبکی بھی اٹھانی ہوگی۔ اس جنگ میں اب تک امریکہ کو کم ازکم پانچ سو ارب ڈالر کا نقصان ہوچکا ہے، اور اس کے تین ہزار سے زیادہ سپاہی موت کے گھاٹ اتر چکے ہیں۔ دوسری طرف ایک جائزے کے مطابق پچھلے چار برس میں تقریباً چھ لاکھ عراقی لقمہ اجل بن چکے ہیں، جن کی اکثریت عام نہتے شہریوں پر مشتمل ہے۔ اگر اس جائزے کو مبالغے پر بھی محمول کرلیا جائے، تو یہ بات تو یقینی ہے کہ کم ازکم چار لاکھ عراقی اب تک اس جنگ کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں۔ گویا اس جنگ میں اصل نقصان تو عراقی عوام کا ہوا لیکن دوسری طرف امریکہ کا نقصان بھی کچھ کم نہیں ہوا۔

اس پورے تنازعے کی ایک نمایاں بات یہ ہے کہ دنیا بھر کے امن پسند شہریوں نے اس کے خلاف اپنے جذبات کا کھل کر اظہار کیا۔ امریکہ اور برطانیہ کے کئی شہروں میں لاکھوں افراد

Marfat.com

پر مشتمل ایسے تاریخی جلوس نکالے گئے جن کی مثال ملنی ناممکن ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی اکثریت، رنگ ونسل اور مذہب سے بالاتر ہو کر امن سے محبت رکھتی ہے اور جنگ سے نفرت کرتی ہے۔

اس تنازعے کا انجام کیا ہوگا؟ اس کا جواب آسان نہیں۔ اگر آئندہ انتخاب میں ڈیموکریٹک پارٹی برسرِ اقتدار آ گئی تو غالباً وہ امریکی فوجوں کو عراق سے جلد از جلد نکالنے کی کوشش کرے گی۔اس کے نتیجے میں ہوسکتا ہے کہ عراق کے اندر سنی اور شیعہ گروہوں کے درمیان تصادم مزید بڑھ جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کے نتیجے میں عراق عملاً تین حصوں میں تقسیم ہو جائے۔ اگر ایسا ہوگیا تو دنیا میں انتہا پسندی کی لہر مزید بڑھنے کا اندیشہ ہے اور امریکہ کو بھی مزید ''بن لادنوں'' کا سامنا کرنا پڑے گا۔دوسری طرف اگر ری پبلکن پارٹی برسرِ اقتدار آ گئی تو غالب گمان یہ ہے کہ امریکی فوجی عراق میں موجود رہیں گی۔ چنانچہ جو تضادات اور خونریزی جارہی ہے، یہی جاری رہے گی۔گویا امریکہ کے لیے 'نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن' کی صورت حال پیدا ہو چکی ہے۔

ایک اور سوال یہ ہے کہ کیا عراق سے نکلنے کے نتیجے میں امریکہ کی سپر پاور ہونے کی حیثیت میں کوئی کمی آ جائے گی؟ اس کا جواب نہیں میں ہے۔عراق سے اپنی افواج نکالنے کی صورت میں بھی امریکہ ہی فی الحال سپر پاور رہے گا البتہ اس سے دو چیزیں واضح طور پر سامنے آ جائیں گی۔ایک یہ کہ امریکہ کے لیے آئندہ کسی بڑے ملک میں فوجی مداخلت ناممکن حد تک مشکل ہو جائے گی۔دوسرا یہ کہ افغانستان اور عراق کے تجربے کے بعد یہ ممکن نہیں ہوگا کہ کوئی ملک یا کوئی حکمران امریکہ کی یقین دہانیوں یا اس کے وعدوں پر اعتبار کرے۔

درج بالا تجزیہ خالصتاً امریکہ کے حوالے سے تھا۔ جہاں تک عراق اور امتِ مسلمہ کے حوالے سے اس مسئلے کے تجزیے کا تعلق ہے، وہ آئندہ کے ایک باب میں تفصیل سے بیان کیا جائے گا۔

Marfat.com

امریکہ اور اسرائیل کا باہمی تعلق

یہ بات تو سبھی جانتے ہیں کہ اسرائیلی ریاست کی تخلیق برطانیہ کی مرہونِ منت تھی اور اب اس ریاست کی مسلسل تعمیر اور غیر متزلزل حمایت امریکہ کی طرف سے ہو رہی ہے۔ اگرچہ اسرائیل اب خود بھی درمیانے درجے کی ایک صنعتی طاقت بن چکا ہے، تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ اسرائیل امریکی امداد کے سہارے زندہ ہے۔ اس کے بجٹ کا دس پندرہ فیصد حصہ امریکی حکومت کی امداد اور دس پندرہ فیصد حصہ امریکی یہودیوں کی امداد پر مشتمل ہوتا ہے۔ امریکہ دنیا بھر میں سب سے زیادہ امداد اسرائیل کو دیتا ہے اور یہ امداد ناقابل واپسی ہے۔ اس کے علاوہ بھی امریکہ نے یہ ذمہ داری اپنی سر لی ہوئی ہے کہ وہ اسرائیل کے ہر نقصان اور بجٹ کے خسارے کو پورا کرے گا۔

اگرچہ امریکہ اور کچھ دوسرے مغربی ممالک اسرائیل کو ایک جمہوری ملک قرار دیتے ہیں تاہم یہ بات حقیقت سے بہت دور ہے۔ اسرائیل اپنے ملک میں موجود گیارہ لاکھ عرب شہریوں سے عملاً دوسرے درجے کے شہریوں والا سلوک کرتا ہے۔ یہ واحد ملک ہے جہاں مذہب، کلچر اور نسل ایک ہے اور اسے ایک ہی رکھنے پر اصرار کیا جاتا ہے تاکہ یہ ملک ہمیشہ ایک خالص یہودی ملک رہے۔ ایسا ملک دکھاوے کے لیے تو جمہوریت کا ڈرامہ رچا سکتا ہے مگر حقیقت میں کبھی جمہوری ملک نہیں بن سکتا۔ اس کے باوجود امریکہ نے ہر معاملے میں اسرائیل کی اندھا دھند حمایت کی ہے۔ اسرائیل کے صریحاً ناجائز اقدامات پر بھی امریکہ نے اسے کچھ نہیں کہا۔ امریکہ نے سلامتی کونسل میں تیس مرتبہ سے زیادہ اپنا ویٹو استعمال کر کے اسرائیل کے خلاف قراردادوں کو مسترد کیا ہے۔ بے شمار دفعہ ایسا بھی ہوا ہے کہ اقوام متحدہ اور دوسرے بین الاقوامی فورموں پر امریکہ اور اسرائیل ایک طرف تھے اور باقی ساری دنیا دوسری طرف۔ یہ بات بھی ساری دنیا کے علم میں ہے کہ اسرائیل ایک ایٹمی طاقت ہے اور اس کے پاس دو سو کے لگ بھگ نیوکلیئر وارہیڈز موجود ہیں۔ امریکہ اور برطانیہ نے ایٹمی میدان میں بھی ہمیشہ اسرائیل کی پشت پناہی کی ہے۔

Marfat.com

سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ آخر امریکہ کیوں ہر معاملے میں اسرائیل کی بے جا اور ظالمانہ حمایت کر رہا ہے۔ اس راقم کے نزدیک اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ امریکہ اسرائیل کو اپنی اکیاونویں (51st) ریاست سمجھتا ہے اور اسرائیل نے بھی امریکہ کو یہ باور کرایا ہوا ہے کہ وہ عملاً امریکہ کا ایک حصہ ہے اور مشرق وسطیٰ میں اس کے مفادات کا مکمل رکھوالا ہے۔

اس تعلق کی بنیاد اکتوبر 1956ء کے بعد پوری طرح استوار ہوئی۔ یہ وہ وقت تھا جب اسرائیل نے صحرائے سینا اور غزہ کی پٹی پر حملہ کر کے انہیں دو دن کے اندر فتح کر لیا۔ اس حملے میں برطانیہ اور فرانس کے ساتھ اسرائیل کا منصوبہ پہلے سے طے شدہ تھا۔ چنانچہ دو دن بعد برطانیہ اور فرانس کی فوجیں اس طے شدہ منصوبے کے تحت نہر سویز میں اتر گئیں اور اس پر قبضہ کر لیا۔ اس مداخلت پر امریکہ نے سخت ردعمل کا اظہار کیا اور صدر روز ویلٹ کے الٹی میٹم پر برطانیہ، فرانس اور اسرائیل کی افواج یہ جگہیں خالی کرنے پر مجبور ہو گئیں۔ اس واقعے سے اسرائیل کو یہ سبق ملا کہ اگر اس کو زندہ رہنا ہے اور اپنی توسیع کرنی ہے تو اسے مکمل طور پر امریکہ کا آلۂ کار بن کر رہنا پڑے گا۔ چنانچہ اسرائیل نے ایسا ہی کیا۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اسرائیل نے بہت کچھ داؤ پر لگا دیا۔ مثلاً یہودی مذہب اپنے معاشرتی قوانین میں اسلام سے بہت زیادہ سخت ہے، اس کے باوجود اسرائیل کے اندر شراب و کباب، نائٹ کلب، ڈسکو، Gays Cubs، Lesbian Clubs، اور ہر طرح کی دوسری بے حیائیاں امریکہ سے بھی زیادہ ہیں۔ اسرائیل کے ساحلی مقامات اپنی رنگا رنگی اور تفریحات میں کسی امریکی ساحل سے کم نہیں۔ کسی بھی انسان کو امریکہ سے اسرائیل یا اسرائیل سے امریکہ جانے کے لیے چند رسمی کاروائیوں سے بڑھ کر اور کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ اسرائیل اور امریکہ درمیان ٹیلی فون کال کا خرچ لوکل کال کے برابر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ایک امریکی سیاح اسرائیل جاتا ہے تو اسے ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے اور اسے کہیں بھی کوئی اجنبیت محسوس نہیں ہوتی۔ وہ اسرائیل کو گویا اپنے وطن ہی کا ایک ایسا حصہ سمجھتا ہے جس کی آب و ہوا کچھ مختلف ہے اور جو سیاحت کے لیے بہت موزوں ہے۔

Marfat.com

یہ بھی اپنی جگہ پر ایک حقیقت ہے کہ اسرائیلی جمہوریت (عربوں کے ساتھ روا رکھے گئے سلوک سے قطع نظر)، مغربی معیار پر پوری اترتی ہے۔ امریکی یہودیوں نے امریکہ کے ہر چھوٹے بڑے شہر میں کئی کئی ادارے قائم کرر کھے ہیں، جن میں سب سے بڑا ادارہ ہالوکاسٹ میوزیمز (Halocaust Musiums) کا سلسلہ ہے۔ ان میوزیمز کے ذریعے یہ دکھا جاتا ہے کہ ہٹلر نے کس طرح ساٹھ لاکھ یہودیوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔ سارے امریکی طالب علموں کو اپنے ہائی سکول کے دوران میں ان میوزیمز کا دورہ کرایا جاتا ہے۔ امریکی سیاست کے اندر سب سے طاقتور ترین لابی امریکا اسرائیل کمیٹی ہے۔ (American-Israel Committe)۔ امریکی ایوانِ نمائندگان کے اسی، نوے ممبر ہمیشہ اس کے رکن ہوتے ہیں۔ امریکہ کے اندر موجود یہودی کمیونٹی کی تعداد باون لاکھ (5.2 Million) ہے۔ گویا امریکہ کے اندر اسرائیل سے زیادہ یہودی بستے ہیں۔ اسرائیل کی حمایت میں یہ کمیونٹی مکمل متحد ہے۔ امریکی میڈیا، وکالت، میڈیکل پروفیشن اور ہیروں کی تجارت پر یہودی چھائے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ انتہائی منظم، مالدار اور باصلاحیت ہیں۔ ویسے تو امریکی یہودیوں کی نوے فیصد تعداد ڈیموکریٹک پارٹی کو ووٹ دیتی ہے اور صرف دس فیصد یہودی ری پبلکن پارٹی کو ووٹ دیتے ہیں۔ لیکن مالدار یہودی تنظیموں اور افراد نے اپنے آپ کو دونوں پارٹیوں کے درمیان یوں تقسیم کیا ہوا ہے کہ دونوں پارٹیوں کے فنڈز کا ایک بڑا حصہ انہی یہودیوں کی طرف سے آتا ہے۔ چنانچہ دونوں پارٹیاں یہودی سرمائے کی محتاج ہوتی ہیں۔

درج بالا تجزیے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ سیاسی مفادات کے اعتبار سے امریکہ اور اسرائیل ایک ہیں۔ چنانچہ عالم اسلام کو اسرائیل کے متعلق کوئی بھی حکمت عملی بناتے وقت اس اہم ترین نکتے کو ذہن میں رکھنا چاہیے۔

امریکی خارجہ پالیسی میں دوست اور دشمن کا تصور

Marfat.com

امریکہ کے سیاسی تعلقات میں دوستی کا تصور اُس تصور سے بہت کچھ مختلف ہے جو ہم پاکستانی رکھتے ہیں۔ امریکی سیاسی لغت میں دوستی ایک خالصتاً کاروباری معاملہ ہے۔ یہ نہ تو کوئی دیرپا چیز ہے اور نہ اسے دیرپا ہونا چاہیے۔ البتہ جہاں مفادات کی نوعیت پائیداری کی متقاضی ہو، وہاں دوستی بھی ایک لمبے عرصے تک چل سکتی ہے۔ اسرائیل کے علاوہ دنیا کے ہر ملک کے بارے میں یہی امریکی پالیسی ہے۔ اس بات کو امریکیوں نے کبھی چھپایا بھی نہیں۔ وہ صاف طور پر اور علی الاعلان یہ کہتے ہیں کہ ہماری کسی ملک سے دوستی کی میعاد ہمیشہ باہمی مفادات کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ ان مفادات میں سے سب سے اہم گروہ G-8 کے ممالک ہیں جن میں امریکہ کے علاوہ کینیڈا، برطانیہ، فرانس، جرمنی، سپین، اٹلی اور جاپان شامل ہیں۔ یہ سارے ممالک جمہوری ہیں، اقتصادی لحاظ سے دنیا میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ ہیں اور ان کی معاشرت بھی بڑی حد تک ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہے، اس لیے بہت سے معاملات میں ان کے مفادات بھی مشترک ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس گروپ کے سربراہی اجلاس باقاعدگی سے منعقد ہوتے ہیں۔ اگرچہ کئی سیاسی معاملات میں ان کے درمیان اختلاف رائے ہوتا ہے، تاہم اس اختلاف رائے کو وہ اپنے معاشی اور اقتصادی مفادات کے آڑے نہیں آنے دیتے۔

امریکی خارجہ پالیسی میں برازیل، مصر اور پاکستان کو بھی ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔ اسرائیل کو چھوڑ کر، دنیا بھر میں سب سے زیادہ امریکی امداد انہی تین ممالک کو ملتی ہے۔ برازیل جنوبی امریکہ کا سب سے بڑا ملک ہے۔ مصر عالم عرب کا سب سے ترقی یافتہ اور آبادی کے اعتبار سے سب سے بڑا ملک ہے، اور پاکستان جنوبی ایشیا میں ایک ایسی جگہ پر واقع ہے جہاں امریکی مفادات ہر وقت پھنسے رہتے ہے۔

سعودی عرب، کویت اور خلیج کے دوسرے ممالک امریکی خارجہ پالیسی میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں، کیونکہ یہ بھی دنیا کے جغرافیے میں ایک منفرد جگہ پر واقع ہیں۔ نائن الیون کے بعد امریکہ نے بھارت کو بھی اپنی خصوصی مہربانی کا مستحق گردانا ہے۔ اس کی وجہ دراصل بھارت کی

Marfat.com

ایک ارب سے زیادہ لوگوں پر مشتمل صارفین کی آبادی ہے۔ دوسری طرف بھارت بھی امریکہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے سب کچھ کرنے پر تیار ہے۔

امریکہ کی خارجی ترجیحات میں مذہب کو کوئی بڑا مقام حاصل نہیں۔ امریکہ نے افریقہ اور لاطینی امریکہ کے غریب عیسائی ملکوں کو کبھی کوئی اہمیت نہیں دی اور نہ ہی کبھی ان کی کوئی مدد کی ہے۔ فلسطین کے اندر موجود سارے عیسائی اسرائیل کے مخالف ہیں لیکن امریکہ نے کبھی ان عیسائیوں کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ امریکہ نے کئی ایسی خانہ جنگیوں میں کوئی خاص حصہ نہیں لیا جہاں ایک طرف عیسائی غالب اکثریت میں تھے اور دوسری طرف مسلمان تھے، لیکن وہاں امریکہ کے کوئی سٹریٹیجک مفادات نہیں تھے۔ مثلاً نائیجیریا کا ایک عیسائی اکثریت کا علاقہ بیافرا علیحدگی چاہتا تھا۔ اس مقصد کے لیے اس نے کئی برس تک مسلح جدوجہد کی لیکن امریکہ نے اس کی کوئی مدد نہیں کی۔ دوسری طرف جب یورپ کے سابقہ کمیونسٹ ممالک کے حصے بخرے کرنے کا عمل شروع ہوا تو وہاں دو مسلمان ممالک یعنی بوسنیا اور کوسوو کی آزادی کا امکان بھی پیدا ہونے لگا۔ اردگرد کے کٹر عیسائی ممالک مثلاً سربیا وغیرہ نے اس کی پوری مزاحمت کی اور مسلح کارروائیوں کے ذریعے ان دونوں علاقوں کو زیر کرنا چاہا۔ چونکہ اس علاقے میں امریکی مفادات موجود تھے، اس لیے بالآخر امریکہ ان دونوں مسلمان اکثریتی علاقوں کی مدد کو آ گیا اور امریکی مداخلت کی وجہ سے یورپ کے اندر دو مزید مسلمان ممالک وجود میں آ گئے۔ اگرچہ امریکہ نے دو مسلمان ممالک یعنی افغانستان اور عراق میں فوجی مداخلت کی ہے، جو یقیناً ایک ظالمانہ اور سفاکانہ اقدام تھا، لیکن امریکہ نے اس سے کہیں زیادہ مداخلت غیر مسلم ملکوں میں کی ہے۔ پچھلے سو برس میں اس کی ساری بڑی جنگیں غیر مسلموں اور خصوصاً عیسائی طاقتوں سے ہوئی ہیں، مثلاً پہلی جنگ عظیم میں وہ برطانیہ اور فرانس کے ساتھ مل کر جرمنی جاپان اور اٹلی کے خلاف لڑا، جس میں فریقین نے ایک دوسرے کے کروڑوں افراد کو ہلاک کر دیا۔ دوسری جنگ عظیم میں امریکہ نے برطانیہ، فرانس اور کمیونسٹ روس کا ساتھ دیا تاکہ ہٹلر، مسولینی اور جاپان کو نیچا دکھا سکے۔ اس لڑائی میں بھی کروڑوں لوگ ہلاک

Marfat.com

ہوئے۔اس کے بعد سب سے بڑی امریکی لڑائی ویت نام میں لڑی گئی جہاں امریکہ کے اڑسٹھ ہزار فوجی ہلاک ہوئے۔

امریکہ نے مذہب کے نام کو وقتاً فوقتاً اپنے مفادات کے لیے تو ضرور استعمال کیا ہے لیکن اس کی اصل دلچسپی ہمیشہ اپنے ملک کے مفادات سے رہی ہے۔مثلاً روس کے خلاف سرد جنگ کے دوران میں امریکہ نے کوشش کی کہ روس کو ملحد ثابت کر کے مسلمانوں کے ہمدردیاں حاصل کرے۔اسی طرح حالیہ نام نہاد 'دہشت گردی کے خلاف جنگ' (War again Terrorism) میں اسلامی بنیاد پرستی کو ایک اہم عامل کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے،لیکن اس سے امریکہ کا اصل مقصد یہ ہے کہ اس کے خلاف جاری غیر ریاستی مسلح کاروائیاں ختم ہو جائیں۔ دہشت گردی کے موضوع پر بھی ایک علیحدہ باب میں تفصیل سے بحث کی جائے گی۔

درج بالا سارے تجزیے کا خلاصہ یہ ہے کہ امریکی خارجہ پالیسی کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ امریکہ بحیثیت ملک بدستور مستقل طور پر سپر پاور کی حیثیت سے زندہ رہے اور اقوام عالم میں اس کا مقام سب سے اونچا رہے۔تاہم امریکہ اس بات کو اچھی طرح جانتا ہے کہ اس کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ ساری دنیا کو اپنے قبضے میں لے لے۔وہ یہ بھی جانتا ہے کہ نہ تو وہ مسلمانوں کی تعداد کم کر سکتا ہے، نہ مسلمانوں کو ختم کر سکتا ہے اور نہ ان سب کو جسمانی طور پر غلام رکھ سکتا ہے۔ امریکہ جانتا ہے کہ اس کے ہاں سپرمین نہیں بستے اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ امریکی نظام اور امریکی انسانوں میں بھی بڑی کمزوریاں، جھول اور تضادات ہیں۔لہٰذا وہ سب سے طاقت ور ملک کے حیثیت سے تو زندہ رہ سکتا ہے لیکن یہ ممکن نہیں کہ صرف اسی کے پاس طاقت ہو اور باقی کسی ملک کے پاس کوئی طاقت نہ ہو۔

امریکہ دوسرے ممالک کے اندرونی معاملات میں کیسے دخیل ہوتا ہے.

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ دنیا میں ہر جگہ امریکی تنخواہ دار ایجنٹ ایک بڑی تعداد میں ہیں جو امریکی ہدایات کے تحت اپنے ملکی معاملات میں امریکی پالیسی کے مطابق کام کرتے

Marfat.com

ہیں۔ یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ یقیناً امریکہ نے کئی ہزار افراد کو تنخواہ دار ایجنٹوں کے حیثیت سے بھی رکھا ہے، لیکن یہ دراصل وہ جاسوس ہیں جو دوسرے ممالک کے اہم ترین راز معلوم کر کے ان کو امریکہ کے ہاتھ فروخت کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کام ہر ملک کرتا ہے اور امریکہ سب سے زیادہ کرتا ہے۔ لیکن جہاں تک سیاسی معاملات کا تعلق ہے، انہیں امریکہ اپنے تنخواہ دار ایجنٹون کے ذریعے پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچاتا بلکہ اس کا 'طریقہ واردات' کچھ اور ہوتا ہے۔ دراصل امریکہ کے لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ کسی ملک کے سیاسی لیڈروں اور اپنے نظریات کے لیے قربانی دینے والے دانشوروں کو خرید سکے خواہ وہ مخلص لبرل ہوں، سیکولرسٹ ہوں یا اسلامسٹ۔ کیونکہ ایسے سب لوگ اپنی جان ہتھیلی پر لے پھرتے ہیں۔ ان کو ہر وقت قید و بند اور جلاوطنی کا خطرہ ہوتا ہے، اور یہ لوگ اپنے ملک کو چھوڑ کر مغرب میں جا کر بس بھی نہیں سکتے۔ اس کے بالکل برعکس تنخواہ دار ایجنٹ کی سب سے زیادہ دلچسپی پیسے سے اور اچھی زندگی گزارنے سے ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ تیسری دنیا کے ملکوں کی زندگی تو اس مقصد کے لیے بالکل راس نہیں۔ اس غرض کے لیے تو یہ ضروری ہے کہ انسان جب تک تیسری دنیا کے کسی ملک میں رہے، تب بھی اچھی زندگی گزارے اور اس کے بعد جا کر مغرب میں کہیں بس جائے۔ یہی وجہ ہے کہ تنخوادار ایجنٹ صرف وہی لوگ بنتے ہیں جو بیوروکریسی، مسلح افواج اور صحافت میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ سیاسی جدوجہد کرنے والے سیاست دان اور دانش ور کبھی ایسا سوچ بھی نہیں سکتے اس لیے کہ اس سے ان کو کوئی فائدہ بھی نہیں ہوتا۔

تیسری دنیا کے ممالک میں امریکہ کا طریقہ واردات یہ ہوتا ہے کہ وہ ان ممالک کے اندرونی تضادات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہے۔ جن ممالک میں جمہوریت نہیں ہوتی وہاں یہ تضادات زیادہ ہوتے ہیں۔ اس لیے ایسے ممالک کے اندرونی معاملات میں امریکہ کو دخل اندازی کے زیادہ مواقع مل سکتے ہیں۔ ایسا نہیں ہوتا کہ کسی ملک کے اندر سارے سیاسی معاملات امریکہ سے پوچھ کر طے ہوتے ہیں۔ بلکہ ہوتا یوں ہے کہ جب ایک سیاسی معاملہ ہو چکتا ہے تو

Marfat.com

امریکہ یہ دیکھتا ہے کہ اب وہ اس معاملے سے کس طرح اپنے فائدے میں کوئی کام لے سکتا ہے۔ مثلاً جب اکتوبر 2000ء میں پاکستان میں نواز شریف کا تختہ الٹا جارہا تھا، تو اُس وقت یقیناً امریکہ کو اس کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا اور نہ ہی یہ سب کچھ امریکہ سے پوچھ کر ہو رہا تھا۔ البتہ جب ایک تبدیلی عمل میں آگئی تو امریکہ نے سوچا کہ اب اس تبدیلی سے کیسے فائدہ اٹھایا جائے۔ چنانچہ اس نے پاکستان کی فوجی حکومت سے اپنے حصے کا فائدہ اٹھالیا۔

امریکہ کو تیسری دنیا کے ڈکٹیٹر، بادشاہ اور فوجی حکمران بھی بہت راس آتے ہیں، اس لیے کہ ان سے معاملہ کرنا آسان ہوتا ہے۔ تاہم یہ کوئی مستقل قانون نہیں۔ کئی ڈکٹیٹر امریکہ کے مخالف بھی ہوتے ہیں۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ امریکہ ہر معاملے میں کامیاب ہو۔ مثلاً امریکہ کے بالکل قریب کیوبا میں فیڈرل کاسترو کی سربراہی میں کمیونسٹ حکومت قائم ہے۔ امریکہ نے اس حکومت کو ختم کرنے کے لیے بیسیوں بار کوشش کی ہے لیکن اس کی ہر کوشش ناکامی سے دوچار ہوئی ہے۔ اس کے بالکل برعکس بہت سے ممالک اپنے ہاں امریکہ کو ہر سہولت، حتیٰ کہ افواج تعینات کرنے کی سہولت بھی فراہم کر رہے ہیں اور یوں وہ امریکہ کے سایۂ عاطفت میں زندگی گزار رہے ہیں۔

امریکہ اور پاکستان

پاکستان ان چار ممالک میں شامل ہے جنہیں پچھلے برسوں میں سب سے زیادہ امریکی امداد ملی ہے۔ پاکستان کا ہر اہم پروجیکٹ براہِ راست یا بالواسطہ امریکی امداد یا قرضے کا مرہونِ منت ہے۔ پاکستان کو امریکہ کی طرف سے مہیا کردہ بہت سے قرضے صرف ایک فیصد برائے نام سود پر دیے گئے ہیں۔ اربوں ڈالر کی ناقابل واپسی امداد اس کے علاوہ ہے۔ اب بھی پاکستانی بجٹ کا اکثر و بیشتر حصہ بالواسطہ طور پر امریکی قرضے پر مشتمل ہوتا ہے کیونکہ یہ تمام قرضے ورلڈ بینک یا ایشین ڈیویلپمنٹ بینک کی طرف سے ہوتے ہیں۔ ان دونوں بینکوں میں سب سے بڑا حصہ امریکی حکومت کا ہے۔

Marfat.com

اس امریکی امداد کی اصل وجہ یہ ہے کہ پاکستان نے بالکل ابتداہی سے اپنے آپ کو امریکی کیمپ کا حصہ بنالیا تھا، جس کی بنیاد بھارت کی مخالفت پر تھی۔ بھارت کے پہلے وزیراعظم جواہر لعل نہرو ایک سوشلسٹ تھے اور انہوں نے پہلے دن سے ہی اپنے آپ کو روسی یا امریکی کیمپ سے منسلک کرنے کے بجائے غیر جانبدار ممالک کے گروپ کی بنیاد رکھی۔ تاہم اس گروپ کا جھکاؤ روس کی طرف تھا۔ چنانچہ جوں ہی پاکستان کے وزیراعظم نواب زادہ لیاقت علی خان کو امریکہ کا دورہ کرنے کی دعوت ملی، انہوں نے فوراً اس دعوت کو قبول کر کے پاکستان کو امریکی کیمپ میں داخل کردیا۔ اس کے بعد پاکستان امریکہ کے پروردہ بین الاقوامی اداروں سیٹو اور سینٹو کا ممبر بھی بن گیا۔ ان معاہدوں میں شمولیت سے پاکستان کو کشمیر کے معاملے میں ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا کیونکہ اس نے بھارت کو یہ جواز فراہم کردیا کہ وہ کشمیر پر اپنے وعدوں کو پسِ پشت ڈال دے۔

درحقیقت پاکستان نے ان معاہدوں سے اپنے حقیقی مفادات کے لیے کچھ حاصل نہیں کیا۔ ہمارا حقیقی مفاد یہ تھا کہ کشمیر کا مسئلہ حل ہو اور بھارت کے مقابلے میں ہمارا دفاع مضبوط ہو جائے۔ اس کے برعکس درج بالا معاہدے پاکستان کو صرف اشترا کی ممالک کی طرف سے حملے کی صورت میں دفاع کی ضمانت فراہم کرتے تھے۔ ان معاہدوں کے مطابق پاکستان پر یہ لازم تھا کہ پاکستان اس اسلحہ کو کسی غیر کمیونسٹ ملک کے خلاف استعمال نہیں کرے گا۔ یہی وجہ ہے کہ 1965ء کی جنگ میں جب پاکستان نے امریکی اسلحہ بھارت کے خلاف استعمال کرنا شروع کردیا تو امریکہ نے اس اسلحے کے فاضل پرزوں کی فراہمی پر پابندی لگادی۔

اہلِ پاکستان یہ شکایت کرتے ہیں کہ 1965ء کی جنگ میں امریکہ نے پاکستان کے لیے فاضل پرزوں کی فراہمی پر پابندی لگا کر ہمیں ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا، اس لیے کہ پاکستان کے پاس تو صرف امریکی اسلحہ ہی تھا۔ اسی طرح 1971ء کی جنگ میں امریکہ نے بنگلہ دیش کی تخلیق رکوانے کے لیے کوئی کردار ادا نہیں کیا۔ بالکل اسی طرح جب 1988 میں افغانستان سے روسی افواج چلی گئیں تو امریکہ نے بعد کے مسائل سے نمٹنے کے لیے پاکستان کو تنہا چھوڑ کر اس خطے

Marfat.com

میں اپنی دلچسپی ختم کر دی۔

ان شکایات کے مقابلے میں امریکہ نے ہمیشہ یہ کہا ہے کہ پاکستان برضا و رغبت اور اپنے فیصلے سے مغربی کیمپ کے قریب آیا تھا۔ ہم نے اسے خوش آمدید کہنے کے ساتھ ساتھ ہمیشہ اسے یہ بتایا ہے کہ بھارت بھی بہت بڑا اور اہم ملک ہے۔ امریکہ اور بھارت کے درمیان بہت سی اقدار اور روایات مشترک ہیں۔ اس لیے ہم بھارت سے بھی لازماً قریبی تعلقات رکھیں گے۔

اسی طرح امریکہ کا یہ بھی کہنا ہے کہ مسئلہ کشمیر کے ضمن میں ہم نے اقوام متحدہ میں ہمیشہ پاکستانی موقف کی حمایت کی ہے۔ ہمارے نزدیک یہ ایک متنازعہ علاقہ ہے جس کا آخری فیصلہ باہمی گفت و شنید اور کشمیریوں کی حق خود ارادیت ہی کے ذریعے سے ممکن ہے۔ تاہم یہ مسئلہ پرامن طریقے سے حل ہونا چاہیے۔ ہم نے ہمیشہ پاکستان سے کہا ہے کہ اس مسئلے پر پاک بھارت جنگ پاکستان کے مفاد میں نہیں ہوگی۔ پاکستان کو ہم نے تمام اسلحہ اس شرط کے ساتھ دیا تھا کہ اسے صرف کمیونسٹ خطرے کے خلاف دفاعی طور پر استعمال کیا جائے گا۔ جب ہمیں معلوم ہوا کہ 1965ء کی جنگ میں یہ اسلحہ بھارت کے خلاف استعمال کیا جا رہا ہے تو ہم نے اس اسلحے کے فاضل پرزوں کی فراہمی پر پابندی لگا دی۔ پاکستان نے یہ جنگ ہم سے پوچھ کر شروع نہیں کی تھی۔

امریکیوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ بنگلہ دیش کا قیام پاکستان کی اپنی غلطیوں، کوتاہیوں اور عدمِ جمہوریت کا نتیجہ تھا۔ مشرقی پاکستان کے 94 فیصد عوام اپنے لیے علیحدہ ملک چاہتے تھے۔ بحثیت ایک جمہوری ملک کے ہم اس سے کیسے نظریں چرا سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُس وقت سارے امریکی عوام اور امریکی حکومت بنگلہ دیش کے قیام کے حق میں تھی۔ البتہ جب ہمیں معلوم ہوا کہ بنگلہ دیش کے بعد اندرا گاندھی اب مغربی پاکستان کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کا فیصلہ کر چکی ہے تو ہمارے ہی دباؤ پر وہ اس ارادے سے باز آئی اور مغربی محاذ پر اُس نے جنگ بندی قبول کر لی۔

امریکی یہ بھی کہتے ہیں کہ ہم نے اس بات کو کبھی نہیں چھپایا کہ افغانستان میں ہماری

Marfat.com

دلچسپی صرف روسی افواج کے نکلنے تک محدود ہے۔ افغان مجاہد تنظیموں کو پاکستان نے ہی تخلیق کیا تھا اور یہ سب تنظیمیں پاکستان کے زیرِ اثر تھیں۔ پاکستان نے تو ہمیں یہ اجازت بھی کبھی نہیں دی کہ ہم ان تنظیموں سے براہِ راست بات کر سکیں۔ چنانچہ اگر روسی افواج کے نکلنے کے بعد یہ تنظیمیں چار برس تک ڈاکٹر نجیب اللہ کی حکومت کو ختم نہ کر سکیں تو اس میں ہمارا کیا قصور تھا؟۔ چار برس کے بعد یعنی کابل کی فتح کے بعد اگر یہ سب تنظیمیں آپس میں لڑنے لگیں اور پاکستان اور پاکستان کی مذہبی سیاسی پارٹیاں اس خانہ جنگی میں فریق بن گئیں تو اس میں امریکہ کا کوئی کردار نہیں تھا۔

اگر پاکستان اور امریکہ کے درمیان شکایات اور ان کے جواب کے درج بالا مکالمے کا تجزیہ کیا جائے تو صاف طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان نے ہمیشہ امریکہ سے وہ توقعات وابستہ کی ہیں جن کے پورا کرنے کا امریکہ نے کبھی کہا نہیں ہوتا۔ دراصل ہم پاکستانی ایک جذباتی قوم ہیں جو بین الاقوامی تعلقات میں ''کاروبار'' پر نہیں، بلکہ ''لوافیئر'' پر یقین رکھتے ہیں۔ جب کہ اس کے برعکس امریکہ کے نزدیک خارجہ تعلقات خالصتاً ایک کاروباری معاملہ ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ جن ملکوں کو اپنے اوپر یقین نہیں ہوتا، جو اپنے مسائل خود حل کرنے کے لیے پُرعزم نہیں ہوتے اور جو اپنے داخلی معاملات کو جمہوریت اور مکالمے کے ذریعے ٹھیک نہیں کرتے، ان ممالک کی ذہنیت فریادی اور احتجاجی بن جاتی ہے اور پھر وہ اپنے مسائل حل کرنے کے لیے اپنے آپ پر انحصار کرنے کے بجائے دوسروں سے گلے شکوے کرتے ہیں اور الزام لگاتے ہیں کہ دوسرے ہمارے خلاف سازشیں کر رہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک پاکستان میں حقیقی جمہوریت نہیں آئے گی اور ہم اپنے داخلی معاملات خود حل کرنے کے لیے عزم سے کام نہیں لیں گے تب تک امریکہ ہمارے معاملات میں خود ہماری کمزوریوں کی وجہ سے دخیل رہے گا۔

کیا پاکستان کو امریکہ سے دوستی رکھنی چاہیے یا دشمنی کرنی چاہیے؟

درج بالا بحث سے یہ بات بخوبی واضح ہوتی ہے کہ امریکہ صرف اپنے مفاد کا دوست ہے۔ اپنے مفادات کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ اس ضمن میں ہر طرح کی منافقت، دوغلا پن

Marfat.com

اور دہرا معیار اُس کے نزدیک جائز ہے۔صرف اُسی ملک کو وہ اپنا دوست بناتا ہے جو اپنے آپ کو اُس کی تہذیب کے رنگ میں رنگنے اور خارجہ پالیسی میں اُس کی ہر ہاں میں ہاں ملانے کے لیے تیار ہو۔اسرائیل اور کسی حد تک بھارت اس کی مثال ہیں۔ چنانچہ یہ ناممکن ہے کہ امریکہ پاکستان کو اپنا دوست سمجھے اور ایک دوست کی حیثیت سے اس کا خیال رکھے۔

تاہم کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم امریکہ سے دشمنی کریں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ امریکہ کی دوستی بھی خطرناک ہے اور اُس کی دشمنی بھی خطرناک ہے۔اُس کی دشمنی نہ پاکستان کے مفاد میں ہے اور نہ امتِ مسلمہ کے مفاد میں ہے کیونکہ وہ ہمارے لیے نا قابلِ بیان مشکلات پیدا کرسکتا ہے۔ چنانچہ مناسب پالیسی یہ ہے کہ امریکہ سے صرف تعلق کار Working Relation رکھا جائے۔اُس سے نہ دوستی رکھی جائے اور نہ دشمنی۔

امریکہ کی ''دہشت گردی'' کے خلاف جنگ اس موضوع پر ایک علیحدہ باب میں روشنی ڈالی جائے گی۔

(اس باب کی تیاری میں درج ذیل کتب سے مدد لی گئی ہے

O۔کولیئرز انسائیکلوپیڈیا

O۔تاریخِ امریکہ از فرانس واٹنے۔مترجم محمد افضل محمود

O۔تہذیبوں کا تصادم از سیموئل پی ہنٹگٹن

O۔امریکہ میں یہودی تنظیمیں از لی او برائن۔مترجم نذیر حق)

Marfat.com

چھٹا باب

امت مسلمہ کے لیے فوری ایجنڈا

سابقہ ابواب میں کیے گئے تجزیے کے مطابق اب ہمارے لیے یہ ممکن ہے کہ ہم یہ اندازہ لگائیں کہ امت مسلمہ کی نشاۃ ثانیہ یعنی ایک نئی باوقار زندگی کے لیے کن باتوں پر عمل ضروری ہے۔ اگر اس کو مختصر انداز میں بیان کیا جائے تو دنیوی کامیابی کے لیے درج ذیل چار نکاتی لائحہ عمل ضروری ہے۔ وہ نکات یہ ہیں:

- سائنس اور ٹیکنالوجی
- جمہوری کلچر
- انصاف
- حکمت وصبر، یعنی جذباتی ردِعمل سے پرہیز کر کے مقابل طاقتوں سے امن کا وقفہ حاصل کرنا

اب ان چار نکات کی تھوڑی سی تفصیل

سابقہ تجزیے سے یہ معلوم ہوا ہے کہ اس دنیا میں عزت ووقار کے ساتھ جینے کے لیے سائنس اور ٹیکنالوجی پر دسترس ایک بنیادی شرط ہے۔ اس کے بغیر دنیا میں عزت ووقار کے ساتھ جینے کا خواب دیکھنا فضول ہے۔ یہی کامیابی کا راستہ ہے، یہی طاقت وقوت ہے اور یہی دولت ہے۔ اس کے سامنے باقی تمام سرمایہ ہیچ ہے۔ مثلاً عالم اسلام کے تمام ممالک بشمول تیل پیدا کرنے والے ممالک کی مجموعی آمدنی صرف ایک عام سے یورپی ملک اسپین کی آمدنی سے بھی کم ہے۔ سائنس پر صرف وہی قوم دسترس حاصل کر سکتی ہے جو یہ تہیہ کر لے کہ اُسے اپنے سب بچوں کو پہلے بارہ برس مفت اور لازمی تعلیم دینی ہے۔ ایسا ہو جائے تو پھر یہ بچے فطرت کے خودکار نظام کے تحت زندگی کے مختلف شعبوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ یہی لوگ آگے بڑھ کر ملک کو سیاسی قیادت

Marfat.com

فراہم کرتے ہیں، فنونِ لطیفہ اور ادب کے میدان میں نام پیدا کرتے ہیں، ڈاکٹر اور انجنیر بنتے ہیں، اور انہی میں سے بہت سے لوگ سائنس کی تحقیق کو بھی اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیتے ہیں۔ جب تک ملک کے سو فیصد بچوں کو ابتدائی بارہ برس کی یکساں، مفت اور لازمی تعلیم کی دولت سے مالا مال نہ کیا جائے، تب تک دوسرا مرحلہ نہیں آسکتا۔

یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا مقابل قوتیں ہمیں سائنسی علوم پر دسترس حاصل کرنے دیں گی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر ہم ان علوم کو حاصل کرنے کا تہیہ کرلیں تو کوئی بھی ملک ہمارے اس عزم میں رکاوٹ نہیں بن سکتا۔ آج ٹیکنالوجی کا حصول جتنا آسان ہے، اُتنا کبھی نہ تھا۔ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کی ایجاد نے ٹیکنالوجی کے حصول میں موجود اکثر رکاوٹیں قابل عبور بنا دی ہیں۔ تاہم یہ کوئی قلیل المیعاد کام نہیں ہے۔ جب ملکی توانائیوں کا پورا رُخ اس طرف پھیر دیا جائے تب کہیں جا کر چند دہائیوں میں اوسط درجے کی ترقی تک پہنچا جاسکتا ہے۔ اور اس کے بھی مزید چند دہائیوں کے بعد ترقی یافتہ ممالک کے ہم پلہ آنے کے بارے میں سوچا جاسکتا ہے۔ تاہم جب ہم ایک دفعہ اوسط درجے تک بھی پہنچ جائیں تو ہمارے عزت و وقار کا سفر شروع ہو جائے گا اور مقابل طاقتوں کے لیے ہمارا استحصال آسان نہیں رہے گا۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ تمام مسلم ممالک اپنے ہاں کامل جمہوری کلچر کو بطورِ اصول و قدر اختیار کرلیں۔ جمہوریت کے بغیر عوام عملاً غلام رہتے ہیں۔ جمہوریت ہی کے ذریعے سے صحت مند مسابقت کا ذہن فروغ پاتا ہے جس سے ترقی کا راستہ کھل سکتا ہے۔ جمہوریت ہی کے ذریعے سے عوام کو اعتماد ملتا ہے اور اپنے ملک کے نظام کے ساتھ عوام کی محبت پروان چڑھتی ہے۔ درحقیقت جمہوریت امت مسلمہ کے اتحاد کی منزل کی طرف جانے والی پہلی سیڑھی ہے۔ مسلمان ممالک بھی صرف اُس وقت ایک دوسرے کے قریب آسکتے ہیں اور اُن کا تعاون عملی حقیقت میں بدل سکتا ہے جب ان سب کے ہاں جمہوری کلچر وجود میں آجائے۔ ہم سب کی یہ دلی تمنا ہے کہ عالم اسلام کو متحد ہو جانا چاہیے۔ تاہم اس امر کی طرف ہماری نگاہ نہیں جاتی کہ اس کے لیے اولین شرط یہ ہے کہ

Marfat.com

سب مسلمان ممالک جمہوریت پر کاربند ہو جائیں۔ آج کے حالات میں اس شرط کو پورا کیے بغیر ایک حد سے زیادہ تعاون پر کاربند ہونا ممکن نہیں ہے۔ درحقیقت مسلمان ممالک میں جمہوریت کا فقدان ہی او آئی سی کی کمزوری کی اصل وجہ ہے۔ اس کو ایک اور مثال کے ذریعے یوں واضح کیا جاسکتا ہے کہ آج سب یورپی اقوام نے ''یورپین یونین'' بنا کر اپنے درمیان سرحدوں کو تقریباً ختم کر دیا ہے اور یہ سب ممالک ایک دوسرے کے بے حد قریب آگئے ہیں۔ اس کی اصل وجہ ان سب ملکوں کے سیاسی نظام کے اندر کارفرما جمہوری کلچر کی قدر (Value) ہے۔ اگر یہ سب ممالک جمہوری اقدار پر کاربند نہ ہوتے تو یہ کبھی ایک دوسرے کے قریب نہ آسکتے۔ دنیا کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ ممالک کی تنظیم یعنی جی ایٹ کی مضبوطی کا اصل راز بھی یہی ہے۔ چونکہ ان سب ممالک میں جمہوری کلچر موجود ہے اور یہی ان کے درمیان قدرِ مشترک ہے، اسی لیے ان کے لیے آپس میں مل بیٹھ کر مکالمہ کرنے اور متفقہ فیصلے کرنے میں بہت کم رکاوٹیں پیش آتی ہیں۔ اس کے بالکل برعکس جب او آئی سی کے اجلاس میں بادشاہ، امراء، فوجی ڈکٹیٹر اور نیم جمہوری حکمران اکٹھے بیٹھے ہوتے ہیں تو ان کے درمیان عملی اعتبار سے کوئی سیاسی قدرِ مشترک موجود نہیں ہوتی۔ چنانچہ اول تو یہ لوگ کوئی بامقصد فیصلہ کر ہی نہیں سکتے اور کرتے ہیں تو اُس پر عمل درآمد ان کے لیے ناممکن ہوتا ہے۔

تیسرا نکتہ عوام کو انصاف کی فراہمی ہے۔ انصاف کا مطلب یہ ہے کہ قانون کے سامنے سب شہری برابر ہوں۔ حکمران اور ایک عام انسان کے لیے ایک ہی قانون ہو۔ ہر معاملہ شفاف ہو اور ہر کسی کے لیے، خصوصاً حکمرانوں اور طاقت ور لوگوں کے لیے احتساب کا نظام موجود ہو۔ بعض مسلمان ممالک میں صورت حال نسبتاً بہتر ہے۔ لیکن اکثر مسلمان ملکوں، خصوصاً پاکستان میں، حصول انصاف ناممکن حد تک مشکل ہے۔ اس ملک میں ہر عدالت کے باہر سینکڑوں لوگوں کی ایک بھیڑ لگی ہوتی ہیں۔ ہر عدالت میں کیسوں کا ایک انبار لگا ہوتا ہے۔ اگر کسی کیس کا فیصلہ تین چار برس میں ہو جائے تو یہ ایک خوش قسمتی کی بات تصور کی جاتی ہے۔ ایسے بھی کیس ہیں جن میں فیصلوں کی

Marfat.com

نوبت دس سال میں بھی نہیں آتی۔اس دوران میں ایک کیس سے کئی کیس بن جاتے ہیں۔لوگ عدالتوں سے مایوس ہوکر اپنا بدلہ خود لینے کی ٹھان لیتے ہیں۔ ہر جج کے سامنے سماعت کے لیے سینکڑوں کیس ہوتے ہیں۔ ہر ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے سامنے سماعت کے لیے ہزاروں کیس موجود ہوتے ہیں۔کیسز کا یہ انبار سال کے سال بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔اس ملک میں عدالت کے ذریعے انصاف حاصل کرنے کی توقع عام طور پر محض ایک خواب ہی ہوتی ہے۔جس ملک میں ایک عام آدمی کو انصاف نہ ملے یا اُسے بہت تاخیر کے ساتھ انصاف ملے، ایسے ملک کو کسی بھی معیار کی رو سے ایک مہذب ملک قرار نہیں دیا جاسکتا۔آج سے سترہ برس بیشتر 1991ء میں اس راقم نے اپنی کتاب "پاکستان اور اکیسویں صدی" میں صفحہ 134 تا 140 اور 426 تا 436 میں پاکستان کے عدالتی نظام پر بحث کی تھی۔سترہ برس گزرنے کے بعد بھی وہ ساری بحث اُسی طرح تازہ ہے جس طرح وہ اُس وقت تھی۔ایک جائزے کے مطابق ہمارے ملک میں سرزد ہونے والے جرائم میں سے صرف تین فیصد مجرموں کو کوئی سزا مل جاتی ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ ہمارے مرکزی اور صوبائی بجٹ کا ایک فیصد حصہ بھی ایک عام آدمی کو انصاف کی فراہمی کے لیے مختص نہیں کیا جاتا۔اگرچہ ہمارا سارا عدالتی نظام اصلاح کا محتاج ہے، لیکن باقی اگر کوئی اصلاح نہ کی جائے اور صرف یہی ایک اصلاح کی جائے کہ ہر لیول پر ججوں کی تعداد چار گنا بڑھادی جائے تو اس سے ایک عام انسان کو انصاف کی فراہمی میں بڑی مدد مل جائے گی۔اس اصلاح پر بجٹ کا ایک فیصد حصہ بھی نہیں لگے گا لیکن فی الوقت حکمران اس کے لیے بھی تیار نہیں ہیں۔اس لیے کہ یہ اُن کی ترجیحات میں کوئی نمایاں مقام نہیں رکھتا۔

یہ جو پاکستان کے اندر ہر طرف بدامنی ہے، ہر انسان قانون کو ہاتھ میں لینے کے لیے تیار ہوتا ہے، لاقانونیت کا دور دورہ ہے، ہر انسان کے خیال میں قانون بندوق کی نالی سے جنم لیتا ہے، لوگوں کے جذبات ہر وقت اشتعال اور ہیجان میں مبتلا رہتے ہیں اور ہر فرد ہر وقت لڑنے مارنے کے لیے تیار ہوتا ہے، اس کی اصل وجہ انصاف کی عدم فراہمی ہے۔انصاف کی فراہمی سے

Marfat.com

ایک عام انسان سکھ کا سانس لیتا ہے اور پر امن ماحول میں ہر مثبت سرگرمی زور پکڑتی ہے۔ ملک میں معاشی سرگرمیاں بڑھ جاتی ہیں اور یوں بلحاظ مجموعی ملک ترقی کی طرف گامزن ہو جاتا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس سے ملک کے اندر اعتماد اور اتحاد کی فضا جنم لیتی ہے۔ جب دوسری جنگ عظیم کے دوران میں برطانیہ ایک انتہائی نازک صورت حال سے دوچار تھا تو چرچل نے پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ جب تک برطانیہ کی عدالتیں عام انسان کو پوری جاں فشانی کے ساتھ انصاف فراہم کر رہی ہیں، اُس وقت تک برطانیہ کی اس جنگ میں شکست کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چرچل جیسے عظیم مدبر کی یہ بات سو فیصد صحیح تھی۔ چنانچہ امت مسلمہ کے حوالے سے یہ بھی ہماری ایک بڑی ترجیح ہونی چاہیے کہ عام انسان کو جلد، فوری اور سستا انصاف فراہم کیا جائے۔

چوتھا نکتہ حکمت وصبر ہے، یعنی ہر اہم فیصلہ کرتے وقت جذباتی ردِعمل سے مکمل پرہیز اور پیش آمدہ حالات کا بالکل معروضی (Objective) انداز میں تجزیہ کر کے بہترین لائحہ عمل بنانا۔ قرآن مجید میں صبر و حکمت کی تعلیم ایک سو دس مرتبہ سے زیادہ آئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید اس ذہنی روئے کو ہمارے دل و دماغ کے اندر پوری طرح سمونا چاہتا ہے، تاکہ زندگی کے ہر ہر مرحلے میں ہم صبر و حکمت کے ساتھ جینا سیکھیں۔

صبر دراصل ایک ذہنیت کا نام ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ جب حالات ناسازگار ہوں، مشکلات زیادہ ہوں اور ہر طرف سے خطرے امڈے چلے آرہے ہوں تو ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ حال اور مستقبل کے لیے منصوبہ بندی اور تیاری کی جائے۔ اگر تیاری کے مرحلے میں انتظار کی ضرورت ہو تو انتظار کیا جائے اور اشتعال، فوری ردِعمل اور ہیجان انگیز اقدامات سے گریز کیا جائے۔ پوری پوری دنیوی تدبیر کی جائے۔ یہ طرزِ عمل اختیار کیا جائے کہ ہمارا کام یہ ہے کہ ہم بہترین دنیوی حکمت عملی بنا کر اس کے مطابق کام کریں، اللہ سب کچھ دیکھ رہا ہے اور جب اس کی طرف سے منظوری آئے گی تو حالات بدل جائیں گے۔ ہمارا اصل کام بہترین حکمت عملی کے

Marfat.com

ساتھ تیاری اور ثابت قدمی ہے۔ گویا بہترین تدبیر ہمارا کام ہے اور نتیجے کا فیصلہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

صبر و حکمت کا مطلب یہ بھی ہے کہ جذباتی نعرے نہ لگائے جائیں، جذباتی تقریریں نہ کی جائیں، مقابل قوتوں کو بلا ضرورت نہ للکارا جائے اور بغیر سوچے سمجھے اقدامات نہ اٹھائے جائیں۔ ہر مثبت بات کی جائے اور منفی بات سے حتی الوسع پرہیز کیا جائے۔ ہر احتجاج اور ردعمل قانون اور مسلمہ اخلاقیات کے تحت ہو۔ دراصل جذباتی اور بلند بانگ نعرے اور دعوے ایک انتہا پسندانہ ردعمل کی ذہنیت کو جنم دیتے ہیں۔ جس میں انسان بے سوچے سمجھے مرنے مارنے پر اُتر آتا ہے۔ ایسی کیفیت میں کیے گئے تمام جذباتی فیصلے نیم پختہ اور غلط ہوتے ہیں۔ جس کا نتیجہ خود ہمارے لیے زہرِ قاتل ہوتا ہے۔ پچھلے تین سو برس سے ہم سے ایسے ہی غلط فیصلے سرزد ہو رہے ہیں۔ اب اس ذہنیت سے پرہیز ہمارے مستقبل کی کامیابی کے لیے ایک اہم شرط ہے۔ اقبال نے کیا خوب کہا تھا:

کہہ رہا ہے جوش دریا سے سمندر کا سکوت
جس کا جتنا ظرف ہے، اتنا ہی وہ خاموش ہے

اس نکتے کی ایک ضمنی شق یہ بھی ہے کہ <u>ہم مقابل طاقتوں سے امن کا وقفہ خرید لیں۔</u> اس سے مراد یہ ہے کہ اس وقت جہاں جہاں مسلمان اور غیر مسلم ممالک کے درمیان مسلح تنازعات درپیش ہیں، ان کے بارے میں ہم یک طرفہ فیصلہ کرلیں کہ ہم اس کے حل میں اپنی طرف سے طاقت استعمال نہیں کریں گے، ہم مکالمے کے ذریعے سے سمجھوتے کی طرف پیش رفت کی کوشش کریں گے اور اگر سمجھوتا نہیں ہوتا تب بھی کسی بھی حالت میں مسلح کارروائی کی طرف قدم نہیں اٹھائیں گے۔ کسی بھی سمجھوتے کے لیے ہم "منصفانہ" کی شرط عائد نہیں کریں گے، بلکہ کچھ لو اور کچھ دو کی بنیاد پر عملی حل کی طرف بڑھیں گے۔

Marfat.com

اس نکتے کی بنیاد یہ ہے کہ اس وقت ہم کمزور اور ہماری مقابل قوتیں توانا اور مضبوط ہیں۔ قبل از وقت میدان جنگ میں کود پڑنا خود اپنے ہاتھوں سے ایک اور شکست کو تحریر کرنا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ درحقیقت مسلمانوں کو درپیش ہر مسئلے کا ایک ایسا ممکن عملی حل موجود ہے، جس پر عمل پیرا ہونے سے معاملات سدھر سکتے ہیں۔ فی الوقت ہمارے سامنے پانچ مسائل ہیں۔ یعنی کشمیر، فلسطین، عراق، افغانستان اور وہ مقامات جہاں مسلمان اقلیتیں جنگِ آزادی لڑ رہی ہیں۔ ان تمام مسائل کا پرامن حل ممکن ہے۔ اس نکتے پر ہم بعد میں روشنی ڈالیں گے۔

مسلمان ممالک کو ایک دفعہ امن کا وقفہ میسر آ جائے تو وہ اگلے پچاس برس کے اندر اندر ترقی یافتہ ممالک کے ہم پلہ بن سکتے ہیں، اپنے معاشروں کی تعمیر کر سکتے ہیں اور خوش حالی کی نئی منزلوں کی طرف پیش قدمی کر سکتے ہیں۔ واضح رہے کہ یہ ایک ایسی حکمت عملی ہے جس پر دنیا کی ہر ہوش مند قوم عمل کرتی ہے۔ خود مغرب نے اپنے زریں دور میں اس پر عمل کیا ہے۔ مثلاً پرتگیزی نو آبادی ایسٹ تیمور جو عیسائی اکثریت پر مشتمل تھا، نے 1974ء میں آزادی کا اعلان کیا۔ بعد ازاں اس پر انڈونیشیا نے قبضہ کر لیا۔ اگرچہ اُسی وقت اقوام متحدہ نے ایسٹ تیمور کی آزادی کے حق میں قرارداد بھی منظور کر لی، تاہم انڈونیشیا کی طاقت کے سبب اس کے خلاف کوئی عملی کارروائی نہیں کی گئی۔ چھبیس برس بعد جب انڈونیشیا ایک بڑے داخلی بحران سے دوچار ہوا تو ایسٹ تیمور کی آزادی کا راستہ خود بخود نکل آیا اور مغرب نے اس کے لیے اقوام متحدہ کے تحت تمام انتظامات کیے۔

درج بالا چار نکتے کہنے میں تو بہت آسان ہیں لیکن ان پر عمل درآمد ایک عزمِ صمیم اور اپنے ذاتی مفادات کی بہت بڑی قربانی چاہتا ہے۔ تاہم حقیقت یہی ہے کہ امتِ مسلمہ کے مسائل کے حل کی اصل کنجی یہی ہے۔ ہم مسلمانوں کی موجودہ ذہنیت کا ایک رُخ یہ بھی ہے کہ ہم فوری نتائج چاہتے ہیں اور ہماری خواہش یہ ہوتی ہے کہ پردۂ غیب سے ایسا کچھ کام ہو جائے جس کے ذریعے ہم دنیا کی سب سے برتر قوم بن جائیں۔ عمل کی دنیا میں یہ ممکن نہیں۔ عمل کی دنیا کا طریقہ یہ ہے کہ

Marfat.com

ایک مستقل عزم کے ساتھ اپنے جذبات اور مفادات کی قربانی دی جائے۔اس کے بعد کہیں جا کر اس کا پھل ملے گا۔پشتو زبان کی ایک کہاوت ہے:

چہ اول اوخورے دزان غوخے
نو بیا بہ خورے دخکار غوخے

ترجمہ: (جب تم اپنے بدن کا گوشت گھلا دو گے، تو تب کہیں جا کر تم شکار کا گوشت کھانے کے قابل ہوسکو گے)

پشتو زبان کی ایک اور کہاوت ہے:

چہ سل کالہ پس دے بدل واغستہ
نو بیا دے ھم زر واغستہ

ترجمہ: (اگر تم نے سو سال بعد بھی اپنی بے عزتی کا بدلہ لے لیا تو یہ سمجھو کہ تم نے یہ بہت جلدی لیا۔)

اس کا مطلب یہ ہے کہ تیاری میں چاہے جتنا وقت گزر جائے، لیکن پوری تیاری کے بغیر کبھی کوئی اقدام نہیں کرنا چاہیے۔

Marfat.com

ساتواں باب

پاکستان کے لیے فوری ایجنڈا

پچھلے باب میں ہم نے پوری امت مسلمہ کے لیے چار نکات پر مشتمل ایجنڈے کی تجویز دی تھی۔ یہ چاروں نکات پاکستان کے معاملے میں بھی اسی طرح ضروری ہیں جس طرح یہ باقی عالم اسلام کے لیے ہیں۔ یہ نکات سائنس اور ٹیکنالوجی کے علم، جمہوریت، انصاف اور حکمت وصبر پر مشتمل تھے۔ پاکستان کے تناظر میں ان چاروں نکات کے عملی انطباق کا مطلب یہ ہوگا کہ پاکستان کے اندر ہر بچے کے پہلے بارہ برس کی تعلیم مفت، لازمی اور یکساں کر دی جائے۔ ملک کے اندر سیاست سے فوج کا عمل دخل مکمل طور پر ختم کر دیا جائے، باقاعدگی سے انتخابات ہوں، ملک کے اندر اہل اقتدار کے احتساب کا ایک آئینی اور خودمختار ادارہ قائم ہو، پریس اور میڈیا آزاد ہو، نہ تو کوئی وزیراعظم ڈکٹیٹر بننے کی کوشش کرے اور نہ حزب اختلاف احتجاجی اور تحریکوں کی سیاست کے ذریعے ایک منتخب حکومت کو وقت سے پہلے گرانے کی کوشش کرے۔ اسی طرح عدالتیں لوگوں کو جلد اور سستا انصاف فراہم کریں۔ پاکستان کے تناظر میں حکمت وصبر کا یہ مطلب ہے کہ اہل سیاست، اور اہل علم ودانشور وقتی اور جذباتی نعرے لگانے کے بجائے ملک کے مسائل پر سنجیدہ غور وفکر کریں اور ملک کے اندر مکالمے کا عمل مسلسل جاری رہے۔ اس کا یہ بھی مطلب ہے کہ افغانستان اور کشمیر کے حل کے معاملے میں بھی ہمیں پوری دانائی اور ہوش مندی سے کام لینا چاہیے۔ پاکستان کے خصوصی حالات کے اعتبار سے ہمارے لیے درج بالا چار نکات کے علاوہ مزید دو نکات بھی ضروری ہیں۔ گویا پاکستان کے لیے خصوصی ایجنڈا درج ذیل ہے۔

- افغانستان اور مسئلہ کشمیر کا حقیقت پسندانہ حل اور اس پر عمل درآمد
- مکمل صوبائی خودمختاری

درج بالا دونوں نکات کے ضمن میں مسئلہ افغانستان اور مسئلہ کشمیر پر علیحدہ ابواب میں

Marfat.com

تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی جائے گی۔ یہاں صرف اتنا کہنا ضروری ہے کہ افغانستان کے معاملے میں ہمارا یہ فرض بنتا ہے کہ وفاق اور صوبہ سرحد کے زیرِ انتظام قبائلی علاقوں کو فوراً صوبہ سرحد میں ضم کر دیا جائے، وہاں سب لوگوں کو، باقی پاکستان کی مانند آنے جانے کی مکمل آزادی ہو، پارٹی بنیاد پر قومی وصوبائی انتخابات کرائے جائیں اور بلدیاتی انتخابات کا انعقاد کر دیا جائے۔ افغانستان کے ضمن میں ہمارا اصل الاصول یہ ہونا چاہیے کہ افغانستان کو ہم ایک کامل جمہوری اور خودمختار ملک دیکھنا چاہتے ہیں جہاں سے تمام غیر ملکی افواج بشمول امریکہ اور القاعدہ کو نکل جانا چاہیے۔ ہمارا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ افغانستان کے اندر خونریزی بند ہو جائے اور سب مکاتیب فکر، بشمول طالبان اپنے آپ کو سیاسی پارٹیوں کی شکل میں ڈھال کر انتخابی عمل میں شریک ہو جائیں۔

مسئلہ کشمیر کے ضمن میں اس راقم کی یہ دیرینہ رائے ہے کہ اس ضمن میں حقیقتاً صرف ایک ہی حل ممکن ہے۔ وہ یہ کہ آزاد اور مقبوضہ کشمیر کے درمیان سرحد کو کچھ ردوبدل کے ساتھ بین الاقوامی مگر کھلی سرحد مان لیا جائے اور بھارت کی طرف سے وادیٔ کشمیر کو آخری حد تک ہر ممکن صوبائی خودمختاری دے دی جائے۔ اس راقم نے اس ضمن میں 68 صفحات پر مشتمل ایک مقالے ''مسئلہ کشمیر، پس منظر، موجودہ صورت حال اور حل'' میں تفصیل کے ساتھ اس پر لکھا ہے۔ اس مقالے کا خلاصہ ایک علیحدہ باب کی شکل میں اس کتاب میں شامل کیا جا رہا ہے۔ راقم کے خیال میں یہی دونوں ملکوں کے لیے آبرومندانہ اور حقیقت پسندانہ حل ہے اور اسی میں بھارتی کشمیر میں موجودہ چھ ملین مسلمانوں کا مفاد ہے۔ اسی کے ساتھ ہمارے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم پاکستانی کشمیر بشمول شمالی علاقہ جات کو ایک علیحدہ صوبے کی حیثیت سے پاکستان کے اندر ضم کر لیں۔

پاکستان کا دوسرا اہم ترین مسئلہ صوبائی خودمختاری ہے۔ پاکستان واضح طور پر چار بڑے ثقافتی اور معاشرتی خطوں پر مشتمل ہے۔ پختونوں، بلوچوں، پنجابیوں اور سندھیوں کے درمیان فرق وامتیاز سے سبھی واقف ہیں۔ صوبوں کی موجودہ حد بندی واضح طور پر اس تقسیم کو پورا نہیں کرتی۔ یہ بہت مناسب ہوتا کہ ایک ایسا صوبہ وجود میں آتا جس میں پشتو بولنے والے سبھی علاقے

Marfat.com

شامل ہوتے، اسی طرح سرائیکی لوگوں کے لیے بھی ایک علیحدہ صوبہ ہونا چاہیے تھا۔ تاہم چونکہ 1973ء کے متفقہ آئین میں صوبوں کی موجودہ حد بندی کو تسلیم کیا گیا ہے اس لیے جب تک صوبوں کی حدود میں ردوبدل کے متعلق کسی خاص حل پر اتفاق رائے نہ ہو جائے، تب تک موجودہ سرحدوں ہی کی بنیاد پر صوبائی خودمختاری دے دینی چاہیے۔ اب یہ جمہوری کلچر کا مسلمہ اصول بن گیا ہے کہ کسی فیڈریشن کے اندر موجود سب صوبوں کو ہر ممکن حد تک خودمختاری دے دی جائے۔ درحقیقت یہی خودمختاری ایک ملک کی بقا اور اتحاد کی ضامن ہوتی ہے کیونکہ اس سے لوگوں کے اندر ایک دوسرے کے خلاف نفرت اور احساس محرومی کے جذبات پروان نہیں چڑھتے۔ صوبائی خودمختاری کے نتیجے میں سب اکائیوں کو یہ اعتماد ہوتا ہے کہ ہمارے ساتھ بے انصافی نہیں کی جارہی۔ دنیا کے بہت سے ترقی یافتہ ممالک میں تو صوبائی اکائیوں کو اس بات کی بھی اجازت ہے کہ وہ جب چاہیں فیڈریشن کو چھوڑ کر اپنے آپ کو ایک آزاد ملک قرار دے سکتے ہیں۔ برطانیہ، کینیڈا اور امریکہ کے آئینوں میں سب صوبوں کا یہ حق تسلیم کیا گیا ہے۔ اسی لیے کینیڈا کے فرنچ بولنے والے اکثریتی صوبے کیوبک میں کینیڈا سے علیحدگی کے لیے کئی مرتبہ ووٹنگ ہو چکی ہے۔ اسی طرح برطانیہ میں سکاٹ لینڈ کے صوبے میں بھی اس غرض کے لیے ریفرنڈم منعقد ہو چکے ہیں، تاہم سکاٹش باشندوں نے ایک حد تک ہی کامل خودمختاری کے حق میں حق رائے دی ہے۔ مثلاً سکاٹ لینڈ کا ایک الگ جھنڈا ہے اور وہاں کی کرکٹ ٹیم بھی برطانیہ سے علیحدہ ہے۔ جو بھی ملک اپنے آئین میں صوبوں کو علیحدگی کا حق دیتا ہے، وہ درحقیقت اپنے فیڈرل سسٹم پر بہت بڑا اعتماد رکھتا ہے، کیونکہ اُسے یقین ہوتا ہے کہ کسی بھی صوبے کے عوام علیحدگی کے حق میں اکثریتی رائے نہیں دیں گے۔ پاکستان کے حالات میں ہم جانتے ہیں کہ چاروں صوبوں کے درمیان ایک دوسرے کے متعلق گہری جڑیں رکھنے والی غلط فہمیاں اور شکایتیں موجود ہیں۔ خصوصاً تینوں چھوٹے صوبے پنجاب سے بہت سی شکایتیں رکھتے ہیں۔ ممکن ہے کہ ان میں سے بعض شکایتوں میں کچھ مبالغہ بھی ہو، لیکن ان میں بہت سی شکایتیں حقیقت پر مبنی ہیں۔ بدقسمتی سے پاکستان کے

Marfat.com

اندراس کے قائم ہونے کے پہلے دن سے ہی صوبائی خودمختاری پر کاری ضرب لگائی گئی۔ پاکستان کے بنتے وقت ہمیں انگریزوں کے زمانے کا 1935ء کا عبوری آئین ورثے میں ملا تھا۔ پاکستان بننے کے دو تین مہینے کے اندر اندر اس آئینی دستاویز میں چار بنیادی تبدیلیاں کی گئیں۔ یہ چاروں تبدیلیاں صوبائی خودمختاری سے متعلق تھیں۔ انگریزوں کے زمانے کے عبوری آئین میں صوبوں کو جتنی خودمختاری دی گئی تھی، اُس کو بیک جنبش قلم ختم کر دیا گیا اور یوں صوبائی خودمختاری کا راستہ بند کر دیا گیا۔ اس کے بعد کی پاکستان کی تاریخ صوبائی خودمختاری کے خلاف مسلسل غیر جمہوری اقدامات پر مشتمل ہے۔ پاکستان بنتے ساتھ ہی جاگیرداروں اور بیوروکریٹس کا جوٹولہ اس ملک پر مسلط ہوگیا، یہ اُس کے مفاد میں تھا کہ پاکستان کے سارے وسائل پر اُس کا قبضہ رہے۔ اکتوبر 1954ء میں جب اُس وقت کے کمانڈر انچیف جنرل ایوب خان کو کابینہ میں وزیر دفاع بنایا گیا تو یہ تیسرا طبقہ بھی بالادست طبقات کی فہرست میں شامل ہوگیا۔ ان تینوں طبقات کا مشترکہ وقتی مفاد اس بات پر پوشیدہ تھا کہ پاکستان ہر اعتبار سے غیر جمہوری رہے اور یہاں انہی طبقات کی حکومت رہے۔ چنانچہ ان تینوں طبقات نے بلحاظ مجموعی صوبائی خودمختاری کے خلاف اکا کر لیا۔ چونکہ پنجاب کی آبادی پاکستان کی آبادی کا 62% ہے، اس لیے قدرتی طور پر ان تینوں بالادست طبقات میں بھی اس کا حصہ سب سے زیادہ تھا۔ اسی طرح قیام پاکستان کے وقت اردو بولنے والے مہاجروں میں تعلیم کی شرح سب سے بلند تھی، اس لیے بیوروکریسی میں اُس کا غلبہ تھا۔ چنانچہ ان تینوں طبقات کے ساتھ ساتھ نفرت کی یہ لہر پنجاب اور اُردو بولنے والے مہاجروں کے خلاف بھی مُڑ گئی۔ یہی سلسلہ 1970 تک جاری رہا۔ دسمبر 1970ء کے انتخابات میں مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کو اس کے صوبائی خودمختاری پر مشتمل چھ نکاتی پیکج کے ذریعے ایک عظیم کامیابی ملی اور 94% ووٹروں نے عوامی لیگ کے حق میں اپنا ووٹ ڈالا۔ اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ مشرقی پاکستان کے عوام نے بالادست طبقات کو یہ پیغام دیا کہ یا تو ہمیں مکمل صوبائی خودمختاری دے دی جائے ورنہ ہم پاکستان سے علیحدہ ہو جائیں گے۔ چونکہ بالادست طبقات کو یہ منظور نہیں

Marfat.com

تھا، اس لیے اگلے ایک برس کے اندر اندر مشرقی پاکستان نے بنگلہ دیش کی شکل اختیار کر لی، پاکستانی فوج کو ایک شرم ناک شکست کا سامنا کرنا پڑا اور پاکستان دولخت ہو گیا۔ اگر اُس وقت عوامی لیگ کے چھ نکات کو مان لیا جاتا اور انہی نکات کو مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں پر بھی لاگو کیا جاتا تو پاکستان بھی ایک رہتا، مغربی پاکستان کے صوبوں کو بھی خودمختاری مل جاتی اور پاکستان کے اندر جمہوری کلچر کو فروغ ملتا۔ جن چھ نکات کو اُس وقت مغربی پاکستان میں غداری کی بات سمجھا جاتا تھا، اب اُس سے ملتی جلتی باتیں موجودہ پاکستان کے اندر تقریباً سبھی سیاسی رہنما کرتے ہیں اور کوئی بھی انہیں غدار قرار نہیں دیتا۔ مشرقی پاکستان کے اندر مذہبی طبقے سے تعلق رکھنے والے کچھ لوگوں نے عوامی لیگ کے خلاف فوج کا ساتھ دیا، لیکن تیس برس کے بعد جب یہی لوگ صوبہ سرحد میں برسرِاقتدار آئے تو یہ لوگ وہی بولی بولنے لگے جو 1970ء میں شیخ مجیب الرحمٰن بولتے۔

ستر کی دہائی میں بھٹو کو یہ موقع ملا کہ وہ جمہوری بنیادوں پر پاکستان کی تعمیر کریں۔ اسی جذبے کے تحت اُنہوں نے 1973ء کے آئین پر اتفاق رائے پیدا کیا۔ یہ اُن کا عظیم کارنامہ تھا۔ بدقسمتی سے بھٹو کے اندر اختیارات کو اپنی ذات میں مرتکز کرنے کا رجحان تھا اور وہ منتقم مزاج بھی تھے۔ چنانچہ متفقہ آئین کی منظوری کے دوسرے ہی دن اُنہوں نے ملک میں ایمرجنسی نافذ کر کے سارے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیے اور اس کے بعد یک طرفہ طور پر، حزبِ اختلاف کے بہت سے اراکین کو خریدتے ہوئے، اپنی عددی اکثریت کے بل بوتے پر آئین میں خالصتاً آمرانہ ترامیم کر دیں۔ اُنہوں نے سرحد اور بلوچستان میں بھی اپنی پارٹی کی صوبائی حکومتیں قائم کر دیں حالانکہ ان دونوں صوبوں میں اُن کی پارٹی بہت کمزور تھی۔ گویا بھٹو کا چھ سالہ دور بھی صوبائی خودمختاری کی نفی پر مرکوز رہا۔ اس کے بعد جب ایک دفعہ پھر مارشل لاء نے پاکستان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تو ظاہر ہے کہ صوبائی خودمختاری دینے کا تو کوئی سوال نہ رہا۔ 1985ء کے انتخاب کے بعد جونیجو کو وزیرِاعظم بنایا گیا۔ جونیجو کا دور جمہوری اعتبار سے بہت حوصلہ افزاء تھا۔

Marfat.com

اُنہوں نے اپنے تین سالہ اقتدار کے دوران میں کوئی غیر جمہوری اقدام نہیں کیا۔ اگر اُن کو اپنے اقتدار کے پانچ برس پورے کرنے کا موقع ملتا اور پھر معمول کے طریقے پر انتخابات منعقد ہوتے تو پاکستان کی مستقبل کی تاریخ بہت مختلف ہوتی۔ یہی وہ وقت تھا جب نواز شریف کی قیادت میں مسلم لیگیوں نے جونیجو کے خلاف بغاوت کر کے جنرل ضیاء الحق کا ساتھ دیا۔ 1988ء کے بعد بے نظیر بھٹو اور نواز شریف کی دو دو حکومتوں میں بھی صوبائی خودمختاری کے لئے کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا۔ بلکہ اپنی اپنی باری پر ان دونوں مقبول لیڈروں نے اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ ہاتھ ملا کر اپنے اقتدار کا راستہ ہموار کیا۔ اس دوران میں اس ملک پر ایسا وقت بھی آیا کہ پنجاب میں غلے کی وافر مقدار موجود تھی اور دوسری طرف سرحد اور بلوچستان میں قحط جیسی صورت حال تھی۔ ایسا بھی ہوا کہ پنجاب سے اپنی ضرورت کے لیے ایک یا دو من گندم لانے کے جرم میں ڈرائیور اور مسافر پولیس کی گولیوں کا نشانہ بن کر لقمہ اجل بنے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت حال میں محبتوں کے چشمے کہاں سے پھوٹ سکتے ہیں، جب تمباکو اور معدنیات کی ساری آمدنی تو مرکز کے پاس جائے اور پنجاب سے دوسرے صوبوں کو غلہ لے جانے پر بھی پابندی ہو۔

جنرل مشرف نے برسر اقتدار آنے کے بعد اپنا ایک سات نکاتی ایجنڈا مرتب کیا۔ اُس ایجنڈے میں صوبائی خودمختاری کا وعدہ بھی شامل تھا، جو سات برس گزرنے کے بعد بھی ابھی تک وفا نہیں ہو سکا۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے دو برس قبل دو پارلیمانی کمیٹیاں بھی بنی تھی، جن کا ایک عرصے تک بڑا غلغلہ رہا۔ لیکن ابھی تک اس ضمن میں ایک قدم بھی نہیں اٹھایا گیا۔

اس راقم کی نظر میں صوبائی خودمختاری کا اصل مطلب مالیاتی خودمختاری ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اصلاً ہر صوبہ اپنے وسائل کا خود مالک ہو اور مرکز ہر صوبے کی آبادی کے تناسب سے اُس سے اپنے حصے کی رقم لے۔ مرکز کے پاس دفاع، اُمور خارجہ اور بین الصوبائی رابطے کی وزارت ہونی چاہیے۔ باقی سب کچھ صوبوں کے حوالے کر دیا جائے۔ جن چیزوں میں صوبوں کے درمیان آپس میں مشترک مفادات ہوں، مثلاً مواصلات، تعلیم، صحت اور اسی طرح کے دوسرے

Marfat.com

مسائل، اُن کو صوبائی رابطے کی وزارت کے ذریعے اتفاق رائے سے حل کر دیا جائے۔ اس طرح صوبے آپس میں خود ہی اپنے اپنے مفادات کا خیال رکھتے ہوئے دوسرے صوبوں کو رعایتیں دیں گے۔ چنانچہ کسی کا کسی سے کوئی گلہ نہ رہے گا۔ یہ کتنی مضحکہ خیز صورت حال ہے کہ ایک طرف تو حکومت فیملی پلاننگ پر زور دے رہی ہے اور دوسری مرکزی حکومت سارے وسائل خود جمع کر کے صوبوں کو اُن کی آبادی کی تناسب سے رقم دے رہی ہیں۔ اس طرح مرکزی حکومت اُن کو یہ پیغام دے رہی ہے کہ جو صوبہ بھی اپنی آبادی بڑھائے گا، اُسے زیادہ حصہ ملے گا۔ گویا صوبوں کو متضاد (Contradictry) پیغام دیا جا رہا ہے۔ یہی حال زندگی کے باقی تمام شعبوں کا ہے۔ اس کے بالکل برعکس اگر صوبے خود اپنے وسائل کے مالک ہوں اور وہ اپنی آبادی کے حصے کے طور پر مرکز کو رقم دیں تو ہر صوبے کے اندر اپنی آبادی بڑھانے کی نہیں بلکہ کنٹرول کرنے کی دوڑ شروع ہو جائے گی۔

پاکستان کے بے شمار حساس لوگوں کی طرح اس راقم کا بھی یہ خیال ہے کہ اگر اس ملک میں جلد از جلد صوبائی خود مختاری نہیں دی گئی، تو اس ملک کا مرکز خود اپنے بوجھ تلے بیٹھ جائے گا۔ پھر باہر سے کسی ملک کو ہمارے خلاف کسی اقدام کی ضرورت نہ رہے گی، بلکہ ہم خود ہی اپنے آپ کو ایک ناکام ریاست بنا دیں گے۔

Marfat.com

آٹھواں باب

ہر مسلمان اور پاکستانی کے لیے انفرادی ایجنڈا

پچھلے ابواب میں یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ ہمارا اجتماعی ایجنڈا کیا ہونا چاہیے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہر انسان کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کا انفرادی ایجنڈا کیا ہونا چاہیے۔ ممکن ہے کہ اُسے ملک یا اُمت مسلمہ کی اجتماعی زندگی میں بھرپور حصہ لینے کا کوئی موقع ہی نہ ہو۔ ایسی حالت میں وہ خود کیا کردار ادا کرسکتا ہے اور سوسائٹی کی تعمیر میں کونسی شراکت داری (Contribution) کرسکتا ہے؟ اس سوال کا جواب بھی بہت ضروری ہے کیونکہ ہمارے یہاں عام رجحان ہے کہ لوگ اُن مسائل پر تو بہت بحث و تمحیص کرتے ہیں جن میں وہ کوئی کردار ادا کرنے کے قابل نہیں ہوتے، لیکن وہ عام طور پر اپنے آپ کو بھول جاتے ہیں اور خود اپنے آپ سے کبھی یہ سوال نہیں کرتے کہ اس میدان میں وہ خود کیا حصہ ادا کرسکتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ امت مسلمہ اور پاکستان کے اندر بسنے والے انسان ہزاروں طرح کے مختلف کام کررہے ہیں، چنانچہ اُن کے سامنے اپنی عملی زندگی کو منضبط بنانے کے لیے کچھ اصول تو ضرور دیے جاسکتے ہیں، لیکن اس سے آگے بڑھ کر یہ ہر فرد کی اپنی ذمہ داری بن جاتی ہے کہ وہ اپنی خصوصی حیثیت پر غور کرتے ہوئے اپنے لیے ایک تفصیلی لائحہ عمل بنائے۔

سوسائٹی کی تعمیر میں ایک عام انسان کا سب سے بڑا حصہ یہ ہے کہ وہ اپنے شعور کو ہر وقت بیدار رکھے اور جہاں جہاں تک اُس کا بس چلے، لوگوں کے اندر شعور و آگہی پیدا کرنے کے لیے اپنی کوشش کرے۔ یہ شعور بنیادی طور پر انہی چھ باتوں پر مشتمل ہے جس کا تذکرہ پچھلے دو ابواب میں کیا جاچکا ہے۔ یعنی پورے امت مسلمہ کے لیول پر تعلیم، جمہوری کلچر اور زندگی کے ہر معاملے میں حکمت و صبر سے کام لینا۔ پاکستان کی سطح پر افغانستان و کشمیر کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے شعور بیدار کرنا، صوبائی خودمختاری کا قیام اور انصاف کی اہمیت کے بارے میں شعور و آگہی کو پیدا کرنا۔ یہ ہر ایک فرد کی پہلی ذمہ داری ہے۔ اور اگر امت مسلمہ کے کسی ملک یا پاکستان میں ان ذمہ داریوں کا ایک اجتماعی شعور بیدار ہوگیا تو اُس ملک کی کایا ہی پلٹ جائے گی۔

Marfat.com

ہر انسان کا دوسرا کام یہ ہے کہ وہ درج بالا چھ امور کے بارے میں خود بھی جہاں تک ممکن ہو کوئی عملی کردار ادا کرے۔ مثلاً وہ اپنے روزمرہ امور میں مشورے اور مکالمے سے کام لے۔ جہاں جہاں اُس کا اختیار ہو، وہاں وہ انصاف سے کام لے۔ وہ اپنے معاملات میں دیانت دار بنے اور ہر وقت اپنے آپ سے یہ سوال کرتا رہے کہ حقوق العباد کے ضمن میں اُس سے کوئی کوتاہی تو نہیں ہو رہی۔

وہ یہ دیکھے کہ کیا روزانہ وہ کسی نہ کسی انسان کی کوئی خدمت کر رہا ہے یا نہیں۔ اگر پاکستان کے آدھے سے زیادہ لوگ اس پر عمل پیرا ہو جائیں تو پروردگار کی طرف سے ہمارے لیے نعمت و برکت کے دروازے کھل جائیں گے۔ تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ ان باتوں کا کہنا تو بہت آسان ہے لیکن ان پر عمل کرنا بہت مشکل ہے۔ ہر انسان کے سامنے روزانہ ایسے مواقع آتے ہیں جب بے انصافی، بددیانتی، کام چوری، کرپشن، اور دوسروں کا حق مارنا اُس کے مفاد میں ہوتا ہے۔ آج کے حالات میں اپنے نفس کو قابو میں رکھنے کا اہم ترین نکتہ یہی ہے۔ ہم اپنے اردگرد ہزاروں لاکھوں لوگوں کو دیکھتے ہیں جو نماز روزہ کی پابندی کرتے ہیں، شراب اور جوئے سے دور رہتے ہیں لیکن دیانت داری اور حقوق العباد کے ضمن میں قرآن وحدیث کی ہدایات تو کجا، وہ تو اُس معیار پر بھی پورے نہیں اُترتے جس پر آج ترقی یافتہ دنیا قائم ہے۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ حقوق اللہ کا خیال نہ رکھا جائے۔ یقیناً وہ بھی بہت ضروری ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ حقوق العباد کا خیال رکھنا اُتنا ہی ضروری ہے، بلکہ آج کے حالات میں تو اُس سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ حقوق العباد کا سب سے بڑا اظہار دیانت داری کی شکل میں ہوتا ہے۔ جب ایک ملازم اپنی ڈیوٹی میں کوتاہی کرتا ہے تو وہ درحقیقت بددیانتی کر رہا ہوتا ہے۔ جب ایک تاجر کاروبار کرتے وقت جھوٹ بولتا ہے تو وہ بددیانتی کر رہا ہوتا ہے۔ جب ایک ذمہ دار افسر اور بیوروکریٹ عوام کے مسائل سے منہ موڑتا ہے اور عام انسان کے کام نہیں آتا تو وہ امانت میں خیانت کر رہا ہوتا ہے۔ جب ایک صنعت کار، جاگیر دار یا ایک بڑے کاروباری ادارے کا مالک اپنے ملازمین کا استحصال

Marfat.com

کرتا ہے تو وہ بددیانتی کررہا ہوتا ہے۔ یہ نکتہ درحقیقت ہر فرد کو ہمہ وقت اپنے احتساب پر آمادہ کرتا ہے۔ اُسے ہر وقت اپنے آپ سے یہ سوال کرنا ہوتا ہے کہ کیا وہ زندگی کے ہر معاملے میں ہر وقت انصاف اور دیانت داری پر عامل ہے یا نہیں ہے۔ اُس کا ضمیر ہر وقت اُس سے یہ سوال کرتا ہے کہ کیا وہ سوسائٹی کے محروم طبقات کے لیے کچھ قربانی دے رہا ہے یا نہیں۔ چنانچہ اگر وہ اپنے احساس وشعور اور ضمیر کو زندہ رکھے اور یہ فیصلہ کرے کہ دوسرے چاہے جو بھی کریں، وہ کم از کم اپنی ذات کی حد تک اپنے اندر یہ صفات پیدا کرے گا، تو یہی دراصل ایک قوم کی ترقی کا پہلا قدم ہے۔ مثلاً بازاروں میں ہزاروں بچے بوٹ پالش کرتے ہیں، بھیک مانگتے ہیں اور بالکل چھوٹی عمر میں مکینکوں کے ساتھ بیٹھ کر کام کرتے ہیں۔ یوں اُن کی تعلیم کا وقت نکل جاتا ہے اور یہ بچے ہمیشہ کے لیے معاشرے پر بوجھ بن جاتے ہیں۔ ہمارے اردگرد کتنی ہی بیوائیں، بوڑھے اور یتیم ہیں جن کا کوئی سہارا نہیں۔ کتنے طلبہ ہیں جن کے پاس امتحان میں بیٹھنے کی فیس نہیں۔ کتنے بیمار ہیں جن کے پاس دواؤں کے پیسے نہیں۔ ایک باشعور انسان جب ان چیزوں کو دیکھتا ہے تو اُسے یہ سوچنا چاہیے کہ میں آگے بڑھ کر ایسے محروم لوگوں کی کیا عملی مدد کرسکتا ہوں۔ یہ عملی مدد انفرادی بھی ہوسکتی ہیں اور اجتماعی بھی۔

انفرادی ایجنڈے کا تیسرا نکتہ یہ ہے کہ ہر فرد اپنی ذات کی حد تک تحمل اور برداشت سے کام لے اور قانون پسند بنے۔ آج ہمارا ملک بے صبروں کا ایک گروہ بن چکا ہے۔ اشتعال انگیزی اور ہیجان پر مبنی روئے کا دور دورہ ہے۔ آج کا پاکستانی سماج متشددانہ معاشرتی رویوں کا عکس ہے۔ ہر طرف عدمِ برداشت ہے۔ جارحیت پر مبنی الفاظ، اسلوب اور لب ولہجہ ہی مقبول ومعروف ہے۔ عدمِ برداشت، تعصب اور جذباتیت کو بہادری سمجھا جاتا ہے۔ جب کہ اس کے برعکس صبر، بے تعصبی اور عدمِ تشدد کو بزدلی سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ آج ہر فرد کا یہ امتحان ہے کہ وہ زندگی کے ہر ہر لمحے میں برداشت، تحمل، بے تعصبی، غیر جذباتیت اور قانون پسندی سے کام لے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج کے دور کا سب سے بڑا مجاہدہ یہی ہے کہ ایک فرد معاملات میں دیانت دار بنے اور رویوں

Marfat.com

میں عدمِ تشدد کا مظاہرہ کرے۔

درج بالا نکتے کی ایک ضمنی شق اُن افرادکار سے متعلق ہے جو آگے بڑھ کر اپنا کچھ وقت اور وسائل اس مقصد کے لیے صرف کرنے کا عزم رکھتے ہوں۔ وہ صاحبانِ عزیمت جو اس خاکے سے بلحاظ مجموعی اتفاق رکھتے ہیں، ان کے لیے نشانِ راہ یہ ہے کہ وہ ہر وقتی سود وزیان سے بالاتر ہو کر اس شعور وآگہی کے دست وبازو بن جائیں۔ اس کے علاوہ ایک طبقہ اُن لوگوں کا بھی ہے جو پہلے سے ہی کسی سیاسی، سماجی یا مذہبی گروہ میں کام کر رہے ہیں۔ ان میں سے بہت سے افراد کے لیے، گوناگوں عوامل کی وجہ سے، اپنی کمیونٹی سے علیحدہ ہونا آسان نہیں ہوتا۔ ایسے افراد کے لیے مناسب لائحہ عمل یہ ہے کہ وہ اپنی جماعت کے اندر رہتے ہوئے اپنے حلقہ احباب میں اس فکر وخیال کو مسلسل پھیلاتے رہیں۔ کیا عجب کہ ایک دن اُسی جماعت کے اربابِ حل وعقد اِسی نقطہ نظر کے حامی بن جائیں جس کے لیے یہ کتاب تحریر کی گئی ہے۔ اصل مقصد کسی گروہی تعصب کو ابھارنا نہیں بلکہ اِس احساس وشعور کو دلوں میں جاں گزیں کرنا ہے۔ اگر پہلے سے موجود کوئی گروہ انہی مقاصد کو حرزِ جاں بنا لے تو اس سے بڑھ کر اطمینان کی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔

درج بالا تینوں نکات انفرادی رہنمائی کے لیے ہیں۔ ان کی روشنی میں ہر فرد اپنے حالات کے مطابق خود اپنے لیے راہِ عمل متعین کر سکتا ہے۔

Marfat.com

نواں باب

پاکستانی جرنیل اور سیاست دان

سوائے ایک بہت مختصر عرصے کے، پاکستانی عوام کبھی بھی اپنی قسمت کے مالک نہیں بن سکے۔ پاکستان کو جو پارلیمنٹ ورثے میں ملی، اُس کا انتخاب درحقیقت دسمبر 1945ء میں ہوا تھا۔ یہ انتخاب اس مقصد کے لیے کیا گیا تھا کہ کیا برصغیر کو دو حصوں میں تقسیم کیا جائے یا نہیں۔ ظاہر ہے کہ برصغیر کی تقسیم کے بعد ایک نئی صورت حال نے جنم لے لیا تھا، اس لیے یہ مناسب ہوتا کہ قیام پاکستان کے کچھ عرصے بعد نیا انتخاب کروادیا جاتا۔ تاہم اس کے جواب میں کہا جاسکتا ہے کہ اُس وقت پاکستان ایک ایسی دگرگوں حالت سے گزر رہا تھا کہ نئے انتخابات کا انعقاد ممکن نہ تھا۔ اس پارلیمنٹ کو انگریزوں کا بنایا ہوا 1935ء کا عبوری آئین ورثے میں ملا تھا۔ کسی بھی نئی مملکت کی پارلیمنٹ کا پہلا قدم یہ ہوتا ہے کہ وہ ملک کے لیے جلد از جلد آئین کی تشکیل کرے۔ عموماً یوں بھی ہوتا ہے کہ چند مہینوں کے اندر اندر ایک عبوری آئین بنا دیا جاتا ہے اور اگلے سال ڈیڑھ سال کے اندر مستقل آئین کو تشکیل دے دیا جاتا ہے۔ مگر یہاں ایسا نہ ہوسکا۔ قیام پاکستان کے ابتدائی چند مہینوں میں بھی گورنر جنرل کو حاصل خصوصی اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے 1935ء کے عبوری آئین کے ڈھانچے کے اندر چار بڑی تبدیلیاں عمل میں لائی گئیں۔ ان تبدیلیوں کے ذریعے صوبوں کو حاصل سارے اختیارات مرکز کے حوالے کردیے گئے اور یوں ابتدا ہی سے جمہوری کلچر پر ایک کاری ضرب لگائی گئی۔ صرف یہی نہیں بلکہ چار صوبوں یعنی بنگال، پنجاب، سرحد اور بلوچستان میں انگریز گورنر مقرر کیے گئے اور صرف سندھ میں ایک پاکستانی کو یعنی سر غلام حسین ہدایت اللہ کو گورنر مقرر کیا گیا۔ اسی طرح بری، بحری اور فضائی افواج کے سربراہ انگریز ہی مقرر کیے گئے۔ یہ بڑی حیرت کی بات ہے کہ کیا ان عہدوں کے لیے کوئی بھی پاکستانی موجود نہیں تھا۔

بدقسمتی سے پاکستان کی ابتدا سیاسی آویزشوں سے ہوئی۔ ہر جگہ انتہائی سخت نظریاتی

Marfat.com

اختلافات تھے۔ ساتھ ہی ساتھ جاگیرداروں اور بیوروکریٹس نے اقتدار میں اپنا حصہ یقینی بنانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کیے۔ یہی وجہ ہے کہ آئین سازی کی طرف کسی نے زیادہ توجہ ہی نہیں دی۔ آئین سازی کے ضمن میں سب سے اہم پیش رفت 1949ء میں ایک قرارداد کی شکل میں ہوئی جسے ''قراردادِ مقاصد'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ گویا قیام پاکستان کے ڈیڑھ برس بعد صرف چند اصولوں پر ہی اتفاق ہوسکا۔ اس کے مزید ڈیڑھ سال بعد یعنی ستمبر 1950ء میں آئین سازی کے لیے کچھ تجاویز اسمبلی کے سامنے رکھی گئیں۔ یہ تجاویز انتہائی غیر اطمینان بخش تھیں۔ قائداعظم قیام پاکستان کے چند مہینے بعد ہی بہت بیمار ہو گئے تھے اور گیارہ ستمبر 1948ء میں قوم کو داغ مفارقت دے گئے۔ تاہم لیاقت علی خان بھی اپنے ساڑھے چار سالہ دور اقتدار میں مستقبل کے آئین کے لیے بنیادی ڈھانچہ بھی فراہم نہ کر سکے۔ دسمبر 1952ء میں وزیراعظم خواجہ ناظم الدین نے آئین سازی کے حوالے سے کچھ اہم تجاویز پیش کی، تاہم یہ تجاویز بھی بہت غیر اطمینان بخش تھیں۔ اکتوبر 1953ء میں وزیراعظم محمد علی بوگرا نے اسمبلی میں اپنا آئینی فارمولا پیش کیا۔ اس آئینی مسودے پر کام جاری تھا کہ اکتوبر 1954ء میں گورنر جنرل غلام محمد نے اپنے وقتی سیاسی اغراض کی وجہ سے اسمبلی کو توڑ دیا۔

دوسری آئین ساز اسمبلی کو عام انتخاب کے ذریعے نہیں، بلکہ صوبائی اسمبلیوں کے اراکین کے ذریعے منتخب کیا گیا۔ ایسا اس لیے کیا گیا تاکہ اسٹیبلشمنٹ اپنی مرضی کے نتائج حاصل کر سکے۔

مارچ 1956ء میں وزیراعظم چودھری محمد علی کا پیش کردہ مسودہ آئین اسمبلی نے منظور کر دیا اور گورنر جنرل نے اُس کی توسیق کر دی۔

قائداعظم کی وفات سے لے کر اکتوبر 1958ء میں ایوب خان کے مارشل لاء کے اعلان تک، یہ پورا دس سالہ دور محلاتی سازشوں کا دور تھا۔ ایوانِ اقتدار میں اصولی سیاست نام کی کوئی چیز موجود نہیں تھی۔ جوڑ توڑ اپنے پورے عروج پر تھی۔ راتوں رات ارکان اسمبلی اپنی سیاسی

Marfat.com

وفاداریاں تبدیل کرتے اور نئی نئی پارٹیاں وجود میں آجاتیں۔ خودغرض سیاست دان اخلاقی دیوالیہ پن کی علامت بن گئے تھے۔ اکتوبر 1954ء میں، جب محمد علی بوگرا وزیراعظم تھے، جنرل ایوب خان کو بھی کابینہ میں بطور وزیر دفاع شامل کرلیا گیا۔ پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ کسی کمانڈر انچیف کو کابینہ میں شامل کیا گیا اور اسی طرح سیاست میں فوج کے لیے راستہ ہموار کردیا گیا۔ گویا قیام پاکستان کے پہلے سات برس میں یہ ملک سیاست دانوں، جاگیرداروں اور بیوروکریٹس کے رحم وکرم پر رہا اور اس کے بعد اقتدار کے اس کھیل میں فوج کی اعلیٰ قیادت بھی شامل ہوگئی۔ طاقت کے کھیل کا ایک اصول یہ ہے کہ اس میں وہی غالب آتا ہے جو سب سے زیادہ طاقتور ہو۔ یہی طاقت کی منطق ہے۔ چنانچہ اکتوبر 1958ء میں ایوب خان نے مارشل لاء لگا کر اقتدار پر قبضہ کرلیا۔

اگر قیام پاکستان کے چند مہینوں کے اندر اندر نئے صوبائی اور قومی انتخابات عمل میں لائے جاتے اور پھر چار یا پانچ برس بعد باقاعدگی سے انتخاب ہوتے تو قوم پہلے دن سے ہی ایک صحیح راستے پر گامزن ہوجاتی۔ قوم کو جمہوری کلچر سے محروم رکھنے میں درج بالا چاروں طبقات کا پورا پورا حصہ ہے۔

ایوب خان نے ملک کو 1962ء کا ایک غیر جمہوری آئین دیا اور پھر دس برس بعد اس حال میں رخصت ہوا کہ اس نے اقتدار ایک اور مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل یحییٰ خان کے حوالے کردیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ایوب خان نے اقتدار سنبھالتے وقت اپنی پہلی تقریر میں ملکی صورت حال کی جو گھمبیر تصویر کھینچی، اقتدار سے رخصت ہوتے وقت اس نے اپنی آخری تقریر میں ملک کی صورت حال کی ویسی ہی گھمبیر تصویر پیش کی۔ 1965ء میں ایوب خان نے گوریلوں کی شکل میں پاکستانی فوج کو مقبوضہ کشمیر کے اندر کارروائیوں کے لیے بھیج دیا۔ ان گوریلوں کو بھارتی کشمیر کے عوام کی طرف سے کوئی مدد نہ مل سکی۔ الٹا بھارت نے پاکستان پر حملہ کردیا۔ یہ پاک بھارت جنگ سترہ دن تک جاری رہی۔ اگرچہ پاکستان کے اندر عام تاثر یہ ہے کہ پاکستان اس جنگ میں فاتح

Marfat.com

رہا، مگر حقیقت یہ ہے کہ پاکستان یہ جنگ ہار گیا تھا۔ تیرہ دن کے بعد پاکستان کے پاس لڑنے کے لیے اسلحہ نہ رہا تھا اور پاکستان نے دوست ملکوں سے کہہ دیا تھا کہ وہ اقوام متحدہ کے ذریعے جنگ بندی کروائیں۔ جنگ ختم ہونے کے بعد اکتوبر میں وزیر خزانہ محمد شعیب نے نظرِ ثانی شدہ بجٹ پیش کیا۔ جب رکنِ اسمبلی مولوی فرید احمد نے سوال کیا کہ اس جنگ پر کتنا خرچ آیا ہے، تو شعیب نے جواب دیا کہ اس سترہ روزہ جنگ پر پاکستان کا آدھا بجٹ ختم ہو گیا ہے۔ گویا اگر یہ جنگ چند دن اور جاری رہتی تو پاکستان کا پورا سالانہ بجٹ اس کی نذر ہو جاتا۔ اُس وقت پاکستان کے پاس صرف تیرہ دن کی لڑائی کا ساز و سامان موجود تھا، جب کہ بھارت کے پاس اس سے تین گنا وقت کے لیے لڑائی کا سامان موجود تھا۔

جنرل یحییٰ خان نے دسمبر 1970ء میں انتخاب تو کروالیا مگر عملاً انتخاب کے نتائج کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا، جس کا نتیجہ ملک کے دولخت ہونے کی صورت میں سامنے آیا۔

موجودہ پاکستان میں بھٹو نے عملاً جنوری 1972ء میں اقتدار سنبھالا، اپریل میں قومی اسمبلی نے ایک عبوری آئین منظور کر لیا اور 14 اگست 1973ء کو مستقل آئین نافذ کر دیا گیا۔ اس آئین کا اتفاق رائے سے پاس ہونا بھٹو کا ایک بڑا کارنامہ تھا۔ تاہم بدقسمتی سے بھٹو کے اندر اختیارات کو اپنی ذات میں مرتکز کار جحان موجود تھا اور اس کے ساتھ وہ تند مزاج بھی تھے۔ چنانچہ انہوں نے ملک میں ایمرجنسی نافذ کر دی، آئین میں من مانی ترامیم کر دیں اور صوبہ سرحد اور بلوچستان میں بغیر کسی جواز کے اپنے پارٹی کی حکومتیں قائم کر دیں۔ بلوچستان کی بے چینی کو دبانے کے لیے بھٹو نے فوج بھی استعمال کی۔ ایمرجنسی کی آڑ میں بنیادی حقوق معطل کر دیے گئے اور ایک ایسا دور بھی آیا جب حزبِ اختلاف کے اراکین کو پارلیمنٹ سے اٹھا کر باہر پھینک دیا گیا۔ اگر بھٹو یہ سب کچھ نہ کرتے تو پاکستان میں ایک عظیم جمہوری کلچر کا آغاز ہو سکتا تھا۔

مارچ 1977ء میں عام انتخابات منعقد ہوئے۔ حزبِ اختلاف کی سیاسی جماعتوں نے دھاندلی کا الزام لگا کر انتخابی نتائج کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس راقم کا تجزیہ یہ ہے کہ اگر

Marfat.com

منصفانہ انتخاب ہوتا تو تب بھی بھٹو سادہ اکثریت سے انتخاب جیت جاتے۔ لیکن چونکہ اُن کی یہ خواہش تھی کہ انہیں اسمبلی میں دو تہائی اکثریت حاصل ہو جائے اس لیے دھاندلی کا ارتکاب کیا گیا۔

ان انتخابی نتائج کے خلاف ایک بڑا عوامی احتجاج ہوا، جس پر بھٹو نے حزب اختلاف کو مذاکرات کی دعوت دی۔ یہ مذاکرات کئی ہفتوں تک چلتے رہے اور پھر جب کہ مذاکرات کامیابی کے بالکل قریب پہنچ چکے تھے، جولائی 1977ء میں جنرل ضیاء الحق نے مارشل لاء لگا دیا۔ اور اُس نے قوم سے وعدہ کیا کہ فوج نوے (90) دن کے اندر اندر انتخاب کروا کر اقتدار سے رخصت ہو جائے گی۔ راقم کا تجزیہ یہ ہے کہ اگر یہ انتخاب ہو جاتا تو اس میں بھی پیپلز پارٹی کو کامیابی ملتی۔ حزب اختلاف کی ساری پارٹیوں نے مارشل لاء کا خیر مقدم کیا۔ چونکہ انہیں بھی یہ معلوم تھا کہ انتخاب کے نتیجے میں پیپلز پارٹی کی جیت کا واضح امکان ہے، اس لیے جب بھٹو پر نواب محمد احمد خان کے قتل کا مقدمہ دائر کیا گیا اور جنرل ضیاء نے اس کی آڑ میں انتخابات کو ملتوی کرنے کا اعلان کیا تو پیپلز پارٹی کی مخالف سیاسی جماعتوں کا اتحاد "پاکستان قومی اتحاد" حکومت میں شامل ہو گیا۔ اس مقدمہ قتل کا کوئی جواز نہیں بنتا تھا اس لیے کہ نواب محمد احمد خان کے سارے وارث بھٹو اور دوسرے ذمہ داروں کو معاف کر چکے تھے۔ بہر حال یہ مقدمہ چلا جو پاکستان کی تاریخ پر ایک بدنما داغ ہے۔ سپریم کورٹ کے سارے پنجابی ججوں نے بھٹو کے خلاف فیصلہ دیا اور غیر پنجابی ججوں نے بھٹو کے حق میں فیصلہ دیا۔ اُس وقت کی سپریم کورٹ کے جج سید نسیم حسن شاہ نے اب 2006ء میں برملا یہ اقرار کیا کہ یہ فیصلہ غلط تھا اور مبنی بر انصاف نہیں تھا۔ اُس وقت بھٹو کی مخالف ساری پارٹیاں دل و جان سے مارشل لاء کے ساتھ تھیں۔

اس کے کچھ عرصہ بعد جب دسمبر 1979ء میں روسی افواج افغانستان میں داخل ہوئیں تو امریکہ، جنرل ضیاء، جماعت اسلامی اور افغانستان کی حزب اختلاف پر مشتمل ایک اتحاد وجود میں آ گیا۔ اس اتحاد کو ہر ایک نے اپنے مفاد میں سمجھا اور اپنے مفاد کے لیے استعمال کرنے کی

Marfat.com

کوشش کی۔ امریکہ نے سوچا کہ یہ روس سے ویت نام کی شکست کا سکور برابر کرنے کا بہترین موقع ہے۔ جنرل ضیاء اس قضیے کے ذریعے اپنے اقتدار کو دوام بخشنا چاہتے تھے، افغانستان کے اندر ایک تابعدار حکومت کا قیام چاہتے تھے اور یہ بھی چاہتے تھے کہ اس معاملے کے بعد ان گوریلوں کو کشمیر میں استعمال کر سکیں۔ جماعت اسلامی کا خیال یہ تھا کہ اس کامیابی کے نتیجے میں افغانستان میں اس کے تصورات پر مبنی ایک اسلامی حکومت قائم ہو جائے گی۔ جب کہ افغانستان کی ہر مجاہد تنظیم اپنے دل میں یہ مقصد رکھتی تھی کہ روسی افواج کے نکلنے کے بعد وہ باقی تمام تنظیموں کو شکست دے کر اپنا اقتدار قائم کر دے گی۔

تاریخ نے ہمیں یہ سبق سکھایا ہے کہ جب بھی مختلف طاقتیں اپنے اپنے مفاد کے لیے ایک دوسرے سے گٹھ جوڑ کرتی ہیں تو ان میں اُسی طاقت کا مفاد پایہ تکمیل تک پہنچتا ہے جو مادی اعتبار سے سب سے زیادہ طاقتور ہو۔ چنانچہ اس پورے معاملے میں سب سے زیادہ فائدہ امریکہ کو ملا، دوسرے نمبر پر جنرل ضیاء کو فائدہ ملا کیونکہ اس طریقے سے وہ اپنا اقتدار 1988ء تک لے جانے میں کامیاب ہو گیا۔ آخری دو طاقتیں یعنی جماعت اسلامی اور افغان مجاہد تنظیمیں درحقیقت کوئی حقیقی طاقتیں تھیں ہی نہیں کیونکہ اُن کی ساری طاقت درحقیقت امریکہ اور پاکستان کی مرہون منت تھی، اس لیے یہ دونوں طاقتیں مکمل خسارے میں رہیں۔

جماعت اسلامی وہ واحد پارٹی تھی جس نے بحیثیتِ جماعت صدارتی ریفرنڈم میں جنرل ضیاء کی حمایت کی۔ 1985ء میں غیر جماعتی انتخابات کے بعد آنے والی پارلیمنٹ نے جنرل ضیاء کو وردی سمیت پاکستان کا صدر مان لیا۔ اس فیصلے میں مسلم لیگ اور جماعت اسلامی دونوں شامل تھیں۔ نواز شریف اور راجہ ظفر الحق سمیت سارے مسلم لیگی جنرل ضیاء کے کیمپ میں شامل تھے۔ تاہم جب وزیر اعظم جونیجو نے بعض معاملات میں جنرل ضیاء کی خواہش سے کچھ سرتابی کرنے کی کوشش کی تو اُن کو 1988ء میں برخواست کر لیا گیا اور کچھ ۶ ماہ بعد 18 اگست 1988ء کو جنرل ضیاء ایک فوجی C-130 کے ایک پراسرار حادثے میں اپنے

Marfat.com

ساتھیوں سمیت جاں بحق ہو گئے۔

اس کے بعد جو عام انتخاب منعقد ہوا، اُس میں بے نظیر بھٹو کی پارٹی سب سے بڑی جماعت کی حیثیت سے سامنے آئی لیکن اُسے مطلق اکثریت حاصل نہیں تھی۔ اُس کے مقابلے میں اسلامی جمہوری اتحاد کے نام سے دائیں بازو کی جماعتوں کا ایک اتحاد بنا۔ اب یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ یہ اتحاد آئی ایس آئی نے بنایا تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو کے برعکس بے نظیر بھٹو نے اپنی سیاسی زندگی میں ہمیشہ اسٹیبلشمنٹ سے سمجھوتے کی کوشش کی۔ اس کی ابتداء 1988ء سے ہوئی۔ اسٹیبلشمنٹ نے یہ شرط لگائی کہ کشمیر اور افغانستان سمیت خارجہ پالیسی اور نیوکلیئر پروگرام سمیت سارے دفاعی فیصلے اُسی کے اختیار میں رہیں گے۔ نیز کوئی بھی اہم فیصلہ اُس کی منظوری کے بغیر نہیں کیا جائے گا۔ یہ ساری شرائط بے نظیر نے مان لیں۔ حتیٰ کہ جنرل ضیاء کے مسلسل وزیر خارجہ جنرل یعقوب خان کو بھی اپنی کابینہ میں شامل کرنے پر سمجھوتہ کر لیا۔ اور یوں وہ ایک بے دست و پا وزیر اعظم بن گئیں۔

اس کے بعد اقتدار کا ایک میوزیکل چیئر کا سلسلہ شروع ہوا۔ 1991ء میں صدر غلام اسحاق خان نے بے نظیر حکومت کو برخواست کر لیا اور نئے انتخاب میں نواز شریف برسر اقتدار آ گئے۔ اُس حکومت کو بھی 1993ء کے آخر میں صدر نے برخواست کر دیا اور بے نظیر ایک دفعہ پھر برسر اقتدار آ گئیں۔ اس حکومت کو 1996ء کے آخر میں اپنی ہی پارٹی کے صدر فاروق احمد خان لغاری نے برخواست کیا اور نواز شریف ایک دفعہ پھر برسر اقتدار آ گئے۔ 1999ء میں کارگل کے مسئلے پر نواز شریف اور جنرل مشرف کے درمیان اختلافات بہت شدید ہو گئے۔ چنانچہ نواز شریف نے جنرل مشرف کو آرمی چیف کی عہدے سے برخواست کرنے کا اعلان کر دیا اور دوسری طرف آرمی نے نواز شریف کو بے دخل کر کے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔

یہ وہ وقت تھا جب پچھلے دو مہینوں سے حزب اختلاف کی پارٹیاں پیپلز پارٹی اور جماعت اسلامی سمیت، ایک بڑی مہم میں مصروف تھیں۔ اس مہم کا نام ''نواز ہٹاؤ ملک بچاؤ'' تھا۔

Marfat.com

چنانچہ جب ستمبر 1999ء میں آرمی نے نواز شریف کا تختہ اُلٹا تو بے نظیر بھٹو، قاضی حسین احمد اور مولانا فضل الرحمان سمیت تقریباً سبھی سیاسی پارٹیوں نے اس کا خیر مقدم کیا۔ اُس وقت محمود خان اچکزئی وہ واحد سیاست دان تھے جنھوں نے اس اقدام کی مذمت کی اور اسے ماورائے آئین قرار دیا۔

1988ء سے لے کر 1999ء تک کے دوران میں ملٹری کی یہ پالیسی تھی کہ وہ پس پردہ رہ کر ملک کے اہم معاملات کو چلائے گی، البتہ ظاہری طور پر اقتدار سیاست دانوں کے سپرد کردیا جائے گا۔ اسٹیبلشمنٹ کا یہ کام نواز شریف اور بے نظیر دونوں نے بہت آسان کردیا۔ کیونکہ ان دونوں میں سے جو بھی اقتدار میں ہوتا، تو دوسرا فریق اس حکومت کو گرانے کے لیے فوراً اپنی خدمات اسٹیبلشمنٹ کو پیش کردیتا۔ یوں اپنے عہد اقتدار میں نواز یا بے نظیر دونوں میں سے جس نے بھی اسٹیبلشمنٹ کے پنجوں سے آزاد ہونے کی کوئی کوشش کی، اُس کوشش کو دوسرے نے ناکام بنادیا۔

جنرل مشرف نے اقتدار میں آتے ہی یہ بات واضح کردی کہ آئندہ نواز اور بے نظیر کو کسی صورت میں بھی برسر اقتدار نہیں آنے دیا جائے گا۔ شروع میں اس حکومت کے متعلق امریکہ کا رویہ مخالفانہ رہا، لیکن جب گیارہ ستمبر 2001ء کو امریکہ کے اندر ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور دوسرے اہم مقامات پر خودکش حملے ہوئے تو مشرف نے یوٹرن لیتے ہوئے طالبان کی حمایت سے ہاتھ کھینچ لیا اور امریکہ کے ساتوں کے سات مطالبات مان لیے۔ اس طرح مشرف نے اپنے اقتدار کو طوالت بخشی۔ اپریل 2002ء میں مشرف نے ضیاء کے نقشہ قدم پر چلتے ہوئے اپنی صدارت کے لیے ریفرنڈم کیا جس میں علامہ طاہر القادری اور جناب عمران خان نے بھی مشرف کی حمایت کی۔ اس کے بعد اکتوبر 2002ء میں پارلیمانی انتخابات کروائے گئے جس میں اسٹیبلشمنٹ کی حمایت یافتہ مسلم لیگ نے اکثریت حاصل کی۔ تاہم چونکہ یہ مطلق اکثریت نہیں تھی اس لیے پیپلز پارٹی کے کئی ارکان پارلیمنٹ کو توڑ لیا گیا۔ بلوچستان میں سرکاری مسلم لیگ نے ایم ایم اے کی حمایت سے اپنی

Marfat.com

حکومت بنائی۔اس کے بعد بدنام زمانہ سترہویں آئینی ترمیم کے موقع پر بھی ایم ایم اے نے اسٹیبلشمنٹ کی حمایت کی۔اس آئینی ترمیم میں صرف یہی بات نہیں تھی کہ پرویز مشرف کو دونوں عہدے ساتھ رکھنے کا اختیار دیا گیا، بلکہ اس آئینی ترمیم کے ذریعے یہ بندوبست بھی کرلیا گیا کہ بے نظیر اور نواز آئندہ وزیراعظم نہ بن سکیں اور اصل اختیارات صدر کے پاس رہیں۔ایم ایم اے یہ دعویٰ کرتی ہے کہ مشرف کے ساتھ اُس کے سمجھوتے میں مشرف نے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ 2004ء کے آخر تک وردی اُتار دے گا۔اگرچہ یہ دعویٰ صحیح ہے لیکن سترہویں آئینی ترمیم میں اس کا کوئی ذکر موجود نہیں ہے۔ایم ایم اے کے قائدین شاید یہ بات بھی بھول گئے تھے کہ آئین کے الفاظ کے مطابق سادہ اکثریت سے مشرف کو دونوں عہدے ساتھ رکھنے کا اختیار دیا جاسکتا تھا۔اس ترمیم کے ذریعے ایم ایم اے کے بہت سے دوسرے مقاصد بھی پورے ہوئے،مثلاً بے نظیر اور نواز کے وزیراعظم بننے پر پابندی وغیرہ۔اس آئینی ترمیم کا انعام ایم ایم اے کو سرحد اور بلوچستان کی حکومتوں کی شکل میں بخوبی مل گیا۔

جنرل مشرف نے اپنے اقدامات کے ذریعے پاکستان کو پوری طرح امریکہ کی جھولی میں ڈال دیا۔موجودہ پاکستان اپنی پوری تاریخ میں اس طرح کبھی تقسیم نہیں ہوا تھا۔ضیاءالحق نے ہمیں کلاشنکوف اور ہیروئن کا تحفہ دیا،اور جنرل مشرف نے ہمیں اپنی فوج کو اپنے عوام کے خلاف لڑانے اور خودکش حملوں کا تحفہ دیا۔

پاکستان کی آئینی اور سیاسی تاریخ میں عدلیہ نے بھی عموماً ایک ناقابل رشک کردار ادا کیا ہے۔اعلیٰ عدلیہ نے تقریباً ہمیشہ اسٹیبلشمنٹ کا ساتھ دیا اور جمہوری حکومتوں کو نیچا دکھانے کی کوشش کی ہے۔اس کی ابتدا 1954ء میں چیف جسٹس مُنیر کے اُس فیصلے سے ہوئی جس میں اُس نے گورنر جنرل غلام محمد کی طرف سے پارلیمنٹ توڑنے کو حق بجانب قرار دیا تھا۔اس کے بعد جسٹس منیر ہی کی سربراہی میں سپریم کورٹ نے ایوب خان کے حق میں یہ کہہ کر فیصلہ دیا کہ ایک کامیاب انقلاب بذات خود اپنے جواز کا ثبوت ہوتا ہے۔اگرچہ سپریم کورٹ نے جنرل یحییٰ خان

Marfat.com

کے مارشل لاء کے خلاف فیصلہ دیا تھا لیکن یہ اُس وقت ہوا جب یحییٰ خان ایوانِ اقتدار سے رخصت ہو چکے تھے۔ 1977ء میں سپریم کورٹ نے نظریہ ضرورت کا سہارا لے کر جنرل ضیاء کو پاکستان کے سیاہ وسفید کا مالک بنا دیا۔ بے نظیر کے پہلے دور اقتدار سے بے دخل ہونے کے بعد سپریم کورٹ نے اس کو جائز قرار دیا۔ البتہ جب نواز شریف کو اقتدار سے ڈس مس کیا گیا تو سپریم کورٹ نے اس کو بلا جواز قرار دیا۔ لیکن اس کے دو مہینوں کے اندر اندر ہی نواز کو استعفیٰ دینا پڑا اس لیے کہ اسٹیبلشمنٹ یہی چاہتی تھی۔ بے نظیر اور نواز شریف کے دوسرے عہد اقتدار نے جسٹس سجاد علی شاہ نے بھی ایک نا قابل رشک کردار کا اظہار کیا۔ بے نظیر کی دوسری بے دخلی کو انہوں نے یہ کہہ کر جائز قرار دیا کہ حکومت کے خلاف بطور ثبوت اخباری تراشے بھی پیش کیے جا سکتے ہیں۔ نواز شریف کے دوسرے دور میں بھی سجاد علی شاہ نے وزیر اعظم کو اپنے سامنے جھکانے کی بہت کوشش کی جس کا نتیجہ سپریم کورٹ کے دو حصوں میں تقسیم اور سپریم کورٹ پر حملے کی صورت میں نکلا۔ تاہم یہاں یہ بات بھی واضح ہونی چاہیے کہ نواز شریف نے اپنے دوسرے دورِ اقتدار میں اپنے کچن کیبنٹ خصوصاً سیف الرحمان کے ذریعے اپنے مخالفین کے خلاف جو کچھ کیا، اخبارات پر جس طرح کی پابندیاں لگائیں اور سپریم کورٹ پر جو حملہ ہوا، یہ سب قابل خلاف جمہوریت اقدامات تھے۔

جنرل مشرف کے برسرِاقتدار آنے کے بعد سپریم کورٹ نے نہ صرف یہ کہ اُس کے اقتدار کو جائز قرار دیا بلکہ اُس کے بغیر مانگے اُسے آئین میں ترمیم کے اختیارات بھی دیے گئے۔ یہ بات بھی واضح رہنی چاہیے کہ اس ملک میں جب بھی ملٹری نے اقتدار سنبھالا اور ججوں سے کہا کہ وہ آئین کے بجائے اس اقتدار سے وفاداری کا حلف اٹھائیں تو نوے فیصد ججوں نے بلا تکلف یہ حلف اٹھا لیا۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد وہ اپنے آقاؤں کے خلاف کیسے کوئی فیصلہ دے سکتے تھے۔ البتہ جب مارچ 2007ء میں مشرف نے چیف جسٹس افتخار چوہدری کو معطل کر دیا تو ساری وکلاء برادری نے اس کے خلاف ایک فقید المثال متحدہ تحریک چلائی۔ بالآخر بیس جولائی 2007ء

Marfat.com

کو سپریم کورٹ کے تیرہ رکنی بنچ نے مشرف کے حکم کو غیر آئینی قرار دے دیا۔ یقیناً یہ فیصلہ عدلیہ کی طرف سے ایک بڑی جرأت کا ثبوت ہے۔ لیکن کیا اس جرأت کا تسلسل جاری رہے گا، اس کا جواب مستقبل ہی ہمیں دے سکتا ہے۔

درج بالا سارے تجزئے سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ پاکستان میں حقیقی جمہوری کلچر کے راستے میں ملٹری اسٹیبلشمنٹ، سیاست دان اور عدلیہ برابر کے شریک ہیں۔ اگرچہ سیاست دانوں کے حق میں کم از کم اتنی بات ضرور جاتی ہے کہ انہوں نے اپنے وقت میں پاکستان کو ٹوٹنے اور شکست سے بچائے رکھا، جب کہ اس کے برعکس ایوب خان نے 1965ء کی جنگ اور اُس کی شکست اس ملک پر مسلط کی، یحییٰ خان کے وقت میں مشرقی پاکستان ہاتھ سے گیا اور جنرل ضیاء کے وقت میں نہ صرف سیاچین گلیشیئر پر بھارت نے قبضہ جمایا بلکہ اپنی افغان پالیسی اور آٹھ مسلح افغان تنظیموں اور اُن کی حامی کئی پاکستانی مسلکی مسلح تنظیموں کی تخلیق کر کے اُس نے کلاشنکوف کلچر اور لاقانونیت کو یوں فروغ دیا کہ پاکستان اُس کے چنگل سے آج بھی نکلنے کا راستہ نہیں پا رہا۔ یہی حال جنرل پرویز مشرف کی حکومت کا ہے۔ اُس کے دورِ اقتدار میں سارے ادارے تہہ و بالا ہو گئے۔ نائن الیون کے موقع پر اُس نے امریکہ کی ساری باتیں مان کر پاکستان کے مستقبل کو ایک بڑے خطرے سے دوچار کر دیا۔

کیا جرنیلوں، سیاست دانوں اور عدلیہ نے ماضی سے سبق سیکھ لیا ہے؟ کیا پاکستانی عوام کے اندر جمہوری کلچر سے وابستگی کا شعور پختہ ہو گیا ہے؟ یہ ایسے سوالات ہیں جن کا جواب مستقبل ہی ہمیں دے سکے گا۔

(یہاں تک کی تحریر 21 جولائی 2007ء کو لکھی گئی)۔

Marfat.com

دسواں باب

مسئلہ کشمیر

(اس نکتے پر راقم نے اپنے مقالے "مسئلہ کشمیر پس منظر، موجودہ صورت حال اور حل" میں نسبتاً تفصیل سے اپنا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے احباب اُس تفصیلی مقالے کی طرف رجوع کریں)۔

کشمیر کا کل رقبہ دو لاکھ بائیس ہزار دو سو چھتیس مربع کلومیٹر ہے۔ اس میں سے ایک لاکھ ایک ہزار تین سو پچاسی مربع کلومیٹر بھارت کے قبضے میں ہے۔ جب کہ پاکستانی کشمیر کا رقبہ اٹھتر ہزار ایک سو چودہ مربع کلومیٹر ہے۔ چین کے زیر کنٹرول کشمیر کا رقبہ بیالیس ہزار سات سو پینتیس مربع کلومیٹر ہے۔

بھارتی کشمیر کی آبادی اندازاً (90) لاکھ ہے۔ ان میں مسلمانوں کی تعداد اڑسٹھ فیصد (68%) ہے۔ یعنی اس وقت بھارتی کشمیر میں مسلمانوں کی تعداد اکسٹھ (61) لاکھ کے لگ بھگ ہے، جب کہ غیر مسلموں کی تعداد اندازاً انتیس (29) لاکھ ہے۔

پاکستانی کشمیر کی آبادی ایک اندازے کے مطابق اُنتیس (29) لاکھ ہے۔ شمالی علاقہ جات کی آبادی نو (9) لاکھ ہے۔ گویا اس وقت تمام کشمیر کو ملا کر مسلمانون کی آبادی ننانوے (99) لاکھ اور غیر مسلموں کی آبادی تیس (30) لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ ان ننانوے لاکھ میں سے اندازاً ساٹھ یا اکسٹھ لاکھ مسلمان بھارتی کشمیر میں بستے ہیں۔

بھارتی کشمیر تین واضح حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ جموں ہے، جس کی سرحد پاکستانی ضلع سیالکوٹ سے ملتی ہے۔ اس حصے میں ہندو واضح اکثریت میں ہیں۔ دوسرا حصہ وادی کا ہے۔ یہی وادی اصل کشمیر ہے۔ یہ وادی، جس میں مسلمانوں کی تعداد نوے فیصد سے زیادہ ہے، ایک سو پینسٹھ کلومیٹر لمبی اور چالیس کلومیٹر چوڑی ہے۔ اس کا کل رقبہ پانچ ہزار چار سو مربع

Marfat.com

کلومیٹر ہے۔ اصل تنازعہ اسی پر ہے۔ تیسرا حصہ لداخ کا ہے۔ یہ وسیع وعریض علاقہ پہاڑی سلسلوں پر مشتمل ہے اور اس میں بہت کم آبادی ہے۔ یہاں بدھ مت کے پیروکار اکثریت میں ہیں۔ کارگل کا ضلع اسی کی پاکستانی سرحد پر واقع ہے۔ اس ضلع میں مسلمان اکثریت میں ہیں۔

پاکستانی کشمیر بھی تین حصوں میں منقسم ہے۔ ایک مظفر آباد کا علاقہ، جس کو آزاد کشمیر کہتے ہیں۔ اس کی حکومت پاکستان کی وزارتِ امورِ کشمیر کے تحت ہوتی ہے۔ عملی اعتبار سے اسے پاکستان کے ایک صوبے کی طرح چلایا جاتا ہے۔ البتہ اتنا فرق ضرور ہے کہ اس کا اپنا صدر، وزیراعظم اور اپنی سپریم کورٹ ہے۔ دوسرا حصہ گلگت اور تیسرا بلتستان پر مشتمل ہے۔ چونکہ بہت پہلے سے ان دونوں ریاستوں کی علیحدہ حیثیت اور شناخت چلی آرہی ہے، اس لیے ان کے لیے حال ہی میں شمالی علاقوں کی کونسل کا انتخاب کیا گیا ہے۔ ان کا انتظام وانصرام بھی حکومت پاکستان کے ہاتھ میں ہے۔ درج بالا اعداد وشمار سے یہ واضح ہے کہ اس وقت بھی کشمیر میں مسلمان 77% جب کہ غیر مسلم 23% ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ کشمیر کے ایک مسئلہ بننے کی بنیادی ذمہ داری اصلاً مسلم لیگ پر عائد ہوتی ہے۔ تقسیم سے پہلے بھارت اور پاکستان کی سرحد پر واقع تمام خودمختار ریاستوں کے مستقبل کے بارے میں کانگریس کا نقطہ نظر یہ تھا کہ ہر جگہ کے عوام کی رائے کی بنیاد پر ان کو بھارت یا پاکستان میں شامل کیا جائے۔ اس کے برعکس مسلم لیگ کا نقطہ نظر یہ تھا کہ یہ ہر ریاست کے حکمران کی اپنی صوابدید پر ہے کہ وہ بھارت یا پاکستان میں شامل ہونا چاہے یا آزاد رہنا چاہے۔ مسلم لیگ کا یہ موقف غیر اصولی اور غیر جمہوری تھا۔ اور اصلاً اسی موقف کی وجہ سے ریاست کپورتھلہ اور کشمیر پاکستان کے ہاتھ سے نکل گئے۔

پنجاب کی تقسیم کے بارے میں کانگریس کا موقف یہ تھا کہ فیصلے کا اختیار برطانوی فیڈرل کورٹ کو ہونا چاہیے۔ ماونٹ بیٹن کی تجویز یہ تھی کہ اقوام متحدہ کے ایک کمیشن کو فیصلے کا اختیار دیا جائے۔ اس کے برعکس مسلم لیگ کی تجویز یہ تھی کہ سر سائیرل ریڈکلف کو چیئرمین بنایا جائے اور

Marfat.com

اسے فیصلہ کن ووٹ کا اختیار بھی دیا جائے۔ بالآخر اس تجویز کو منظور کر لیا گیا اور ریڈکلف نے ضلع گورداس پور کی چار میں سے تین تحصیلیں بھارت کے حوالے کر دیں۔

قیام پاکستان کے بعد بھی پاکستان نے اس مسئلے کے حل کے کئی مواقع ضائع کر دئے۔ بھارت کی طرف سے تجویز آئی کہ حیدر آباد ہم لے لیتے ہیں، کشمیر آپ لے لیں، مگر پاکستان نے اس سے انکار کیا۔ نتیجۃً دونوں ہاتھ سے گئے۔ اس کے بعد پاکستان نے بلا ضمانت مغربی بلاک میں شمولیت اختیار کی، جس کی وجہ سے بھارت کو اقوام متحدہ کی قراردادوں سے راہِ فرار اختیار کرنے کا موقعہ ملا۔ 1962 میں بھارت چین لڑائی میں بھارت بری طرح پھنس گیا تھا۔ مگر پاکستان نے اس موقعہ سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔

کشمیر کے متعلق اقوام متحدہ کی بارہ قراردادوں، جو جنوری 1948 سے لے کر دسمبر 1957 کے درمیان میں منظور کی گئیں، میں کئی قراردیں عملاً بھارت کے حق میں اور نظری طور پر پاکستان کے حق میں ہیں۔ یہ تمام قراردیں شیڈول سات سے تعلق رکھتی ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی نوعیت اصل میں سفارشی ہے۔ فریقین میں سے کوئی بھی اسے ماننے سے انکار کر سکتا ہے اور ان پر عمل درآمد لازمی نہیں ہے۔

اگست 1988 میں مجاہدین نے بھارتی افواج کے خلاف مسلح آپریشن شروع کیا۔ اس کے بعد سے لے کر آج تک بھارت کے خلاف مسلح جدوجہد جاری ہے۔ اس مسلح جدوجہد میں چالیس ہزار سے لے کر اسی ہزار تک کشمیری اور دوسرے مسلمان شہید ہو چکے ہیں۔ جب کہ اِسی عرصے میں دس ہزار سے زیادہ بھارتی فوجی بھی لقمہ اجل بن چکے ہیں۔ اس وقت وادی کشمیر اور بعض شورش زدہ علاقوں میں تقریباً سات لاکھ بھارتی فوجی موجود ہیں۔ اسی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ زخمیوں کی تعداد کتنی ہوگی اور جان و مال و عزت و آبرو کے دوسرے نقصانات کتنے ہونگے۔ اس مسلح جدوجہد کے چند نمایاں تجزیاتی پہلو درج ذیل ہیں۔

☆ اس جدوجہد میں پندرہ کے قریب بڑی اور پچاس سے زیادہ چھوٹی تنظیمیں جان

Marfat.com

بازی، بہادری اور سرفروشی کی ایک بڑی داستان رقم کر رہی ہیں۔اگرچہ ان کے درمیان ڈھیلے ڈھالے اتحاد بھی قائم ہوتے رہے ہیں۔تاہم یہ بات بالکل واضح ہے کہ جہاں اتنی بڑی تعداد میں مسلح تنظیمیں موجود ہوں، وہاں ان کی آپس میں مناقشت یقیناً موجود ہوگی۔اور جب دو تنظیموں کے پاس اسلحہ بھی موجود ہو، وہاں مسلح جھگڑے بھی خارج از امکان نہیں۔

☆ان میں سے کئی تنظیموں کے درمیان صرف قیادت کا جھگڑا ہے۔جب کہ بعض تنظیمیں ایک دوسرے سے بہت نظریاتی اختلاف رکھتی ہیں۔کئی تنظیمیں خالصتاً مسلک کی بنیاد پر وجود میں آگئی ہیں۔وہ مسلح مزاحمت کے ساتھ ساتھ اپنے مسلک کی توسیع اور دوسرے مسالک کی تغلیط کا کام بھی سرگرمی کے ساتھ کر رہی ہیں۔ایک اہم تنظیم ''لشکر طیبہ'' کے ماہانہ مجلّہ ''الدعوۃ'' کے چند شمارے پڑھنے سے اس کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے۔

☆اس تحریکِ مزاحمت میں شامل افراد کی ایک بڑی تعداد خود کشمیری نوجوانوں پر مشتمل ہے۔تاہم اس میں پاکستانی نوجوان بھی موجود ہیں۔بہت سی جہادی تنظیموں کے دفاتر پاکستان میں قائم ہیں۔وہ نوجوانوں کو کشمیر کی آزادی کے مقدس مشن کے لئے بھرتی کرتی ہیں۔آئے دن اخبارات میں ان پاکستانی نوجوانوں کی شہادت کی خبریں شائع ہوتی ہیں۔بھارت الزام لگاتا ہے کہ آئی ایس آئی ان تمام تنظیموں کو اسلحہ اور تربیت فراہم کر رہی ہے۔اور ان کو سرحد پار کروانے کا کام بھی وہی کر رہی ہے۔پاکستان اس الزام کی تردید کرتا ہے۔تاہم بیرونی دنیا اس معاملے میں عام طور پر بھارت کی ہم نوا ہے۔

پاکستان اور کشمیر کے حوالے سے اس جدوجہد کے مثبت اور منفی اثرات

پاکستان اور کشمیر کے حوالے سے اس جدوجہد کا مثبت اثر یہ ہے کہ دو دہائیوں سے سرد خانے میں پڑا ہوا کشمیر کا مسئلہ ایک دفعہ پھر دنیا کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔دنیا کو یہ معلوم ہو گیا ہے کہ کشمیری مسلمان موجودہ حالت پر رضامند نہیں ہیں۔اور یہ کہ اس مسئلے کے حل کے بغیر حالات معمول پر نہیں آسکتے۔

Marfat.com

اس کا منفی اثر یہ ہوا ہے کہ دنیا کی نظر میں ایسی تحریک پاکستان کی سرگرم سرپرستی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔اس لئے پاکستان پر یہ الزام لگ رہا ہے کہ وہ بین الاقوامی معاہدوں کی خلاف ورزی کررہا ہے۔اور وہ اس مسئلے کو پرامن طور پر حل کرنے کے بجائے مسلح تنظیموں کے ذریعے شورش پھیلا کر دہشت گردی کو فروغ دے رہا ہے۔

معاہدہ لاہور، جنگ کارگل اور معاہدہ واشنگٹن

یہ بات معلوم ہے کہ پاکستان کی دونوں بڑی سیاسی جماعتیں مسلم لیگ اور پیپلز پارٹی چاہتی ہیں کہ اس مسئلے کا جلد از جلد کوئی حل نکل آئے۔غیر سرکاری طور پر وہ اس کے ایسے حل پر بھی آمادہ ہیں جس میں بھارتی کشمیر کے مسلمانوں کو بھارت کے اندر رہتے ہوئے مکمل خودمختاری مل جائے۔پاکستان کے چار مزید بڑے سیاسی گروپ یعنی، اے این پی، ایم کیو ایم، بلوچستان کے نیشنلسٹ رہنما اور جمعیت العلمائے اسلام فضل الرحمن گروپ بھی اس سے ملتے جلتے کسی بھی حل پر آمادہ ہیں۔البتہ مسلم لیگ کا نوائے وقت گروپ، فوج، جماعت اسلامی اور کچھ اہم مذہبی رہنما پورے کشمیر (بشمول جموں و لداخ کے غیر مسلم اکثریتی علاقے) کے استصواب رائے اور اس کے نتیجے میں پاکستان سے الحاق کو اس مسئلے کا حل سمجھتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ محترمہ بے نظیر بھٹو کی وزارت عظمیٰ کے دور میں جولائی 1989 میں بھارتی وزیراعظم راجیو گاندھی کی پاکستان آمد کے موقع پر مسئلہ کشمیر لو پروفائل میں رہا۔اس کے بعد جب فروری 1999 میں بی جے پی سے تعلق رکھنے والے بھارتی وزیراعظم واجپائی پاکستان میں میاں نواز شریف کی دعوت پر پاکستان آئے اور معاہدہ لاہور پر دستخط ہوئے تو اس پوری صورت حال (Scenario) کے متعلق دو بالکل متضاد اطلاعات ہیں۔میاں نواز شریف کے قریب ترین حلقوں کے مطابق اس امر پر اتفاق رائے ہو چکا تھا کہ وادی کشمیر (جموں اور لداخ کے بغیر) کو مکمل خودمختاری دی جائیگی۔اس کا اپنا وزیراعظم، جھنڈا اور کرنسی ہوگی۔اختلاف صرف اس بات پر تھا کہ وادی کی خارجہ پالیسی اور دفاع کا کیا انتظام کیا جائے۔یہ بھی طے پایا تھا کہ اگلے ایک

Marfat.com

سال کے اندر ان دونوں مسائل کا حل بھی تلاش کر لیا جائے گا اور یہ کہ ان سب امور کو آخری لمحے تک خفیہ سفارتکاری کے ذریعے طے کیا جائے گا۔

اس کے بالکل برعکس ایک دوسرے حلقے کا یہ کہنا ہے کہ ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ میاں نواز شریف اس مسئلے کو اٹھانے میں دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔ اسی لئے معاہدہ لاہور کے ابتدائی مسودے میں اس کا ذکر بہت بے جان الفاظ میں کیا گیا تھا۔ اور فوجی سربراہ کے اصرار پر ان الفاظ میں ردوبدل کر دیا گیا۔ مستقبل ہی میں ہمیں معلوم ہو سکے گا کہ کونسی بات صحیح تھی۔

اس کے بعد مئی 1999 میں جنگِ کارگل پیش آ گئی۔ اس جنگ کے متعلق بھی دو بالکل مختلف نقطہ ہائے نظر میں ہیں۔ ایک نقطہ نظر یہ ہے کہ چونکہ طاقت ور اسٹیبلشمنٹ نے معاہدہ لاہور کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا تھا۔ اس لئے اس نے سیاسی حکومت سے بالا ایک پلان تیار کیا۔ اس پلان کے مطابق کارگل کے علاقے میں اس تمام علاقے پر دوبارہ قبضہ مقصود تھا جو معاہدہ شملہ کے تحت بھارت کے قبضے میں رہنے دیئے گئے تھے۔ چنانچہ ان مہینوں میں جب کہ سردی اور برف باری کی وجہ سے کارگل کی چوکیاں خالی ہوتی تھیں، پاکستانی فوج نے لائن آف کنٹرول پار کر کے ان پر قبضہ کر لیا۔ اس وقت سیاسی قیادت کو صرف یہی بتایا گیا کہ پاکستانی فوج اس علاقے میں کنٹرول لائن کے اپنی طرف فوجی مشقیں کر رہی ہیں۔ مئی کے پہلے ہفتے میں بھارتی وزیر اعظم نے پاکستانی وزیر اعظم کو فون کر کے اس صورت حال سے آگاہ کیا۔ یہ پہلا موقعہ تھا جب پاکستانی وزاعظم کو یہ معلوم ہوا کہ پاکستانی فوج نے لائن آف کنٹرول کو پار کر لیا ہے۔ مگر اس وقت ان کے لئے کچھ بھی کرنا ممکن نہیں تھا۔ جب پوری دنیا کی توجہ اس لڑائی کی طرف مبذول ہو گئی اور جب امریکن سیٹلائٹ کی تصویروں کی وجہ سے پاکستان کے لئے ان چوکیوں تک اسلحہ اور سامان رسد پہنچانا ناممکن ہو گیا تو فوجی قیادت نے نواز شریف سے درخواست کی کہ وہ کلنٹن کو درمیان میں لا کر جنگ بندی کروائیں اور یہ ضمانت حاصل کریں کہ پاکستانی فوج کے پیچھے ہٹتے وقت اس پر حملہ نہیں کیا جائے گا۔ چنانچہ نواز شریف کو واشنگٹن جانا پڑا اور لائن آف کنٹرول کے احترام کے وعدے

Marfat.com

کے بدلے پاکستانی فوج کے پرامن پیچھے ہٹنے کی ضمانت حاصل کرلی۔

اس کے بالکل برعکس دوسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ نواز شریف کو اس آپریشن کے بارے میں پہلے دن سے ہی اعتماد میں لیا گیا تھا۔ واشنگٹن بھی نواز شریف از خود گئے۔ فوج نے تو مستقل طور پر سیاسی حکومت کے فیصلوں کے مطابق عمل کیا۔

اِن دو نقطہ ہائے نظر میں کونسا صحیح ہے۔ اس کا فیصلہ بھی مستقبل قریب کی تاریخ میں ہو جائے گا۔ البتہ بیرونی دنیا بالعموم پہلے نقطہ نظر کو صحیح سمجھتی ہے اور اس کے حق میں کئی شواہد پیش کرتی ہے۔

معرکہ کارگل نے بھارت کو بہت زیادہ فائدہ اور پاکستان کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ اس پورے معرکے کے دوران میں بھارت کے اندر اپنی حکومت کے لئے بہت جوش وخروش اور اتحاد دیکھنے میں آیا۔ اس کے برعکس پوری دنیا نے پاکستان کو وعدہ خلاف، جھوٹا اور ناقابل اعتماد ملک قرار دیا۔ چین اور سعودی عرب جیسے دوست ممالک نے اس آپریشن پر ناراضگی کا اظہار کیا۔ فوجی اعتبار سے بھی پاکستان گھاٹے میں رہا اور اس آپریشن کے بعد ان علاقوں میں بھارت کا قبضہ پوری طرح مستحکم ہو گیا۔ اس آپریشن پر پاکستان کے پچاس ارب روپے خرچ ہوئے۔

معاہدہ واشنگٹن سے بھی پاکستان ایک کمزور اور امریکہ کے طفیلی ملک کی حیثیت سے سامنے آیا۔ یہ ایک ایسا معاہدہ تھا جس میں بھارت سرے سے موجود ہی نہیں تھا۔ ایسے معاہدے اور پاکستانی فوج کی بحفاظت واپسی کی ضمانت کے لئے پاکستانی وزیراعظم کو واشنگٹن جانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ یہیں سے امریکی صدر اور بھارتی وزیراعظم کے ساتھ گفتگو کر سکتے تھے اور حفاظت واپسی کی ضمانت حاصل کر سکتے تھے۔ کیونکہ ایسی واپسی خود بھارت کے مفاد میں تھی۔

موجودہ حالات میں چند اہم حقائق

مناسب ہے کہ اس وقت دنیا کے حالات، برصغیر کی صورت حال اور خود کشمیر کے اندر

Marfat.com

جن نئے حقائق نے جنم لیا ہے ان کو زیر بحث لایا جائے۔

☆ بھارتی کشمیر مکمل طور پر مذہبی گروپوں میں تقسیم ہو چکا ہے۔ مسلمان بحیثیت مجموعی بھارت کے خلاف ہیں اور غیر مسلم بھارت کے حق میں ہیں۔ وادی کشمیر سے زیادہ تر غیر مسلم جموں یا بھارت جا چکے ہیں۔ مسلمانوں کی اصل آبادی وادی میں ہے۔ اگرچہ ضلع کارگل اور بعض دوسرے علاقوں میں بھی مسلمان بڑی تعداد میں ہیں۔

☆ جموں میں اب ہندو فیصلہ کن اکثریت میں ہیں۔ لداخ میں بدھ مت کے پیروکار اکثریت میں ہیں۔ ہندو اور بدھ پوری طرح بھارت کے ساتھ ہیں۔

☆ بھارت کے لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ پورے کشمیر یا اس کے کسی حصے کی اپنی ریاست سے کامل علیحدگی قبول کر لے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ بھارت کے اندر علیحدگی کی کئی تحریکیں کام کر رہی ہیں۔ اس سے ان کو یوں مہمیز ملے گی کہ بھارت کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے کا خطرہ پیدا ہو جائے گا۔ ظاہر ہے کہ کوئی ریاست بھی بقائمی ہوش و حواس ایسا فیصلہ نہیں کر سکتی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ایسا فیصلہ کرنے کے لئے بھارتی آئین میں ترمیم ضروری ہے جس کے لئے دو تہائی اکثریت چاہیے۔ گویا عملاً ایسا فیصلہ تب ہو سکتا ہے جب بھارت کی سب بڑی پارٹیاں اس پر متفق ہو جائیں۔ بھارت کے اندر سیاست میں جیسی پولرائزیشن ہے اس کے پیش نظر یہ ممکن نہیں ہے۔

☆ پاکستان کے لئے بھی موجودہ حالت کو جوں کا توں قبول کرنا ممکن نہیں ہے۔ پاکستان نے کشمیری مسلمانوں کے لئے پچاس سال تک قربانی دی ہے۔ چنانچہ ان کو ریلیف ملے بغیر پاکستان کے لئے بھی اس مسئلے پر خاموش بیٹھ جانا ممکن نہیں ہے۔

☆ اس مسئلے نے بھارت اور پاکستان دونوں ریاستوں کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ لیکن بھارت کی نسبت اس سے پاکستان کو کہیں زیادہ نقصان پہنچا ہے۔ پاکستان میں جمہوریت کی بنیادیں جو مستحکم نہیں ہو سکیں، یہ جو پاکستان پر بیرونی و اندرونی قرضوں کا بوجھ آ پڑا ہے، یہ جو ہم تعلیم اور صحت کی طرف کما حقہ توجہ نہیں دے سکے، یہ جو یہاں دفاع پر بجٹ کا بیشتر حصہ

Marfat.com

خرچ ہوتا ہے۔ان کے عوامل میں سب سے بڑا عامل کشمیر کا مسئلہ ہے۔ بھارت کو بھی اس مسئلے سے نقصان پہنچا ہے لیکن ایک بڑا ملک ہونے کے ناطے وہ ان کو جذب کرنے میں نسبتاً کامیاب رہا ہے۔

☆اس وقت یہ بڑی طاقتوں کے مفاد میں ہے کہ بھارت اور پاکستان میں کوئی سمجھوتہ ہو جائے۔اس لئے کہ اب یہ دونوں طاقتیں ایٹمی صلاحیت کی حامل بھی بن گئی ہیں اور دونوں کے درمیان اس مسئلے پر اگر کبھی جنگ چھڑ جائے تو اس کے بہت خوفناک نتائج بھی نکل سکتے ہیں۔تاہم بین الاقوامی طاقتوں میں سے کوئی بھی اس پوزیشن میں نہیں کہ وہ ان دونوں ملکوں پر کوئی حل مسلط کر سکے۔

☆پاکستان اور بھارت کے درمیان جنگ دونوں ملکوں میں سے کسی کے بھی مفاد میں نہیں۔فی الوقت پاکستان کے پاس لڑنے کے لئے زیادہ سے زیادہ چالیس دن کا روایتی اسلحہ ہے جب کہ بھارت کے پاس اسی (80) دن تک لڑنے کا اسلحہ موجود ہے۔گویا جب بھی لڑائی شروع ہوئی تو چند ہفتے بعد دونوں کو جنگ بندی پر مجبور ہونا پڑے گا۔جہاں تک ایٹمی اسلحہ استعمال کرنے کا سوال ہے تو اس کو دونوں میں سے کوئی بھی ملک پسند نہیں کرے گا۔اس لئے کہ اس سے دونوں تباہ ہو جائیں گے۔اور اس سے جو کچھ بچ جائے گا،اس پر بڑی طاقتیں آ کر قبضہ کر لیں گے۔یوں کشمیر پر لڑتے لڑتے سارا برصغیر اپنے آپ کو تباہ کر دے گا۔

☆جہاں بھارت کا روس سے دفاعی معاہدہ موجود ہے۔وہاں فی الوقت کشمیر کے مسئلے پر کوئی بھی ملک پاکستان کی پشت پر نہیں کھڑا۔مسلمان ممالک بڑی نیم دلی سے پاکستان کی حمایت کر رہے ہیں۔اور ان کے تجارتی تعلقات پاکستان کی نسبت بھارت سے کہیں زیادہ ہیں۔چین بھی اپنی مجبوریوں کی وجہ سے ایک حد سے زیادہ پاکستان کی مدد نہیں کر سکتا۔اسی لئے 1985,1971,1965 سمیت کارگل کے معرکے تک وہ پاکستان کی عملی مدد نہیں کر سکا۔

☆امریکہ کے لئے بھارت اور پاکستان دونوں اہم ہیں۔ بھارت اس کے لئے ایک

Marfat.com

بہت بڑی منڈی ہے۔وہ کلچر کے اعتبار سے بھی اس سے قریب تر ہے۔دوسری طرف امریکہ پاکستان کو بھی نظر انداز نہیں کرسکتا۔اس لئے کہ پاکستان عالم اسلام اوراس خطے کا سب سے اہم ملک ہے۔چنانچہ امریکہ کشمیر کے مسئلے پر ہمیشہ افہام وتفہیم کی پالیسی اپنائے گا۔

☆کشمیر میں جاری مسلح جدوجہدِ آزادی کو بھارت دہشت گردی کے روپ میں پیش کرنے کی سرتوڑ کوشش کررہا ہے۔اوراس کوشش میں اسے کافی کامیابی بھی ملی ہے۔دنیا عام طور پر یہ بات مانتی ہے کہ اس کی سرپرستی پاکستان کررہا ہے۔بھارت پاکستان کو بین الاقوامی معاہدوں کی خلاف ورزی کا موردالزام ٹھہرا رہا ہے۔چین بھی سنکیانگ کی مسلح کاروائیوں کو تشویش کی نگاہ سے دیکھ رہا ہے۔اس معاملے میں وہ پاکستان سے شاکی ہے۔

☆کشمیر کی مسلح جدوجہد کے پاکستان پر بھی کچھ اثرات مرتب ہورہے ہیں۔کلاشنکوف کلچر مزید بڑھ رہا ہے۔ہرمسلک وفرقہ نے اپنی اپنی مسلح تنظیم کھڑی کی ہے۔فرقہ پرستی بڑھ رہی ہے۔دلیل کے بجائے اسلحے کا استعمال روز افزوں ہے۔سوسائٹی میں عام طور پر تشدد کا رجحان بہت بڑھ گیا ہے۔

☆اگر حالات جوں کے توں رہے تو کیا کشمیر میں مسلح جدوجہد غیر معینہ مدت تک جاری رہ سکتی ہے؟اس سوال کا جواب آسان نہیں ہے۔پاکستان پر بین الاقوامی دباؤ کی مستقبل میں کیا صورت ہوتی ہے؟ کیا بھارت اور مجاہدین ایک دوسرے کو تھکا رہے ہیں؟اگر سری لنکا اور تامل،سوڈان اور جنوب کے عیسائی،ترکی اور کرد علیحدگی کی پسند ایک دوسرے کے مقابلے میں نہیں تھکے تو یہاں کون تھکے گا؟۔کیا بھارت اس کو اپنے عزت ووقار کی لڑائی بنا کر اسے اسی طرح قومی وحدت کا ذریعہ نہیں بنالے گا،جس طرح اس نے کارگل کی لڑائی کے موقعہ پر کرلیا تھا؟

☆پاکستان ہمارے لئے ایک بڑی نعمت ہے۔تاہم ہر نعمت کے کچھ ذیلی اثرات بھی ہوتے ہیں۔تقسیم برصغیر کے نتیجے میں پاکستان اور بنگلہ دیش کے تیس کروڑ مسلمان آزادی سے

Marfat.com

بہرہ ور ہوئے تاہم اس کے ایک لازمی نتیجے کے طور پر اس وقت پندرہ کروڑ مسلمان اقلیت کی حیثیت سے بھارت میں مقیم ہیں۔ بھارت کے یہ مسلمان کئی اعتبار سے کمزور ہیں۔ پاکستان کے مسلمانوں پر اپنی آزادی کا شکر بجالانا لازم ہے۔ اس شکر کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ہم اہلِ پاکستان ایسی پالیسیاں بنائیں جن سے بھارتی مسلمانوں کے حوصلے بڑھیں۔ ان کے اور بھارت کے غیر مسلموں کے درمیان نفرت کی فضا نہ بڑھے۔ وہ نسبتاً پرامن ماحول میں رہیں۔ تاکہ وہ اسلامی معاشرے کے مطابق جتنی بھی زندگی گزار سکیں، اس میں ہم ان کی مدد کریں۔

یہ ایک قابل تردید حقیقت ہے کہ پاکستان اور بھارت کی حکومتوں کے درمیان دشمنی جتنی بڑھتی جاتی ہے اور پاکستان کے اندر بھارت کے خلاف جتنے شدید جذبات ظاہر کئے جاتے ہیں، ان کا اثر بھارت کے اندر براہ راست وہاں کے مسلمانوں کے خلاف نفرت کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ بھارت کے پندرہ کروڑ مسلمانوں کے لئے تو یہ ممکن نہیں کہ وہ بھارت چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں۔ یوں اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ اپنی تمام کسمپرسی کے لئے پاکستان کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں۔ بھارت کے اندرونی سیاست میں ہندو انتہا پسندوں نے اسی مدت میں طاقت پکڑی ہے جس میں بھارتی کشمیر کے اندر مسلح کاروائیاں شروع ہوئی ہیں۔

اس کے برعکس بھارت اور پاکستان کے درمیان حالات جتنے زیادہ پُرامن ہوں، اتنی ہی بھارت کے مسلمانوں کے لئے زندگی آسان ہو جاتی ہے۔ ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم بھارتی مجبور مسلمانوں کے لئے آسانیاں فراہم کریں، نہ کہ ان کو مزید مشکلات میں مبتلا کریں۔ یاد رکھنے کے قابل بات یہ ہے کہ پاکستان کی آبادی سے زیادہ مسلمان بھارت کے اندر اب بھی ہماری آزادی کی قیمت مسلسل ادا کر رہے ہیں۔ چنانچہ کشمیر کے متعلق پاکستان کی پالیسی جتنی پرامن ہوگی اتنا ہی بھارتی مسلمانوں کو چین نصیب ہوگا۔

☆ وادی کی صورت حال یہ ہے کہ وہاں کے حریت پسند عوام سیاسی جدوجہد کے حوالے سے کم وبیش تیس تنظیموں میں تقسیم ہیں جن کا ایک ڈھیلا ڈھالا اتحاد آل پارٹیز حریت

Marfat.com

کانفرنس کے نام سے موجود ہے۔اب یہ اتحاد بھی دوحصوں میں تقسیم ہو چکا ہے۔ان پارٹیوں میں سے کوئی بھی دوسری کی قیادت قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔اس اتحاد کی قیادت ہر سال بدلتی ہے۔آزادی کی خواہش مند قوموں کو یہ لچھن زیب نہیں دیتے۔تحریک آزادی کا پہلا اصول ہی یہ ہے کہ تمام قوم ایک سیاسی پارٹی تلے،ایک ہی قیادت کی سرکردگی میں منظم ہو۔جو قوم یہ نہیں کر سکتی،اس کے لئے آزادی کا تصور ہی محال ہے۔اگر تقسیم کے وقت تمام غیر مسلم گاندھی کی قیادت قبول نہ کرتے اور تمام مسلمان قائداعظم کی شخصیت پر اعتماد کا اظہار نہ کرتے تو آزادی ناممکن تھی۔زمانہ قریب میں امام خمینی اور نیلسن منڈیلا کی جدوجہد کی کامیابی اسی کا اظہار ہے۔بوسنیا میں سب لوگ عالی جاہ عزت بیگوچ کی قیادت میں متحد ہوئے اور مسلمہ اعلیٰ ترین اخلاقی اقدار کے مطابق جدوجہد کر کے کامیابی حاصل کی۔

مسئلہ کشمیر کے منصفانہ حل اور ممکن حل میں فرق

ہر قوم اور علاقے کو اپنی مرضی کے مطابق زندہ رہنے کا غیر متزلزل اور ناقابلِ انکار حق حاصل ہے۔یہ بات اب ضمیرِ عالم میں ایک زندہ حقیقت ہے۔اس لئے اہل کشمیر کا بھی یہ حق ہے کہ وہ اپنی آزاد مرضی سے یہ فیصلہ کریں کہ وہ کس طرح جینا چاہتے ہیں۔درج بالا تجزیئے سے یہ بات واضح ہے کہ پورا کشمیر اب ایک اکائی نہیں ہے۔لداخ اور جموں سمیت تمام غیر مسلم اکثریتی اضلاع بھارت کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں۔جب کہ وادی اور ضلع کارگل کا مسلم اکثریتی ضلع بھارت کے ساتھ رہنا نہیں چاہتا۔اس لئے انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ وادی اور دوسرے مسلم اکثریتی علاقوں میں استصواب رائے کے ذریعے عوام سے پوچھا جائے کہ وہ بھارت کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں یا پاکستان کا حصہ بننا چاہتے ہیں یا ایک آزاد ملک بنانا چاہتے ہیں۔ایسے استصواب کے بعد جو بھی فیصلہ ہو،اس کو روح ومعنی کے ساتھ نافذ کیا جائے۔

مگر موجودہ حالات میں اس منصفانہ حل پر عمل ناممکن ہے۔دونوں ملک اس منصفانہ حل کو نہیں مان سکتے۔بھارت اس کو اپنے ٹکڑے ٹکڑے ہونے کی ابتدا سمجھتا ہے۔اور پاکستان کے

Marfat.com

لئے کشمیریوں کے کسی آزاد وطن کی بات خارج از بحث ہے۔ چنانچہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا کوئی ایسا ممکن، قابل عمل اور حقیقت پسندانہ حل موجود ہے۔ جس پر بھارت اور پاکستان دونوں متفق بھی ہو سکیں، جس سے کشمیری مسلمانوں کی حالت بھی سدھر سکے، جو انصاف سے قریب تر ہو اور جس سے دونوں ملکوں کا قومی وقار مجروح بھی نہ ہو۔

ایک حل یہ ہے کہ بغیر رائے شماری کرائے مسلم اکثریتی اضلاع مثلاً پوری وادی، ضلع کارگل اور ضلع پونچھ پاکستان کو دے دئے جائے اور جموں اور لداخ بھارت کے ساتھ رہیں۔ دریائے چناب کو سرحد تسلیم کرنے والا حل بھی اس سے ملتا جلتا ہے۔ یہ ایک نسبتاً بہتر حل ہے۔ تاہم بھارت کی طرف سے اس کو قبول کرنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ کیونکہ کوئی ملک اپنی حدود میں ردوبدل پر صرف اسی وقت رضامند ہوتا ہے جب وہ پے در پے بحرانوں کے نتیجے میں کمزوری کی آخری حد کو پہنچ جاتا ہے، سیاسی خلاء کی وجہ سے ملکی قیادت بالکل ڈانوں ڈول ہوتی ہے اور اس کے حصے بخرے ہونے کا عمل شروع ہو چکا ہوتا ہے۔ اگر کبھی بھارت پر ایسا وقت آیا تو اس وقت وہ نہ صرف کشمیر کے حل پر رضامند ہو جائے گا بلکہ خالصتان، ناگالینڈ اور اس طرح کی دوسری تحریکیں بھی ایک حقیقت بن جائیں گی۔ پچھلے پچاس برس میں بھارت پر تو ایسا وقت تو نہیں آیا البتہ پاکستان پر ایسا وقت آچکا ہے اور اس کے نتیجے میں ہم اپنے آدھے حصے سے ہاتھ دھو چکے ہیں۔

اس حل کا ایک منفی نکتہ یہ ہے کہ اس کے روبہ عمل آنے سے بھارت میں مسلمانوں کے خلاف نفرت اور غیض وغضب میں انتہائی اضافہ ہو جائے گا۔ بھارت کے ہندو مستقلاً اس غم وغصہ میں رہیں گے کہ جب بھی مسلمانوں کو موقعہ ملے گا، وہ اس ملک کے مزید ٹکڑے کرنے سے دریغ نہیں کریں گے۔ اس نفسیاتی کیفیت کے نتیجے میں وہاں کے مسلمان مسلسل دفاعی پوزیشن اور کسمپرسی کی صورت میں رہیں گے۔ وہ اپنی خراب حالت کے لئے پاکستان کو الزام دیں گے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جب سے مقبوضہ کشمیر میں مسلح جدوجہد شروع ہوئی ہے۔ تب سے بھارت میں

Marfat.com

بی جے پی مسلسل زور پکڑ رہی ہے۔

چنانچہ ہمیں کسی ایسے حل کے بارے میں سوچ بچار کرنا چاہیئے جس سے کشمیری مسلمانوں کی حالت بہتر ہو سکے، جو بھارتی مسلمانوں کے بھی مفاد میں ہو، جس سے بھارت کو اپنے حدود میں ردوبدل سے بھی نہ گزرنا پڑے اور جو پاکستان کے لئے بھی اطمینان کا باعث ہو۔ راقم الحروف کی رائے میں ایسے دو حل موجود ہیں۔ ایک یہ کہ پورے مقبوضہ کشمیر کو بھارتی آئین میں ایک دفعہ پھر خصوصی حیثیت دی جائے، اسے پوری اندرونی خودمختاری دی جائے۔ پاکستان کے ساتھ اس کے بارڈر پر خصوصی آسانیاں فراہم کی جائیں۔ اس خصوصی حیثیت کو پاکستان اور بھارت کے درمیان سمجھوتے کا حصہ بنا دیا جائے اور اس میں اقوام متحدہ ضامن بن جائے۔ گویا آئینی طور پر مقبوضہ کشمیر بھارت کا حصہ رہے گا، تاہم اسے اپنے اندرونی معاملات میں پوری خودمختاری حاصل ہوگی۔ دوسرا حل بھی اس سے ملتا جلتا ہے۔ وہ یہ کہ وادی اور دوسرے مسلم اکثریتی اضلاع پر مشتمل ایک نیا صوبہ ریاستِ کشمیر کے نام سے تخلیق کیا جائے۔ جموں اور لداخ کو اس سے علیحدہ کیا جائے۔ اور اس مسلم اکثریتی صوبے کو کامل اندرونی خودمختاری دی جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ کنٹرول لائن کو بین الاقوامی لیکن کھلی سرحد کے طور پر تسلیم کرلیا جائے۔ کامل اندرونی خودمختاری کے ضمن میں چند ایک سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ کیا اس ریاست کے سربراہ کو صدر یا وزیر اعظم کہا جائے یا نہیں۔ کیا اس ریاست کو بیرونی ممالک سے ازخود سمجھوتے کرنے کی آزادی ہو یا نہیں۔ کیا اس کو اپنا پاسپورٹ اور ویزا جاری کرنے کی اجازت ہو یا نہیں۔ تاہم یہ سب سوالات ضمنی ہیں اور ان پر باہمی گفت وشنید کے ذریعے تسلی بخش سمجھوتہ ہو سکتا ہے۔

راقم کے نزدیک درج بالا حل تمام فریقوں کے لئے باعث اطمینان ہو سکتا ہے۔ کشمیریوں کے لئے یہ اس اعتبار سے باعث تشفی ہوگا کہ اس سے وہ اپنی امنگوں اور آرزوؤں کے مطابق ایک خوبصورت معاشرے کی تعمیر کر سکیں گے۔ عملی طور پر ان پر کوئی قدغن نہیں

Marfat.com

ہوگی۔ بین الاقوامی سرحد کے باوجود دونوں طرف کے کشمیری ایک دوسرے سے روابط رکھ سکیں گے۔ اگر چہ وہ آزادی سے ایک قدم پیچھے ہونگے تاہم وہ عملی طور پر آزاد ہونگے۔ اور اگر وہ اپنے ہاں کامل جمہوریت لے آئیں تو پھر تو وہ اپنی قسمت کے کلیۃً خود ہی مالک ہونگے۔ اس حل کا پاکستان کو یہ فائدہ ہوگا کہ پاکستان کا اصل مطمح نظر تو یہ ہے کہ کشمیری مسلمان جبر اور گھٹن کی فضا سے نکلیں۔ وہ خود اپنا معاشرہ بنا سکیں۔ ان پر بھارتی دباؤ نہ ہو۔ قیام پاکستان کا اصل مقصد بھی یہی تھا۔ کیبنٹ مشن پلان کو تسلیم کرکے قائداعظم نے سب کو یہ باور کرا دیا تھا کہ ان کی جدوجہد کا اصل مقصد جغرافیائی سرحدات کی توسیع نہیں بلکہ مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ ہے۔ اگر چہ اس حل سے کشمیر پاکستان کو نہیں مل جائے گا، تاہم وہ عملاً بھارت کے ہاتھ میں بھی نہیں رہے گا۔ اس سمجھوتے کے بعد یہ قوی توقع ہے کہ پاکستان بہت تیزی سے ترقی کرے گا۔

اس سے بھارت کو یہ فائدہ ہوگا کہ اپنی جغرافیائی سرحدات کی شکست وریخت سے گزرے بغیر اس کا اہم ترین مسئلہ حل ہو جائے گا۔ اگر چہ بھارت کو اندرونی خودمختاری دینے کا بظاہر کڑوا گھونٹ پینا پڑے گا تاہم آج کے جمہوری ممالک میں اندرونی خودمختاری ایک مسلمہ اور منصفانہ تصور ہے۔ جس سے کسی کی سبکی نہیں ہوتی۔ بھارت بھی ایک غریب ملک ہے۔ اگر اسے کامل اندرونی خودمختاری کی قیمت پر اس مسئلے سے نجات ملے تو یہ اچھا سودا ہے۔

راقم کے نزدیک اس حل سے مزید دو عظیم فواید متوقع ہیں۔ ایک یہ کہ اس سے بھارتی مسلمانوں کو ایک بڑی سپورٹ مل جائے گی۔ بھارتی مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے یہ ضروری ہے کہ بھارت کے اندر کسی ایک صوبے میں مسلمانوں کی اکثریت ہو اور وہاں مسلمانوں ہی کی حکومت قائم ہو۔ ایسے صوبے اور اس کی حکومت سے بھارت میں آباد تمام مسلمانوں کی عزت نفس بحال ہوگی۔ پورے ملک میں جہاں بھی مسلمانوں سے کوئی زیادتی ہوگی، یہ صوبہ اس کے خلاف آواز اٹھا سکے گا۔ یوں ریاست کشمیر بھارتی مسلمانوں کے لئے تائید ونصرت کی حیثیت اختیار کر جائے گی۔ یہی صوبہ آگے چل کر بھارت کے اندر اسلام کی دعوت واشاعت کا مرکز بنے

Marfat.com

گا۔اس ملک کے اندر ہندو مسلم تعلقات میں بہتری آئے گی اور انتہا پسندی کی آوازیں کمزور سے کمزور تر ہوتی جائیں گی۔

اس حل کا دوسرا بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ ریاست کشمیر مستقبل میں بھارت اور پاکستان کے درمیان ایک پل کا کردار ادا کرے گی۔پاکستان اور بھارت نہ صرف ہمسائیگی بلکہ بھارت میں پندرہ کروڑ مسلمانوں کی وجہ سے ایک ایسے تعلق میں جڑے ہوئے ہیں،جس سے دونوں کی گلوخلاصی ناممکن ہے۔یہ انتہائی ضروری ہے کہ دونوں ملکوں کے درمیان اچھے برادرانہ تعلقات ہوں۔چنانچہ خودمختار کشمیر اس تعلق میں ایک پل کا کردار ادا کرے گا۔

اس حل کے ضمن میں ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس معاملے میں پہل کون کرے۔اپنی اپنی سیاسی مجبوریوں کے سبب سے پاکستان اور بھارت دونوں کے لئے اس معاملے میں پہل کرنا مشکل ہے۔اس لئے سب سے مناسب طریقہ یہ ہے کہ مسلمہ کشمیری رہنما اس ضمن میں متفقہ فارمولہ اور موقف بنا کر دونوں حکومتوں سے گفت وشنید شروع کردیں۔درحقیقت مسئلے کی حل کی اصل کلید خود بھارتی کشمیر کے رہنماؤں کے ہاتھ میں ہے۔

اگلا سوال یہ ہے کہ اگر بھارت نے یہ حل بھی ماننے سے انکار کردیا تو پھر کیا لائحہ عمل اختیار کیا جائے۔اس کا جواب یہ ہے کہ اس صورت میں یہ لازم ہے کہ مقبوضہ کشمیر کے تمام مسلمان اپنی علیحدہ علیحدہ سیاسی شناخت ختم کر کے صرف ایک سیاسی تنظیم،ایک جھنڈے اور ایک قاید کے تحت منظم ہوں۔آج اُن کی تیس سیاسی تنظیمیں ہیں۔ہر کوئی اپنی الگ الگ بھانت بھانت کی بولی بول رہا ہے۔آل پارٹیز حریت کانفرنس ایک انتہائی ڈھیلا ڈھالا اتحاد ہے جس کا قاید ہر سال بدلتا رہتا ہے۔ایک عظیم مقصد حاصل کرنے کے لئے اس طرح کے چونچلوں سے کام نہیں بنتا۔اس کے لئے تو سب کو اپنی انا کی قربانی دینی پڑے گی۔اور اپنی اپنی سیاسی گروپ بندیاں چھوڑ کر ایک متفقہ پارٹی بنانی پڑے گی اور ایک متفقہ لیڈر چننا پڑے گا۔درحقیقت کشمیریوں کی جدوجہد کی آج تک ناکامی کی سب سے بڑی وجہ بھی یہی ہے اور موجودہ صورت حال کے جاری رہنے میں آئندہ

Marfat.com

بھی کامیابی کی کوئی امید نہیں کی جا سکتی۔

اگر کشمیری متحد ہو گئے اور خالصتاً پرامن سیاسی طریقوں سے انہوں نے اپنی جدوجہد جاری رکھی تو دنیا کی کوئی طاقت انہیں کامیابی سے دور نہیں رکھ سکتی۔ ایسی صورت میں پاکستان کے لئے صحیح لائحہ عمل یہ ہے کہ وہ کشمیروں کی سیاسی، سفارتی اور اخلاقی مدد جاری رکھے۔ تاہم وہ کسی طرح کی مسلح کاروائی میں ملوث نہ ہو۔ درحقیقت مسلح کاروائیاں، خواہ وہ پاکستان کی طرف سے ہوں یا کشمیریوں کی طرف سے، دین وحکمت دونوں اعتبار سے غلط ہیں۔ آج تک پاکستان نے کشمیر کے ضمن میں ہر فارمولا آزمایا ہے مگر ''قومی اتحاد'' کا فارمولا کبھی پاکستان نے آزمایا ہے نہ کشمیریوں نے۔ حالانکہ حل اسی کے اندر مضمر ہے۔

یہ قدم بھی ضروری ہے کہ پاکستان مسئلہ کشمیر کے حل کا انتظار کئے بغیر، بھارت کے ساتھ دوسرے تمام تصفیہ طلب امور پر اسی طرح سمجھوتے کرے جس طرح ''سندھ طاس معاہدہ'' ''اور معاہدہ رن کچھ'' ہو چکا ہے۔ اس سے مسئلہ کشمیر کی مرکزیت خود بخود نمایاں ہوگی اور ان دونوں ملکوں کے درمیان ہر نیا معاہدہ کشمیر کے حل کی طرف ایک پیش رفت ہوگا۔

Marfat.com

گیارھواں باب

مسئلہ افغانستان

مسئلہ افغانستان پر بحث سے پہلے یہ ضروری ہے کہ افغانستان کی پچھلی تاریخ کا بھی مختصراً جائزہ لیا جائے۔ظاہر شاہ 1933 میں بادشاہ مقرر کر دیئے گئے۔اس کے چالیس سال بعد 1973 میں ان کے چچازاد بھائی سردار داؤد نے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔اس کے پانچ برس بعد اپریل 1978 میں کمیونسٹوں نے اقتدار پر قبضہ کر لیا اور نور محمد ترکئی کو صدر بنایا گیا۔

ڈیڑھ سال بعد ستمبر 1979 میں کمیونسٹوں کے ایک اور دھڑے کے سربراہ اور وزیر دفاع حفیظ اللہ امین نے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔اس کے دور میں حالات بہت بگڑ گئے چنانچہ دسمبر 1979 میں روسی افواج افغانستان میں داخل ہو گئیں اور ببرک کارمل کو تخت پر بٹھادیا گیا۔اس کے ساتھ ہی امریکہ، پاکستان، چین اور عرب ممالک کے تعاون سے مجاہدین نے باقاعدہ مزاحمت شروع کر دی۔

مجاہدین کے بیشتر رہنما سردار داؤد کے وقت سے ہی پاکستان میں مقیم تھے۔اس وقت ایک ہی تنظیم تھی جس کا نام ''جمعیت اسلامی'' تھا۔اس کے قائد برہان الدین ربانی اور سیکرٹری جنرل گل بدین حکمت یار تھے۔(ان دونوں رہنماؤں کو پہلی مرتبہ اس راقم نے 1974ء میں پشاور میں جماعت اسلامی کے صوبائی دفتر میں دیکھا تھا)۔چونکہ اس معرکے میں پاکستان ہی فرنٹ لائن ریاست تھی۔اس لئے پاکستان کا کردار اور اس کے فیصلے سب سے زیادہ اہمیت رکھتے تھے۔اُس وقت پاکستان میں جنرل ضیاء الحق کی حکومت تھی اور اس نے یہ فیصلہ کر لیا کہ افغانستان میں روسی مداخلت کی مزاحمت کرنی ہے۔کیا یہ فیصلہ صحیح تھا یا غلط؟ کیا یہ مناسب نہ ہوتا کہ پاکستانی حکومت روس سے گفتگو کر کے افغانستان کے متعلق اُسے یقین دہانیاں کرواتی اور اس طرح روسی فوج افغانستان سے نکل جاتی؟ یقیناً اُس وقت مناسب طریقہ کار یہ ہوتا کہ افغان مہاجرین کو سرحد

Marfat.com

کے دس کلومیٹر کے اندر اندر آباد کرلیا جاتا اور اقوام متحدہ کے ذریعے روس کو اس بات پر آمادہ کیا جاتا کہ وہ افغانستان سے نکل جائے۔ ممکن ہے کہ اس کے جواب میں یہ کہا جائے کہ اسی جنگ کے نتیجے میں تو روس ٹوٹ گیا۔ تاہم یہ بات صحیح نہیں۔ افغانستان کی جنگ میں روس کا نقصان اس کے بجٹ کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھا۔ درحقیقت افغانستان کی جنگ ہوتی یا نہ ہوتی، روس کو اپنے سسٹم کی اندرونی کمزوری کے تحت ٹوٹنا ہی تھا۔ اُس کے ٹوٹنے کی اصل وجہ کمیونزم کا اندرونی تضاد تھا جس کی وجہ سے گورباچوف اقتدار میں آیا اور جس نے گلاسناٹ اور پیرا سٹرائیکا جیسی اصطلاحات متعارف کروائیں۔

تاہم اگر اُس وقت پاکستان کو فوجی حکمت عملی اختیار کرنی تھی، تو اُس میں بھی پاکستان سے حکمت عملی کے میدان میں فاش غلطی ہوئی۔

دنیا کی تاریخ کے جنگی تجربات سے یہ متفقہ سبق ملتا ہے اور اسلامی تعلیمات کی بھی یہی ہدایت ہے کہ صرف وہی مسلح مزاحمت کامیاب ہوتی ہے جس کی ایک متفقہ تنظیم ہو، اس کا سیاسی نظم ہو اور فوجی تنظیم اس کے ماتحت ہو۔ اس کی پشت پر ایک مضبوط ریاست علی الاعلان کھڑی ہو۔ اس کا سب سے بہتر طریقہ یہ تھا کہ افغان مجاہدین کی ایک متفقہ جلاوطن حکومت بنتی۔ اسی کی سربراہی میں جنگ آزادی لڑی جاتی اور دوسرے ممالک مثلاً پاکستان، امریکہ وغیرہ سے وہی جلاوطن حکومت معاہدے کرتی۔ لیکن پاکستان نے اس کے برعکس طریقہ اختیار کیا۔ اور یہ کوشش کی کہ زیادہ سے زیادہ مجاہد تنظیمیں بنیں۔ چنانچہ کچھ تنظیمیں تو براہ راست بنائی گئیں۔ مثلاً حکمت یار نے ربانی سے الگ ہو کر 1979 میں حزب اسلامی قائم کرلی۔ مولوی یونس خالص نے حکمت یار سے اپنا دھڑا الگ کرلیا۔ پھر پروفیسر سیاف نے 1980 میں 'اتحادِ اسلامی' قائم کی۔ جناب مجددی نے 'جبہ نجات ملی' قائم کی۔ مولوی محمد نبی محمدی نے 'حرکت انقلاب اسلامی' قائم کی۔ پیر گیلانی نے 'محاذ ملی افغانستان' قائم کی۔ اس کے علاوہ اسی عمل سے شہ پا کر اہلِ تشیع کی بھی کئی تنظیمیں بن گئیں۔ پاکستان نے اس عمل کی خوب خوب حوصلہ افزائی کی۔ اس سے جنرل ضیاء کی حکومت کا اصل مقصد یہ

Marfat.com

تھا کہ تمام افغان تنظیمیں ایک خاص حد سے زیادہ طاقت ور نہ ہونے پائیں اور اس طرح پاکستان کے قابو میں رہیں۔فوجی حکومت کا خیال یہ تھا کہ اس طریقے سے اپنے مفادات کو مدنظر رکھتے ہوئے افغانستان کے بارے میں اصل فیصلے کا اختیار اس کے پاس رہے اور امریکی امداد میں وہ اپنا حصہ زیادہ سے زیادہ رکھ سکے گی۔اس وقت کے پاکستانی جرنیلوں کا یہ خیال تھا کہ آئندہ کے افغانستان کو پاکستان کی ایک طفیلی ریاست، بلکہ درحقیقت پاکستان کا پانچواں صوبہ بن کر رہنا ہے۔ اس کو وہ حربی گہرائی (Strategic Depth) کے نام سے پکارتے تھے۔یہ بہت خودغرضانہ، غلط اور بے اصولی پر مبنی مقصد تھا۔اور مستقبل کے تمام مسائل نے اسی فیصلے سے جنم لیا۔

ظاہر ہے کہ جب مختلف مسلح تنظیموں کے پاس وسائل، ڈالر اور اسلحہ موجود ہو تو علاقے پر قبضے کے لئے وہ آپس میں بھی لڑیں گی۔ چنانچہ یہ تمام تنظیمیں آپس میں بھی لڑتی رہیں اور روسیوں کے خلاف بھی لڑتی رہیں۔چونکہ مجاہدین کی کوئی جلاوطن حکومت موجود نہیں تھی اس لئے اقوام متحدہ کے تحت جنیوا مذاکرات میں ان کی نمائندگی نہیں تھی اور پاکستان کا نمائندہ موجود تھا۔گویا پاکستان نے تمام پتے اپنے پاس رکھنے کا فیصلہ کیا ہوا تھا۔یہی وجہ ہے کہ 1988 میں جنیوا معاہدے پر دستخط افغانستان کے ڈاکٹر نجیب اللہ کے نمائندے اور حکومت پاکستان کے ہوئے۔اگر اس کے بجائے یہی معاہدہ ڈاکٹر نجیب اللہ اور مجاہدین کی جلاوطن حکومت کے درمیان ہوتا تو پرامن انتقال اقتدار عمل میں آتا۔ہاں یہ بات ضرور ہے کہ وہ پاکستان کا پانچواں صوبہ بننے کے بجائے ایک آزاد افغانستان ہوتا۔

فروری 1989 میں روسی افواج افغانستان سے نکل گئیں اور اس کے بعد تین برس تک ڈاکٹر نجیب اور مجاہدین کے درمیان لڑائی جاری رہی۔مارچ 1992 میں کابل کے دفاع پر مامور جنرل رشید دوستم کی بغاوت کی وجہ سے احمد شاہ مسعود کو کابل پر قبضے کا موقعہ ملا۔اب ایک اور خونریز دور کا آغاز ہوا جس میں تمام مجاہدین تنظیمیں آپس میں لڑتی رہیں۔اگلے چار برس پورا افغانستان لاقانونیت، ظلم، بے انصافی اور طوائف الملوکی کی تصویر بنا رہا۔حتیٰ کہ اسی انارکی کے دوران میں

Marfat.com

طالبان نے جنم لیا۔گویا افغانستان کے حالات کی خرابی میں روسی افواج کی مداخلت کے بعد سب سے زیادہ کردار جنرل ضیاء کی غلط پالیسی کا تھا۔جماعت اسلامی بھی اس ذمہ داری میں شریک تھی کیونکہ جماعت اسلامی اس پورے دور میں اس پالیسی کی پشت پر رہی۔نیز تمام افغان مجاہد تنظیمیں بھی اس کی ذمہ دار ہیں۔اس لئے کہ ان میں سے کسی تنظیم کی قیادت نے افغانستان کے اتحاد اور اسلام کے ارفع واعلیٰ اصولوں کی خاطر اپنی انا کی قربانی نہیں دی۔

طالبان تحریک اصلاً اس انارکی کے خلاف عوام کے سب سے بڑے فعال طبقے یعنی دینی مدارس کے نوجوان طلبہ کا احتجاج اور بغاوت تھی۔یہ بنیادی طور پر ایک مقامی اور دیسی تحریک تھی۔تاہم اس کی پرداخت میں جنرل نصیر اللہ بابر، دیگر پاکستانی اداروں، سی آئی اے، تیل کمپنی یونی کال اور سعودی عرب نے بھی ایک بڑا کردار ادا کیا۔

طالبان نومبر 1994 میں نمودار ہوئے۔اسی مہینے میں قندھار پر قبضہ کرلیا اور اگلے دو سال کے اندر اندر یعنی ستمبر 1996 تک کابل پر بھی ان کا قبضہ ہوگیا۔اس دو سالہ لڑائی کے دوران میں خونریزی یقیناً ہوئی لیکن وہ اس سے پہلے اور اس کے بعد کی جنگوں کی لحاظ سے مقابلۃً بہت کم تھی۔یہ پورا علاقہ جس پر اب تک طالبان نے قبضہ کیا تھا، پشتون اکثریت کا علاقہ تھا، سوائے ہرات کے، جہاں تاجک اکثریت میں تھے۔واضح رہے کہ طالبان تحریک کی تقریباً تمام تر لیڈر شپ پشتونوں پر مشتمل تھی۔تحریک کے وقتاً فوقتاً پچاس بڑے لیڈروں میں سے صرف تین یا چار غیر پشتون تھے۔(وقتاً فوقتاً اس لئے کہ بسا اوقات ملا محمد عمر اپنی کابینہ میں یک دم کافی تبدیلیاں لے آتے تھے۔) اس کے بعد طالبان اگلے پانچ سال تک غیر پشتون علاقے فتح کرنے کی کوشش میں لگے رہے۔ان میں تاجک، ہزارہ اور ازبک علاقے شامل تھے۔ان علاقوں پر قبضہ کے لئے بہت خون ریزی ہوئیں۔ایک اندازے کے مطابق پانچ سالوں میں دوطرفہ لڑائی میں پچاس ہزار سے زیادہ افراد ہلاک ہوئے۔ان میں سے کئی علاقوں پر کئی کئی مرتبہ کامیابی اور پسپائی ہوئی۔مثلاً مئی 1997 میں طالبان نے مزار شریف پر قبضہ کرلیا اور پھر انہیں وہاں سے نکال دیا گیا۔اس کے

Marfat.com

بعد اگست 1998 میں طالبان نے ایک دفعہ پھر مزار شریف پر قبضہ کرلیا۔یہی حالت بہت سے دوسرے علاقوں کی رہی۔طالبان کی فیصلہ کن شکست تک یہ لڑائی جاری تھی۔پشتونوں اور غیر پشتونوں کے درمیان اس لڑائی میں دونوں طرف سے ایک دوسرے پر بہت مظالم بھی ڈھائے گئے۔مثلاً مزار شریف میں ستمبر 1997 میں دونوں گروپوں نے ایک دوسرے کے ہزاروں کی تعداد میں لوگ ہلاک کئے۔اس کے بعد جب اگست 1998 میں طالبان نے دوبارہ مزار شریف پر قبضہ کیا تو انہوں نے ہزاروں کی تعداد میں ہزارہ قبائل کا قتل عام کیا۔

اس مختصر تاریخ کے بعد یہ ممکن ہے کہ ہم ان اسباب کا کھوج لگائیں جن کی وجہ سے طالبان حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔اس زوال کی چند بنیادی وجوہات ہیں:

طالبان تقریباً تمام پشتونوں پر مشتمل تھے اور وہ سب صرف ایک ہی طبقے سے تعلق رکھتے تھے: یہ بالکل قدرتی بات تھی کہ طالبان نے پشتون علاقے میں جنم لیا۔ان کی تقریباً تمام لیڈرشپ اور تمام فوج بھی پشتونوں پر ہی مشتمل تھی۔یہ اس لئے تھا کہ تمام بدامنی دراصل زیادہ تر پشتون علاقے میں تھی۔طالبان کا ظہور دراصل اسی بدامنی کا ردعمل تھا۔ازبک،تاجک،ہزارہ اور دیگر علاقے پرامن تھے۔وہاں مستحکم اقتدار تھا۔اس لئے وہاں کوئی ردعمل بھی نہیں تھا۔یہی وجہ ہے کہ طالبان کو اصل کامیابی پشتون علاقے میں ہی ملی اور اس علاقے میں امن وامان کے قیام سے عوام نے سکھ کا سانس لیا۔اس کے بعد طالبان نے غیر پشتون علاقوں کا رخ کیا اور ان پر حملہ آور ہوئے۔یہ طالبان کی بہت بڑی غلطی تھی۔ان علاقوں میں عموماً امن تھا اس لئے طالبان کے حملے کا کوئی جواز نہ بنتا تھا۔ان علاقوں کے لوگ اور ان کی حکومتیں ممکن ہے طالبان کے معیار اسلام پر پوری نہ اترتی ہوں،تاہم یہ لوگ پوری اسلامی دنیا سے بہتر مسلمان تھے اور یہ بہت غیر مناسب تھا کہ ان پر فوج کشی کی جاتی۔جب ان علاقوں پر ایک ایسی فوج نے حملہ کیا جو ساری کی ساری پشتونوں پر مشتمل تھی اور جس کا ہرات کا سابقہ ریکارڈ یہ ظاہر کرتا تھا کہ اس نے مقامی انتظام وحکومت میں کوئی بھی غیر پشتون شامل نہیں کیا،تو اس سے قدرتی طور پر غیر پشتونوں نے یہی سمجھا

Marfat.com

کہ پشتون ان کو غلام بنانے آرہے ہیں۔ چنانچہ غیر پشتونوں نے اس کے خلاف نہایت سخت مزاحمت کی۔ اور آخر وقت تک طالبان اس قابل نہیں ہو سکے کہ اس پورے علاقے پر قبضہ کر سکیں۔

طالبان صرف ایک ہی طبقے یعنی دینی مدارس سے فارغ التحصیل طلبہ پر مشتمل تھے۔ انہوں نے حکومت میں کبھی کسی غیر طالب کو شامل نہیں کیا۔ حالانکہ اس طبقے سے باہر بھی بہت سے اچھے مسلمان موجود تھے۔ اس سے ایک نقصان یہ ہوا کہ طالبان کے اذہان وسیع نہ ہو سکے۔ اور اس کا دوسرا نقصان یہ ہوا کہ باقی تمام طبقات نے اپنے آپ کو طالبان کا محکوم سمجھ لیا۔

طالبان کے لئے مناسب حکمت عملی یہ تھی کہ ستمبر 1996 میں کابل اور پورے پشتون بیلٹ پر قبضہ کرنے کے بعد وہ یہ اعلان کرتے کہ وہ باقی تمام نسلی گروہوں اور طبقوں سے گفتگو کے ذریعہ ان کو بھی شریک اقتدار کریں گے۔ اگر وہ ایسا کرتے تو اُسی وقت افغانستان میں امن کی شروعات پڑ جاتیں۔ لیکن افسوس کہ انہوں نے ایسا نہیں کیا جس کے نتیجے میں افغانستان کے مزید پانچ برس خانہ جنگی کی نذر ہوئے اور مزید لاکھوں افراد موت کی بھینٹ چڑھ گئے۔

طالبان کا فہم اسلام:

طالبان نے اسلام کے فوری نفاذ کو اپنا نصب العین قرار دیا اور اس کو حاصل کرنے میں انہوں نے جو بے اعتدالیاں کیں وہ ہمیشہ کے لئے تاریخ کے صفحات پر ثبت ہو گئیں۔ اس معاملے میں ان سے کئی غلطیاں ہوئیں۔ یہ کہ انہوں نے اسلام کے نام پر ایسی چیزوں پر پابندیاں لگا دیں یا ان کے بجالانے کا حکم دیا جو کسی طرح بھی بنیادی احکام کے ضمن میں نہیں آتیں، جن کے جواز وعدم جواز پر فقہا کے درمیان بہت اختلاف رائے ہے اور جن کو قانون کے زور پر پچھلے چودہ سو برس میں کبھی بھی نافذ کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ حتیٰ کہ دورِ رسالتؐ اور دورِ خلفائے راشدین بھی ان امور کے ضمن میں کسی قسم کی قانون سازی یا سزاؤں سے خالی نظر آتا ہے۔ مثلاً طالبان نے موسیقی کو ممنوع قرار دیا۔ سب مردوں پر ایک مٹھی کی مقدار سے زیادہ داڑھی رکھنا لازم قرار دیا۔ ٹی وی اسٹیشن بند کردئے گئے۔ طالبان کا سب سے بڑا نشانہ عورتیں تھیں۔ طالبان نے جہاں بھی

Marfat.com

گئے، عورتوں کے سکول بند کر دیے گئے۔ عورتوں کا کسی مرد کے بغیر گھر سے نکلنا کلیتہ ممنوع کر دیا گیا حالانکہ محتاط ترین فقہا کے نزدیک بھی کوئی عورت ایک دن اور ایک رات تک گھر سے اکیلی باہر جا سکتی ہے۔ عورتوں کے لئے گھر سے باہر کام منع کر دیا گیا اور ان پر یہ لازم کر دیا گیا کہ وہ صرف اور صرف ایک خاص قسم کا نیلا برقعہ پہنیں گی۔ حجاب کے طور پر چادر لینے یا کسی بھی دوسرے برقعے کے پہننے پر پابندی لگا دی گئی۔ یہ وہ نیلا برقعہ ہے جسے صرف دیہاتی پشتون آبادی استعمال کرتی ہے۔ گویا طالبان نے اسلام کے نام پر افغانستان کے دیہاتی پشتون کلچر کو سارے ملک پر نافذ کیا۔

اسی طرح یہ لازم کر دیا گیا کہ تمام تعلیم یافتہ لوگ ہر وقت کالی پگڑی پہنیں گے۔ یہ درحقیقت دینی مدارس کے کلچر کو پورے افغانستان میں حاوی کرنے کی کوشش تھی، کسی بھی حکم کی خلاف ورزی پر عجیب سزائیں مقرر تھیں جن میں تحقیر، تمسخر اور تکبر کا پہلو نمایاں تھا۔ مثلاً فٹ بال کی پاکستانی قومی ٹیم کے تمام کھلاڑیوں کو، عین کھیل کے درمیان میں کھیل رکوا کر، غیر شرعی لباس پہننے کے جرم میں ان کے سر منڈوا دیے گئے۔ اس سے غیر مسلموں اور عام لوگوں کے سامنے اسلام کی جو تصویر بنی، اس کا اندازہ ہر ذی فہم آدمی لگا سکتا ہے۔ بدقسمتی سے طالبان نے اسلام کے نام پر، ہر وہ کام کیا جس میں خبریت تو موجود تھی مگر جس سے اسلام کا ایک غلط تاثر ابھرتا تھا۔ مثلاً بامیان میں بدھا کے مجسموں کا انہدام یا عیسائیت پھیلانے کے نام پر مختلف امدادی کارکنوں کی گرفتاری اور ان کے خلاف مقدمے وغیرہ۔

اس کے بجائے طالبان کو چاہیے تھا کہ وہ اسلام کے احکام کو اسی طرح نافذ کرتے جس طرح حضورؐ اور خلفائے راشدین نے نافذ کیا تھا۔ اس پورے دور میں صرف ایک مثبت چیز بتدریج لیکن بجبر نافذ کی گئی اور وہ تھی زکواۃ۔ اس کے علاوہ ہر ہدایت اور حکم کو ترغیب، تلقین اور ذہنی تربیت کے ذریعے نرمی اور محبت سے نافذ کرنے کی کوشش کی گئی۔ مختلف بڑے جرائم پر انتہائی سزائیں بھی صرف اسی وقت نافذ کی گئیں جب معاشرے کی پوری تربیت کی گئی اور جب ان جرائم کی طرف لے جانے والے عوامل تقریباً ختم ہو کر رہ گئے۔ حضورؐ کے زمانے میں حجاب کی کسی بھی خاص شکل کو

Marfat.com

نافذ نہیں کیا گیا اور کسی کو بھی اس طرح کی چیزوں کی خلاف ورزی پر کوئی سزا نہیں دی گئی۔ اس طرح خلفائے راشدین کے زمانے میں لاکھوں مربع میل کے علاقے فتح ہوئے، ہزاروں لاکھوں لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہوئے، مگر وہ پورا زمانہ داڑھی، حجاب اور اسی قبیل کے دوسرے امور کے متعلق سزاؤں سے خالی رہا۔ درحقیقت طالبان کا تجربہ نفاذ اسلام اپنی نوعیت کا منفرد تجربہ تھا جس کی پہلے کوئی مثال نہیں ملتی۔ اس کی وجہ سے خواتین اور عام لوگوں میں انقباض ولاتعلقی کی ایک کیفیت پیدا ہوگئی۔

طالبان کا یہ فہمِ اسلام اور اس ضمن میں ان کے اقدامات درحقیقت امریکہ اور مغرب کے بہت زیادہ مفاد میں تھے۔ اگر طالبان کی حکومت بن لادن کی سرپرستی نہ کرتی، تو امریکہ کو افغانستان پر حملہ کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔ درحقیقت اس طرح کے تعبیرِ اسلام کی وجہ سے مغرب کو یہ موقع ملتا ہے کہ وہ اپنے ذرائع ابلاغ پر اسلام کے خلاف خوب پروپیگنڈا کرے۔ چنانچہ اس طرح کے تعبیرِ اسلام پر مبنی حکومت مغرب کے مفاد میں ہوتی ہے کیونکہ اس طرح وہاں کے عوام اسلام سے متنفر ہوتے جاتے ہیں۔ اس کی ایک مثال سعودی عرب ہے۔ وہاں بھی سرکاری سطح پر کسی حد تک طالبان سے ملتا جلتا فہمِ اسلام ہے، تاہم مغرب کو اس حکومت سے کوئی خطرہ نہیں۔ مغربی ذرائعِ ابلاغ اس حکومت کی پالیسیوں کے خلاف پروپیگنڈے بھی کرتے ہیں اور امریکہ ان عرب ممالک سے اپنے سارے سیاسی فائدے بھی حاصل کرتا ہے۔

طالبان کے ہاں جمہوریت، آزادیٔ رائے اور اپنے مخالفین کے لئے انصاف، عفو و درگزر اور رواداری کا جذبہ مفقود تھا۔ اسی طرح ان میں رفاہ عامہ کے کاموں کے لیے بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اگر وہ ستمبر 1996 کے بعد ملک کے اندر مکالمہ پر مبنی حکمت عملی کی ابتدا کرتے اور اقوام عالم سے اس میں مدد کی اپیل کرتے تو شاید اب تک افغانستان کی کایا پلٹ چکی ہوتی اور طالبان غالب پارٹنرز کی حیثیت سے ایک خوبصورت، معتدل اسلامی افغانستان کے حکمران ہوتے۔ لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہوا۔

Marfat.com

القاعدہ کے متعلق طالبان کی پالیسی:

طالبان کی خارجہ پالیسی پہلے دن سے ہی دوسرے ممالک کے لئے تحقیر کی بنیاد پر قائم تھی۔دنیا بھر میں پاکستان ہی ان کا ساتھی تھا۔مگر پاکستان کی درخواست کے برعکس انہوں نے ڈیورنڈ لائن کو تسلیم کرنے سے انکار کیا۔ظاہر ہے یہ پاکستان کے وجود کو نہ ماننے کے مترادف ہے۔پاکستان کے بے شمار مجرموں، جن کے ہاتھ سینکڑوں فرقہ وارانہ قتلوں میں آلودہ تھے، نے طالبان کے ہاں پناہ لی تھی۔انہیں پاکستانی حکام کے حوالے کرنے سے مسلسل ٹال مٹول کا رویہ اختیار کئے رکھا۔یہی صورت حال ان کی القاعدہ تنظیم اور بن لادن کے بارے میں تھی۔

بن لادن 1980 میں افغانستان آئے۔اور دس برس بعد واپس سعودی عرب چلے گئے۔اگلے دو سال وہ سعودی عرب میں ہی مقیم رہے۔پھر 1992 میں وہ سوڈان چلے گئے۔وہاں چار برس رہنے کے بعد وہ مئی 1996 میں اپنے درجنوں ساتھیوں سمیت جلال آباد پہنچے۔اس وقت یہاں شمالی اتحاد اور طالبان کی کشمکش عروج پر تھی، تاہم بن لادن نے اس میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ان کے جلال آباد پہنچنے کے چار مہینے بعد وہاں طالبان کا قبضہ ہو گیا۔

سوال یہ ہے کہ 1990 میں افغانستان چھوڑنے کے چھ سال بعد وہ واپس کیوں آئے۔ظاہر ہے کہ وہ اس دفعہ نہ تو جہاد کے لئے آئے تھے، نہ ہی شمالی اتحاد اور طالبان کے درمیان آویزش میں حصہ لینے آئے تھے۔اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ جب خلیجی جنگ کے موقع پر امریکی افواج سعودی عرب پہنچیں تو بن لادن نے اسے اسلامی تعلیمات کے خلاف جان کر ان پر کھلے بندوں تنقید شروع کر دی۔جب خلیجی جنگوں کے بعد بھی امریکی افواج سعودی عرب میں مقیم رہیں تو بن لادن نے سعودی حکمرانوں کو اسلام کا غدار کہنا شروع کیا۔اور اپنے لئے یہ مشن بنا لیا کہ وہ امریکی افواج کو سعودی عرب سے نکال کر رہیں گے۔یہی مشن لے کر وہ سوڈان گئے اور جب سوڈان پر دباؤ بہت بڑھ گیا تو یہی مشن لے کر وہ افغانستان چلے آئے۔

یہاں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سعودی عرب میں امریکی افواج کے آمد کے متعلق

Marfat.com

چند اہم امور کی نشاندہی کی جائے۔ جب کویت پر عراق نے قبضہ کرلیا تو اس نے کھلم کھلا یہ ارادہ ظاہر کیا کہ اب سعودی عرب اس کا اگلا ٹارگٹ ہے۔ تاہم جب کویت کو آزاد کرالیا گیا اور عراق کو بالکل بے دست و پا بنالیا گیا، تو پھر اس بات کی کوئی ضرورت نہیں تھی کہ سعودی عرب میں امریکی افواج موجود رہیں۔ چنانچہ ان افواج کو سعودی عرب کی سرزمین سے نکالنے کا بن لادن کا مطالبہ حق بجانب تھا۔ تاہم سوال یہ ہے کہ کیا اس مقصد کے لیے پرامن حکمت عملی اختیار نہیں کی جاسکتی تھی؟ اگر بن لادن چاہتے تھے کہ ان افواج کو سعودی عرب سے نکال دیا جائے تو اس کا صحیح طریقہ یہ تھا کہ وہ سعودی شاہی خاندان کے اندر مستقل اس مقصد کے لئے ترغیب کاری کرتے رہتے کہ سعودی افواج کو اتنا مضبوط بنایا جائے کہ وہ اپنے ملک کا دفاع کرنے کے قابل ہوسکیں اور یوں امریکی افواج کی کوئی ضرورت نہ رہے۔ بن لادن خاندان کے سعودی حکمرانوں سے نہایت گہرے تعلقات تھے اور اگر بن لادن اس مقصد کے لئے اپنی دولت اور دوسرے ذرائع استعمال کرتے تو شاید اب تک امریکی افواج سعودی عرب سے نکل چکی ہوتیں۔ (واضح رہے کہ 2005ء میں امریکہ نے سعودی عرب سے اپنی تقریباً ساری فوج نکال لی تھی۔ تاہم اب بھی کویت، قطر، بحرین اور متحدہ عرب امارات میں امریکی افواج موجود ہیں۔ ان سب ممالک کے بادشاہ امریکی افواج کی موجودگی کو اپنے اقتدار کے مفاد میں سمجھتے ہیں۔ گویا اصل مسئلہ یہ تھا ہی نہیں کہ صرف سعودی عرب سے امریکی فوج نکل جائے۔ اصل مسئلہ تو اس سے کہیں زیادہ گھمبیر ہے، جس کا رشتہ جمہوریت سے جا ملتا ہے۔ جب تک مسلمان ممالک میں جمہوری طرزِ حکومت نہیں آئے گا، تب تک ساری مسلمان حکومتیں کسی نہ کسی بڑی طاقت کی پناہ ڈھونڈتی رہیں گی۔ افسوس کہ بن لادن نے مسئلے کی جڑ کے بجائے محض اُس کی ایک شاخ پر ہی توجہ دی)۔

بہرحال جب بن لادن مئی 1996 میں افغانستان آئے تو ان کے سامنے یہی مشن تھا کہ امریکی افواج کو سعودی سرزمین سے طاقت کے بل پر نکال باہر کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اگست 1996 میں انہوں نے پہلی بار امریکیوں کے خلاف اعلانِ جہاد (اعلانِ جنگ)

Marfat.com

کیا۔ طالبان کے برسراقتدار آنے کے بعد انہوں نے ملا عمر کے ساتھ دوستی کا معاہدہ کیا اور قندھار چلے گئے۔ اُن کی زیر سرکردگی بہت سے کیمپ بنائے گئے جہاں سینکڑوں عربوں اور دوسری قومیتوں کے لوگوں کو مسلح تربیت دی جاتی تھی۔

23 فروری 1998 کو خوست کیمپ میں القاعدہ سے وابستہ تمام گروپوں نے ایک منشور جاری کیا جس میں یہودیوں اور عیسائیوں کے خلاف اعلان جہاد کیا گیا اور یہ فتویٰ دیا گیا کہ امریکہ اور اس کے اتحادی ممالک کے ہر باشندے، خواہ وہ سویلین ہو یا فوجی، کو قتل کرنا مسلمانوں پر فرض ہے۔

جب اگست 1998 میں کینیا اور تنزانیہ میں امریکی سفارتخانوں میں بم دھماکوں میں دو سو بیس افراد ہلاک ہوئے، تو قدرتی طور پر سب کی نگاہیں بن لادن کی طرف اٹھیں۔ بن لادن نے بھی اپنے ایک بیان میں حملہ آوروں کی تعریف و تحسین کی۔ جتنے افراد کو ان کیسوں میں مورد الزام ٹھہرایا گیا اور جن کو عدالتوں کی طرف سے سزائیں دی گئیں، ان سب نے القاعدہ سے تعلق کا اعتراف کیا۔ یہ عین قدرتی امر تھا کہ امریکہ طالبان حکومت سے یہ مطالبہ کرتا کہ القاعدہ تنظیم سے وابستہ افراد کو اس کے حوالے کر دیا جائے۔ اس معاملے میں امریکہ نے اقوام متحدہ کو بھی ساتھ ملایا اور اس کی طرف سے یہ متفقہ قرارداد منظور ہوئی کہ ملزموں کو امریکہ کے حوالے کیا جائے۔

اس کے جواب میں طالبان کی طرف سے دو وضاحتیں پیش کی گئیں۔ پہلا جواز یہ تھا کہ یہ لوگ ہمارے مہمان ہیں اور دوسرا جواز یہ تھا کہ ان کی نقل و حرکت محدود کر دی گئی ہے۔ یہ دونوں جواب بہت کمزور تھے۔ کسی مہمان کو یہ حق نہیں دیا جا سکتا کہ وہ میزبان ملک میں بیٹھ کر کسی اور ملک کے خلاف اعلانِ جنگ کرے۔ اس اعلان جنگ کو آج تک واپس نہیں لیا گیا۔ طالبان نے بھی کبھی اس کی مذمت نہیں کی۔ بلکہ بن لادن نے ہر موقع پر اس کی بار بار تائید و حمایت کی۔

گویا القاعدہ تنظیم کے ہیڈکوارٹر کی افغانستان میں موجودگی طالبان کے لئے آگ سے کھیلنے کے مترادف تھی۔ لیکن وہ اس کا ادراک نہ کر سکے۔

Marfat.com

گیارہ ستمبر 2001 کے بعد طالبان کا موقف

گیارہ ستمبر کے سانحے کے بعد امریکہ نے بہت واضح الفاظ میں طالبان کو الٹی میٹم دیا کہ القاعدہ تنظیم کے اہم ارکان کو اس کو حوالے کر دیا جائے ورنہ وہ افغانستان پر حملہ کر دے گا۔ اسی کے ساتھ اقوام متحدہ نے بھی اپنی متفقہ قرارداد کے ذریعے طالبان سے یہ مطالبہ کیا کہ ملزموں کو امریکہ کے حوالے کیا جائے۔ اس وقت طالبان کے پاس دو راستے تھے۔ ایک یہ کہ القاعدہ کے اہم ارکان کو امریکہ کے حوالے کر کے اپنے ملک اور اپنی حکومت کو تباہی سے بچایا جائے اور دوسرا راستہ یہ تھا کہ انکار کیا جائے۔ چنانچہ طالبان نے انکار والا راستہ پسند کیا۔ یہ بات ہر انسان کو سمجھ میں آرہی تھی کہ اس انکار کی صورت میں القاعدہ کے ساتھ ساتھ طالبان حکومت بھی جائے گی اور ممکنہ تباہی سے اموال واملاک اور عام انسانی جانوں کا اتلاف بھی یقیناً ہوگا۔ تاہم طالبان نے اپنے جواب کی حمایت میں یہ دلیل دی کہ یہ حق و باطل اور کفر و اسلام کی جنگ ہے۔ اس جنگ میں ہماری غیبی مدد ہوگی۔ امریکہ اسی طرح جنگ ہارے گا جس طرح ابابیل کے مقابلے میں ابرھہ اور ابراہیمؑ کے مقابلے میں نمرود ہارا تھا۔ ایک افغانی دس امریکیوں پر بھاری ہوگا۔ یہ دلیل طالبان نے اپنی ہر تقریر میں دہرائی۔ بلکہ اپنی ہر تقریر میں وہ اس موازنے کے بعد یہ بھی کہتے کہ ایک طرف خدا کا وعدہ ہے اور دوسری طرف بش کی دھمکی۔ دیکھتے ہیں دونوں میں سے کس کی بات پوری ہوتی ہے۔ پاکستان کے اکثر مذہبی لیڈروں نے بھی اس دلیل کو اپنی تقریروں میں دہرا کر نہ صرف طالبان کی پیٹھ ٹھونکی بلکہ پاکستانی عوام کو بھی یہ یقین دلایا کہ غیبی مدد آیا ہی چاہتی ہے۔

مناسب ہے کہ اس دلیل کا مختصر تجزیہ کیا جائے۔ یہ پروردگار کا واضح حکم ہے کہ مقابلے کی پوری قوت فراہم رکھی جائے۔ جب سامان حرب واسلحہ میں دو قوتیں ایک دوسرے کے برابر ہوں تب اگر زیادہ صبر و استقامت والی طاقت افرادی قوت کے اعتبار سے کچھ کم بھی ہو، تب بھی وہ مقابلہ جیت سکتی ہے۔ دور رسالتؐ اور دور صحابہؓ کی تمام جنگوں میں مسلمانوں اور ان کے دشمنوں کے درمیان اسلحہ کی تعداد میں یقیناً فرق رہا ہے لیکن دونوں طرف سے ہمیشہ ایک ہی جیسے ہتھیار

Marfat.com

استعمال کئے جاتے تھے۔ ایسا نہیں تھا کہ دشمن کے پاس کوئی ایسا ہتھیار ہو جو مسلمانوں کے پاس نہ ہو۔ پچھلے تین سو برس کی تاریخ مسلسل ہمیں سبق دیتی ہے کہ بہترین مسلمانوں کے مقابلے میں وہ دشمن جنگ جیتے جن کے پاس مسلمانوں سے برتر اسلحہ تھا۔ مثلاً سید احمد شہیدؒ کے مقابلے میں سکھ حکومت جنگ جیت گئی۔ 1857 کے جنگ آزادی میں مسلمانوں کے مقابلے میں انگریز کامیابی سے ہمکنار ہوئے۔ اسی طرح کی بیسوں مزید مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا پچھلے تین سو برس کے واقعات سے طالبان اور پاکستان کی مذہبی جماعتوں کے قائدین نے کوئی سبق نہیں سیکھا تھا۔

لیکن سب سے بڑھ کر یہ کہ حضورؐ کی سیرت مبارکہ سے بھی یہ ثابت ہے کہ جب آپؐ کے پاس سامان حرب کی کمی تھی تو آپؐ نے ہمیشہ لڑائی کو ٹال کر مسلمانوں کو بچایا۔ اس کی سب سے نمایاں مثال جنگِ احزاب ہے۔ اس وقت دشمنوں کی تعداد دس ہزار، جب کہ مسلمانوں کی تعداد تین ہزار تھی۔ مزید یہ کہ دشمن کے پاس اسلحہ بہت بڑی مقدار میں تھا۔ چنانچہ حضورؐ نے مقابلہ کرنے کے بجائے مدینہ کے گرد خندق کھود کر اس کے اندر مسلمانوں کو محصور کر کے انہیں دشمن سے بچایا۔ حضورؐ کی سیرت کا یہ پہلو ہمارے لیے حکمت وصبر کا مینارۂ نور ہے۔

واضح رہے کہ گیارہ ستمبر سے پہلے خود طالبان نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ تین مسلمان ملکوں پر مشتمل ایک عدالت بنائی جائے جس کے سامنے بن لادن کو پیش کیا جائے۔ جب گیارہ ستمبر کے بعد پاکستانی علماء کا ایک وفد ان سے ملاقات کے لئے قندھار گیا اور وہاں مفتی شامزئی نے اسی تجویز کا اعادہ کرنے کو کہا تا کہ اس کی بنیاد پر بات آگے بڑھائی جاسکے تو اب کے طالبان نے اپنی تجویز کا اعادہ کرنے سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ اب حالات بدل چکے ہیں۔ اب بن لادن پر صرف طالبان کی عدالت میں ہی مقدمہ چل سکتا ہے۔ گیارہ ستمبر کے چند ہفتے بعد امریکہ کے وزیر خارجہ کولن پاول نے پیش کش کر دی کہ بن لادن پر کسی دوسرے غیر جانبدار ملک میں اس ملک کے قانون کے مطابق مقدمہ چلایا جائے تو یہ امریکہ کو منظور ہوگا۔ لیکن اس پیش کش کو طالبان نے یہ کہہ

Marfat.com

کرمسترد کر دیا کہ دنیا بھر میں شرعی عدالت تو صرف طالبان کی ہے۔اس لئے بن لادن کے متعلق اسی کا فیصلہ چلے گا۔

بدقسمتی سے گیارہ ستمبر کے واقعات کے بعد بن لادن اور القاعدہ کے دوسرے اہم رہنما اپنے ہر بیان اور ہر انٹرویو کی وجہ سے اپنے لئے مزید مشکلات پیدا کرتے گئے۔مثلاً بن لادن نے بارہ ستمبر کو اپنے ایک بیان میں حملہ آوروں کے ساتھ دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے ان کی تائید کی۔سات اکتوبر کے بیان میں انہوں نے کہا کہ حملہ آور بہت اچھے نوجوان مسلمان تھے جن کو پروردگار نے اس حملے کی توفیق بخشی اور جنت کی ابدی نعمتیں ان کا انتظار کر رہی ہیں۔تیرہ اکتوبر کو القاعدہ کے ترجمان نے الجزیرہ ٹی وی پر کہا کہ مغرب کے اندر رہنے والے مسلمانوں کو اونچی عمارتوں میں رہنے اور ہوائی سفر سے گریز کرنا چاہیے اس لئے کہ اس طرح کے مزید خودکش حملے بھی ہو سکتے ہیں۔اس کے بعد بن لادن نے اپنے ایک مبینہ انٹرویو میں نیوکلیئر، کیمیاوی اور حیاتیاتی ہتھیار رکھنے کا دعویٰ کیا۔اس طرح انہوں نے اپنے خلاف ایکشن کے لئے دنیا بھر کو ایک بھرپور اخلاقی جواز فراہم کر دیا۔

اگر اُس وقت بن لادن کو امریکہ کے حوالے کیا جاتا تو اس کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت تھے بھی یا نہیں۔اول تو یہ مقدمہ سالوں تک چلتا پھر کہیں جا کر سزا کی نوبت آتی۔لیکن دوسری صورت میں تو سب بشمول القاعدہ کی تباہی یقینی تھی۔وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔طالبان کو فیصلہ کن شکست ہوئی۔افغانستان میں تباہی کی ایک اور داستان رقم ہوگئی۔یہ ہے نتیجہ خوش فہمیوں اور زمینی حقائق کا ادراک نہ رکھنے کا۔

عالم اسلام میں اس موضوع پر ابھی تک بحث جاری ہے کہ نائن الیون کا حملہ کس نے کیا تھا۔ہمارے ہاں عام طور پر یہ بات مشہور ہے کہ یہ حملہ یہودیوں نے کیا تھا، اس لیے کہ اُس دن ورلڈ ٹریڈ سنٹر میں کام کرنے والے چار ہزار یہودی غیر حاضر تھے، گویا اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ حملہ یہودیوں نے کیا ہے اور یہودیوں کو اس کے بارے میں پہلے سے معلوم تھا۔یہ بات حقیقت پر

Marfat.com

مبنی نہیں۔اس حملے میں بہت سے امریکی یہودی ہلاک ہوئے۔اس حملے میں اسرائیل کے انچاس (49) یہودی شہری بھی ہلاک ہوئے۔ممکن ہے کہ اُس دن کچھ یہودی غیر حاضر ہوں مگر اُس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اُن کے ایک اہم مذہبی تہوار کا دن تھا۔اس راقم کے خیال میں اس حملے کی ذمہ داری القاعدہ ہی پر عائد ہوتی ہے۔اس کے تین دلائل ہیں۔ایک یہ کہ اُنتیس اکتوبر 2004ء کو بن لادن نے اپنی ایک ویڈیو تقریر میں واضح طور پر یہ کہا کہ یہ حملہ القاعدہ کی طرف سے کیا گیا ہے۔ پاکستان کے ممتاز صحافی حامد میر نے یہ انکشاف کیا کہ جب نائن الیون سے کچھ عرصے پہلے وہ بن لادن سے ملنے کے لیے گئے تھے تو وہاں القاعدہ کے کمپیوٹرز میں نائن الیون کے مرکزی کردار عطا محمد کی تصویریں اور معلومات موجود تھیں۔اور وہ یہ بات جانتے تھے کہ عطا محمد کو کوئی بھاری ذمہ داری سپرد کی گئی ہے۔ابھی حال ہی میں 2007ء میں نائن الیون کی چھٹی سالگرہ کے موقعہ پر بن لادن نے نائن الیون کے ایک خودکش حملہ آور کو خراج تحسین پیش کیا۔بن لادن کے ذاتی معالج ڈاکٹر عامر عزیز نے ڈاکٹر اسرار احمد کو بتایا کہ بن لادن نے ان کے سوال پر یہ اعتراف کیا کہ اس حملے کا حکم انہوں نے دیا تھا۔یہ بات ڈاکٹر اسرار احمد نے راقم الحروف کو خود بتائی تھی۔واضح رہے کہ آرتھو پیڈک سپیشلسٹ ڈاکٹر عامر عزیز اعلیٰ ترین درجے کے دیانت دار اور مخلص انقلابی مسلمان ہیں۔

یہ عین ممکن ہے کہ کچھ اور اداروں نے بھی القاعدہ کی مدد کی ہو۔تاہم اس کی حقیقت کچھ عرصے بعد ہی کھل سکے گی۔ممکن ہے کہ راقم کے اس تجزیے کے جواب میں یہ کہا جائے کہ خود امریکہ کے اندر کچھ ایسی فلمیں بنائی گئی ہیں جن میں اس پورے واقعے کے ذمہ داروں کے متعلق شکوک وشبہات کا اظہار کیا گیا ہے۔اس ضمن میں اصل حقیقت یہ ہے کہ جس طرح ہمارے ملک میں بے شمار لوگ سازش کی تھیوریوں (Conspiracy Theories) پر یقین رکھتے ہیں، اسی طرح امریکہ میں بھی کچھ لوگ ایسی تھیوریز پر یقین رکھتے ہیں۔مثلاً حال ہی میں ہالی ووڈ کی ایک فلم میں یہ ثابت کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے کہ انسان تو سرے سے چاند پر چڑھا ہی نہیں۔

Marfat.com

بالکل اسی طرح ایک مشہور امریکی ڈاکومنٹری فلم میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ جو عرب نائن الیون کے واقعے کے ذمہ دار تھے، ان کے ساتھ بش کا کوئی لین دین تھا۔ ظاہر ہے کہ کانسپریسی تھیوریز کی بنیاد پر تو کسی بھی وقت کچھ بھی کہا جاسکتا ہے۔ اس کے برعکس حقائق کی بنیاد ہمیشہ واضح دلیل پر ہوتی ہے۔

کیا افغانستان پر امریکی حملہ صحیح تھا؟

جب طالبان حکومت نے بن لادن اور اس کے ساتھیوں کو امریکہ کے حوالے کرنے سے انکار کیا تو امریکہ نے طالبان پر زبردست بمباری شروع کردی۔ دوسری طرف شمالی اتحاد نے بھی اپنے حملے بڑھادئے۔ چنانچہ اس کے نتیجے میں تین مہینے کے اندر اندر طالبان حکومت ختم ہوگئی، کابل پر حامد کرزئی کا قبضہ ہوگیا اور امریکہ اور نیٹو کی افواج افغانستان میں اتر گئیں۔ اس راقم کی نظر میں امریکہ کا یہ حملہ غلط تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ بات واضح تھی کہ اس حملے کے نتیجے میں لازماً ہزاروں بے گناہ افراد ہلاک ہوں گے۔ نیز اُس وقت اس بات کا بھی تجزیہ نہیں ہوسکتا تھا کہ اس حملے کے نتیجے میں مستقبل میں کیا مصیبتیں اور مشکلات سامنے آئیں گی۔ چنانچہ اُس وقت امریکہ کے لیے صحیح راستہ یہی تھا کہ وہ افغانستان پر اقتصادی اور دیگر پابندیاں لگاتا۔ اس کے نتیجے میں کسی نہ کسی دن طالبان کو بین الاقوامی رائے عامہ کے سامنے سر جھکانا پڑتا۔

یہی وجہ ہے کہ کابل پر قبضے کے چھ برس بعد بھی افغانستان کے حالات پہلے کی طرح مخدوش اور دگرگوں ہیں۔ نیز مستقبل کے لیے بھی کوئی پیشن گوئی نہیں کی جاسکتی۔ جب باہر کی کوئی فوج کسی جگہ آتی ہیں، تو اُس سے بے شمار غلطیاں ہوتی ہیں اور اُس کے اقدامات کے نتیجے میں عام لوگ بھی اُس کے خلاف ہوجاتے ہیں۔ یہی کچھ افغانستان میں ہورہا ہے اور اس کے اثرات بھی ہمسایہ ممالک، خصوصاً پاکستان پر، پڑرہے ہیں۔

حل: افغان عوام کو کیا کرنا چاہیے

سوال یہ ہے کہ افغانستان کے معاملے میں اب کیا کیا جائے۔ سب سے اچھا راستہ تو یہ

Marfat.com

ہے کہ افغانستان سے سب غیر ملکی نکل جائیں۔ لیکن بات یہ ہے کہ نہ تو امریکہ اس مشورے پر کان دھرے گا اور نہ القاعدہ۔ لہٰذا جو کچھ کرنا ہے، وہ خود افغانوں ہی کو کرنا ہے۔ آج اس امر کی ضرورت ہے کہ افغانستان کے اندر تمام سابقہ طالبان کرزئی حکومت کے خلاف مسلح اقدامات ختم کردیں، اور اپنے آپ کو ایک سیاسی تنظیم میں ڈھال لیں۔ تمام مقامی کمانڈر اپنی اپنی افواج کو افغان فوج میں ضم کرلیں۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوسکے گا کہ امریکی افواج سے افغانستان چھوڑنے اور کرزئی حکومت سے انتخابات کروانے کا مطالبہ کیا جائے۔ اور پھر ان دونوں کو یہ مطالبہ ماننے پر مجبور ہونا پڑے گا۔ اگر کابل کی موجودہ حکومت کے خلاف مسلح اقدامات ختم نہ ہوئے تو امریکی فوج موجود رہے گی اور افغانستان بدامنی کا شکار رہے گا۔ یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ طالبان دوبارہ اُسی طرح برسرِ اقتدار آسکیں جس طرح وہ ستمبر 2001ء سے پہلے تھے، کیونکہ افغانستان کے سارے تضادات جوں کے توں ہیں۔ یہ بات بھی واضح رہنی چاہیے کہ امریکہ کی دونوں بڑی پارٹیوں یعنی ریپبلکن اور ڈیموکریٹک پارٹی میں افغانستان کے متعلق حکمت عملی میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ عراق کے متعلق یقیناً امریکی قوم دو حصوں میں تقسیم ہے، لیکن افغانستان کے متعلق یہ صورتحال نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں خود بھی آگے بڑھ کر ایسے اقدامات اٹھانے چاہئیں جن سے افغانستان میں امن قائم ہوجائے اور غیر ملکی افواج یہاں سے چلی جائیں۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ طالبان اپنے آپ کو ایک جمہوری سیاسی پارٹی کی شکل میں ڈھال لیں اور وہ خود بھی یہ مطالبہ کرلیں کہ امریکی افواج کے ساتھ ساتھ القاعدہ کو بھی یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ افغانستان کے حالات کو دیکھتے ہوئے راقم کا یہ تجزیہ ہے کہ طالبان کا ایک اسلامی جمہوری پارٹی کی شکل میں انتخاب جیتنا عین ممکن ہے۔ البتہ یہ واضح ہے کہ یہ مقصد صبر و حکمت اور لچک ہی کے ذریعے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

پاکستان کو کیا کرنا چاہیے

ابتدا سے ہی افغانستان کے متعلق پاکستانی حکومت کی پالیسی بے اصولی اور وقتی

Marfat.com

مفادات پر مشتمل رہی ہے۔ اس پالیسی نے افغانستان کے ساتھ ساتھ پاکستان کو بھی بہت زیادہ نقصان پہنچایا ہے۔ پاکستان نے افغانوں کی متحدہ تنظیم کو نو حصوں میں تقسیم کیا اور افغانوں کی جلاوطن حکومت نہیں بننے دی۔ پاکستان، اور اُس کے ساتھ ساتھ امریکہ کی مہربانیوں کی وجہ سے، ساری تنظیموں کے پاس اسلحہ، ڈالر اور دوسرا ساز وسامان آ گیا۔ افغانستان کی خانہ جنگی کی بنیاد یہی فیصلہ بنا۔ یہ وہ وقت تھا جب امریکہ کو بھی مجاہدین بہت بھلے لگتے تھے اور جہاں سے بھی کوئی فرد افغانستان کی مزاحمت کی تحریک میں شمولیت کے لیے آنا چاہتا، اُسے امریکہ کی طرف سے پوری پوری آسانیاں فراہم کی جاتیں۔ پاکستانی فوجی حکومت بھی اُس وقت ڈالروں کے مزے میں مست تھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اسٹیبلشمنٹ کی مختلف ایجنسیاں طاقت کے مختلف اور متضاد مراکز کی حمایت کرتی تھیں۔

1994ء سے لے کر ستمبر 2001ء تک پاکستان طالبان حکومت کا حامی رہا اور اس حمایت کی وجہ سے اُسے پوری دنیا کی ناراضگی مول لینی پڑی۔ ظاہر ہے کہ یہ اندھی حمایت غلط تھی۔ نائن الیون کے بعد امریکہ نے پاکستان کو سات مطالبات پر مبنی ایک فہرست پیش کر کے کہا کہ یا تو آپ ہمارے ساتھ ہیں، یا ہمارے دشمن ہیں۔ چنانچہ جنرل پرویز مشرف نے بغیر کسی توقف اور مشورے کے، امریکہ کے سارے مطالبات مان لیے۔ اگر اُس وقت پاکستان میں کوئی نام نہاد قسم کی جمہوری حکومت بھی موجود ہوتی تو نہ امریکہ اس رنگ میں یہ مطالبہ کر سکتا تھا اور نہ حکومت ان مطالبات کو اس انداز میں مان سکتی تھی۔ بدقسمتی سے ہماری فوجی حکومتیں اپنے ادارتی مفادات (Corporate Interests) کے لیے ہر وقت سب کچھ کرنے کے لیے تیار رہتی ہیں۔ چنانچہ یہاں بھی یہی کچھ ہوا اور امریکہ کے ناجائز مطالبات بھی مان لیے گئے۔ اُس وقت بے نظیر اور نواز شریف میں سے جس کی بھی حکومت ہوتی، وہ طالبان کے خلاف بین الاقوامی رائے عامہ کے ساتھ کھڑی ہوتی۔ لیکن وہ امریکہ کو بھی یہ اجازت نہ دیتی کہ وہ طالبان پر حملے کے لیے پاکستانی سرزمین اور پاکستانی ہوائی اڈے استعمال کرے۔ ممکن ہے کہ جمہوری حکومت امریکہ اور طالبان

Marfat.com

کے درمیان مکالمے کا آغاز کرتی اور معاملہ اس حد تک نہ پہنچتا۔ کم از کم یہ تو نہ ہوتا کہ جنرل مشرف اپنے ایک جرنیل، یعنی جنرل محمود کو گفتگو کے لیے قندھار بھیجیں اور وہ طالبان کو کہے کہ امریکہ کے مقابلے میں ڈٹے رہو۔

فوجی حکومتوں نے قبائلی علاقوں کو بھی ہمیشہ اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا ہے۔ پاکستان کی ساری بڑی پارٹیوں کی یہ خواہش ہے کہ قبائلی علاقوں کو پاکستان میں ضم کر دیا جائے۔ یہ مطالبہ سبھی پارٹیوں کے انتخابی منشوروں کا بھی حصہ ہے۔ تاہم اسٹیبلشمنٹ اس راہ میں رکاوٹ ہے۔ اگر قبائلی علاقے صوبہ سرحد کا حصہ ہوتے اور وہاں قانون کی پوری عمل داری ہوتی، تو ہمارے آج کے مسائل بہت کم ہو جاتے۔ اس راقم کے خیال میں جب تک پاکستان میں حقیقی جمہوریت آنہیں جاتی، تب تک افغانستان کے متعلق پالیسی میں کسی بنیادی اصلاح کی زیادہ توقع نہیں۔ بہت سے بین الاقوامی اداروں کی طرف سے یہ الزام بھی لگایا جاتا ہے کہ پاکستانی اسٹیبلشمنٹ کا ایک حصہ ایک طاقت کی مدد کرتا ہے، اور دوسرا حصہ مخالف طاقت کی حمایت کرتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو یہ ملکی مفادات کے خلاف ہے۔

فی الوقت پاکستان کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ افغانستان کی موجودہ حکومت اور طالبان کے درمیان مکالمہ شروع کرنے کی کوشش کرے۔ صرف اسی طریقے سے وہاں پاکستان کے خلاف موجودہ نفرت کی فضا کم ہو سکتی ہے۔ قبائلی علاقوں کو صوبہ سرحد کا حصہ بنا دیا جائے اور وہاں کے میدانی علاقوں میں سکول اور ہسپتال کھولے جائیں۔ قبائلی علاقوں میں سیاسی سرگرمیوں کی اجازت دی جائے اور سب پارٹیوں کو یہ موقع دیا جائے کہ وہ وہاں اپنی تنظیمیں بنائیں۔ حالات جیسے بھی ہوں، وہاں بلدیاتی، صوبائی اور قومی انتخابات جماعتی بنیاد پر کرائے جائیں اور سارے ترقیاتی کام منتخب نمائندوں کے ذریعے کروائے جائیں۔

Marfat.com

بارھواں باب

مسئلہ فلسطین

مسئلہ فلسطین دنیا کا سب سے پیچیدہ، قدیم اور حساس مسئلہ ہے۔ اس لئے کہ اس قضیئے میں تینوں آسمانی مذاہب، نسل اور کلچر کے تمام تر تضادات اپنی پوری شدت کے ساتھ موجود ہیں۔ اس مسئلے کو سمجھنے کے لئے مناسب یہ ہے کہ پہلے موجودہ زمینی حقائق کو سمجھ لیا جائے۔ اس وقت موجودہ اسرائیل کا رقبہ تقریباً اکیس ہزار مربع کلومیٹر اور آبادی انسٹھ (59) لاکھ ہے۔ اس آبادی میں یہودیوں کی تعداد اڑتالیس (48) لاکھ ہے اور عربوں کی تعداد گیارہ لاکھ ہے۔ یعنی بیاسی (82) فیصد یہودی اور اٹھارہ (18) فیصد مسلمان۔

جس علاقے پر اسرائیل نے جون 1967 کی جنگ میں قبضہ کیا تھا اور جس کے متعلق فلسطینی قیادت کا دعویٰ ہے کہ یہی مستقبل کی فلسطینی ریاست ہے۔ اس میں سے ایک علاقہ دریائے اردن کے مغربی کنارے سے اسرائیل کی سرحد تک ہے۔ اس علاقے کا رقبہ چھ ہزار مربع کلومیٹر سے کچھ کم ہے اور اس کی آبادی بیس لاکھ ہے۔ اسے عام طور پر غربِ اردن (West Bank) کہا جاتا ہے۔ دوسرے علاقے کو غزہ کی پٹی کہتے ہیں۔ یہ اسرائیل کی مغربی سرحد، مصر اور بحیرہ روم میں گھری ہوئی ایک چھوٹی سی پٹی ہے۔ جس کا رقبہ تین سو ساٹھ مربع کلومیٹر ہے اور جس کی آبادی گیارہ لاکھ ہے۔ گویا مجوزہ فلسطینی ریاست میں اکتیس لاکھ فلسطینی رہتے ہیں۔

اس علاقے کی قدیم تاریخ کے مطابق 2500 قبل مسیح میں عرب سے لوگ آ کر یہاں آباد ہوئے۔ جنہوں نے اس کا نام ''کنعان'' رکھا۔ اس کے بعد ایشیائے کوچک (یعنی موجودہ ترکی) کے علاقوں سے بھی لوگ یہاں آ کر آباد ہوئے۔ انہیں فلسطی کہا جاتا تھا۔ چنانچہ اس علاقے کا یہ نام پڑ گیا۔ جلد ہی یہ دونوں گروہ آپس میں پوری طرح گھل مل گئے۔

حضرت ابراہیمؑ غالباً 1900 قبل مسیح میں اس علاقے میں تشریف لائے تھے۔ یہیں

Marfat.com

ان کے ہاں حضرت اسحاقؑ پیدا ہوئے۔حضرت اسحاقؑ کے ایک بیٹے کا نام حضرت یعقوبؑ تھا۔ان کا لقب ''اسرائیل'' تھا۔چنانچہ ان سے جو نسل دنیا میں پھیلی، اسے بنی اسرائیل کہا جاتا ہے۔حضرت یعقوبؑ کے بیٹے حضرت یوسفؑ کے مصر جانے اور وہاں کی سلطنت میں ایک اہم مقام پانے کی وجہ سے حضرت یعقوبؑ اور ان کے باقی ماندہ گیارہ بیٹے بھی مصر تشریف لے گئے۔وہاں ایک عرصے تک بنی اسرائیل بہت اہم عہدوں پر فائز رہے۔مگر پھر مصر کے اصلی باشندوں یعنی قبطیوں میں ان کے خلاف ردعمل پیدا ہوا اور ان کی پوری نسل کو غلام بنالیا گیا۔ایک عرصے تک یہ قوم اسی حالت میں رہی حتیٰ کہ حضرت یوسفؑ کے چار سو سال بعد حضرت موسیٰؑ پیدا ہوئے۔جنہوں نے اس پوری قوم کو لے کر اپنے پرانے وطن یعنی ارضِ فلسطین کا رخ کیا۔وہاں کئی صدیوں پر پھیلی ایک لمبی جدوجہد کے بعد سلطنت اسرائیل قائم ہوئی۔اسی سلطنت کا دورِ زرین حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کا ایک سو بیس سال پر پھیلا ہوا عہد تھا۔یہودیوں کے مقدس ترین مقام ہیکل سلیمانی (یعنی حضرت سلیمانؑ کے سیکرٹریٹ) کی تعمیر اسی دور میں یروشلم میں ہوئی۔اس کے بعد یہ ریاست دو حصوں میں بٹ گئی۔350 قبل مسیح میں بابل کے بادشاہ نبوکدنضر نے یروشلم پر حملہ کر کے ہیکل سلیمانی یعنی بیت المقدس کو برباد کیا اور بنی اسرائیل کو اپنا غلام بنالیا۔

اس کے پچاس برس بعد ایران کے بادشاہ سائرس نے بابل (موجودہ عراق) کو فتح کیا اور بنی اسرائیل کو واپس جا کر ہیکل دوبارہ تعمیر کرنے کی اجازت دے دی۔اس دوران میں اور اس کے بعد سن 70ء تک یہاں بنی اسرائیل کبھی اقتدار میں رہے، کبھی غلام رہے اور کبھی دوسروں کے تحت نیم خودمختار رہے۔

سن 70ء میں رومیوں نے حملہ کر کے یروشلم کو ایک دفعہ پھر تباہ کیا، یہودیوں کا قتل عام کیا اور زندہ بچ جانے والے یہودیوں کو جلاوطن کر دیا۔چوتھی صدی میں رومیوں نے عیسائیت قبول کر لی۔چنانچہ اس پورے علاقے کا سرکاری مذہب بھی عیسائیت ہو گیا۔

تین سو برس بعد یعنی ساتویں صدی عیسوی (سن 638ء) میں حضرت عمرؓ کے وقت

Marfat.com

میں مسلمانوں نے یروشلم کو فتح کیا۔اُس وقت ہیکل سلیمانی کا پورا علاقہ کھنڈرات بنا ہوا تھا۔حضرت عمرؓ نے اس علاقے کو صاف کروایا اوراس کے جنوبی حصے میں ایک جگہ نماز پڑھنے کے لئے مخصوص فرمائی۔یہی آج کا ''مسجد اقصیٰ'' ہے۔

یہاں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کی تاریخ سے متعلق یہودیوں اور قرآن مجید کے موقف کے اختلاف کو سمجھا جائے۔یہودیوں کے مطابق حضرت یعقوبؑ اور ان کی پوری نسل کو پروردگار نے اپنی چہیتی نسل قرار دیا۔چنانچہ یہ نسل باقی پوری دنیا پر فضیلت رکھتی ہے۔اسی نسل کو پروردگار نے فلسطین کا سارا علاقہ حوالے کیا اور ہیکل سلیمانی کو اس کا قبلہ بنایا۔چنانچہ اس علاقے میں آباد ہونا ان کا حق ہے۔

اس کے برخلاف قرآن مجید کا بیان ہے کہ بنی اسرائیل کو فضیلت ایک خاص مقصد کے لئے دی گئی تھی،وہ یہ کہ وہ خود بھی پروردگار کے احکام پر عمل کریں گے اور پوری دنیا میں توحید کا پیغام پھیلائیں گے۔چنانچہ جب بھی وہ یہ کام کرتے تھے،پروردگار ان پر انعام فرماتا تھا۔اور جب وہ اس کو پس پشت ڈالتے تھے تو پروردگار ان کو سزا دیتا تھا۔چونکہ انہوں نے بنی اسرائیل کے آخری پیغمبر حضرت عیسیٰؑ کو جھٹلایا اور اپنی طرف سے ان کے قتل کے درپے ہوئے۔اس لئے پروردگار نے ان سے یہ فضیلت واپس لے لی۔

اس بحث کے بعد ہم ایک دفعہ پھر بنی اسرائیل کی تاریخ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

حضرت عمرؓ کے زمانے میں یہ علاقہ فتح ہونے کے بعد اگلے ساڑھے چار سو برس تک یہ علاقہ مسلمانوں کے قبضے میں رہا۔

1078ء میں سلجوقی ترکوں نے یروشلم پر قبضہ کیا۔ان کے بیس سالہ دور حکومت میں عیسائی زائرین کے ساتھ ناروا سلوک کیا گیا جس کے رد عمل میں یورپ میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی۔اور ایک متحد عیسائی لشکر نے یروشلم پر قبضہ کرلیا۔اسی کو تاریخ میں صلیبی جنگیں کہتے ہیں۔یہ واقعہ سن 1099ء کا ہے۔

Marfat.com

اٹھاسی سال کے بعد اکتوبر 1187ء میں مسلمانوں نے صلاح الدین ایوبی کی قیادت میں دوبارہ یروشلم پر قبضہ کرلیا۔ اگرچہ اس کے بعد مزید سو سال تک مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان لڑائیاں ہوتی رہیں تاہم مسلمانوں کا قبضہ برقرار رہا۔ گویا عیسائیوں کے اٹھاسی سالہ اقتدار کے بعد یروشلم پر اگلے آٹھ سو برس یعنی پہلی جنگ عظیم تک مسلمانوں کا قبضہ رہا۔

1517ء میں عثمانی ترکوں نے فلسطین پر قبضہ کرلیا اور اگلے چار سو برس تک یہ علاقہ عثمانی سلطنت کا حصہ رہا۔ ہر آمرانہ حکومت کی طرح اس میں آہستہ آہستہ خرابیاں در آتی گئیں۔ کرپشن، عیاشی اور سازشیں پروان چڑھتی گئیں۔ اجتماعی اخلاقیات دن بدن گرتی گئیں۔ اس حکومت نے اپنی مقبوضات کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہ کیا۔ اس دور میں سب عرب ممالک اس سلطنت کا حصہ تھے، لیکن یہ سب کے سب اپنے آپ کو ترکوں کا غلام سمجھتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ جہاں یورپ جمہوریت اور سائنس کی نعمتوں سے بہرہ ور ہو رہا تھا، عثمانی سلطنت نے ان دونوں کے لئے اپنے دروازے بند کر لئے اور ہر سلطان نے اپنی حکومت بچانے کی جدوجہد ہی کو اپنا مقصد سمجھا۔ چنانچہ یہ سلطنت رفتہ رفتہ کمزور ہوتی گئی۔ حکومت کا سارا نظام قرضوں کے سہارے چلنے لگا۔ یورپی ممالک سے لئے گئے ان قرضوں کی ادائیگی کے لئے جب صوبوں پر اضافی ٹیکس لگائے گئے تو اکثر صوبوں نے بغاوت کردی۔ حتیٰ کہ اکثر مقبوضات ترکی کے ہاتھ سے نکل گئیں۔ اس پورے دور میں مذہبی طبقہ عام طور پر سلاطین کا حامی رہا۔ چنانچہ عام لوگ، سلاطین اور مذہبی طبقہ دونوں کے خلاف ہوگئے۔ چنانچہ 1908ء میں سلطان عبدالحمید کو برطرف کردیا گیا اور ایک موثر قوم پرست تنظیم "ینگ ترک" یعنی نوجوان ترکوں نے اقتدار سنبھال لیا۔ اس حکومت نے ایک فاش غلطی یہ کی کہ اس نے 1914ء میں پہلی جنگ عظیم کی ابتدا سے جرمنی سے خفیہ معاہدہ کرلیا اور اتحادی افواج جن میں (برطانیہ، فرانس، روس اور بعد میں امریکہ بھی شامل ہوگیا)، کے خلاف اعلان جنگ کردیا، اور روسی بندرگاہوں پر بمباری شروع کردی۔ یہ ایک بھیانک غلطی تھی۔ ترکی کے لئے سب سے اچھی پالیسی غیر جانبداری کی تھی۔ بہرحال اس اعلان جنگ کے بعد

Marfat.com

اتحادی افواج نے ترک مقبوضات پر بھی حملہ شروع کیا اور یروشلم دسمبر 1917ء میں برطانوی فوج کے قبضے میں چلا گیا۔ یروشلم کے تمام مسلمان باشندوں نے ترکی حکومت کی مخالفت میں برطانوی جنرل ایلن بی کا ایک ہیرو کی طرح استقبال کیا۔

یہاں یہ دیکھنا ضروری ہے کہ اس قبضے سے پیشتر یہودیوں کی کیا حالت تھی، عالم عرب کی کیا صورت حال تھی اور بڑی طاقتیں کیا کھیل کھیل رہی تھیں۔

70ء میں جب رومیوں نے یہودیوں کو جلاوطن کر دیا، تو اس کے بعد یہ قوم اٹھارہ سو سال تک تتر بتر رہی۔ اسے یہودیوں کی اصطلاح میں Diaspora یعنی ''عظیم انتشار اور لامرکزیت'' کہتے ہیں۔ اس دوران میں اکثر جگہوں میں یہودیوں پر مظالم ڈھاتے جاتے رہے۔ تاہم سپین کے مسلم عہد اور شمالی یورپ کے بعض ممالک میں ان سے اچھا سلوک کیا گیا۔ صلیبی جنگوں کے دوران میں عیسائیوں نے مسلمانوں کے خلاف لڑنے کے ساتھ ساتھ یہودیوں کا بھی خوب قتل عام کیا۔ عثمانی ترکوں کے عہد میں بھی ان کے ساتھ مناسب سلوک کیا گیا۔ مغربی یورپ میں جمہوریت آنے کے ساتھ ساتھ یہودیوں کے ساتھ سلوک میں بھی بہتری آتی گئی۔ تاہم روس اور جرمنی میں ان کے ساتھ بہت برا سلوک روا رکھا گیا۔ زارِ روس ان کا سخت مخالف تھا۔ سترھویں صدی کے لگ بھگ یہودیوں میں اپنی کم مائیگی اور بے چارگی کا احساس پیدا ہونے لگا۔ اور مختلف مقامات پر یہودیوں نے اپنی مقامی تنظیمیں بنانی شروع کر دیں۔

یوں تو یہودیوں میں یہ احساس بھی سترھویں صدی سے ہی پیدا ہو گیا تھا کہ ان کا اصل وطن فلسطین ہے جہاں انہیں واپس جانا چاہیئے۔ مگر اس کو باقاعدہ ایک تحریک کی شکل جرمنی کے ایک مشہور دانش ور اور وکیل تھیوڈر ہرزل نے دی، جس نے 1895ء میں صیہونیت (Zionism) کے نام سے یہ تحریک شروع کی۔ زایان یا صیہون دراصل یروشلم کے قریب ایک پہاڑی کا نام ہے۔ ابتدا میں یہ خیال بھی تھا کہ دنیا میں کہیں بھی کوئی ایسی جگہ مل جائے جہاں یہودی امن سے رہ سکیں اور اس ضمن میں نظرِ انتخاب یوگنڈا پر گئی۔ تاہم یہودیوں کی اکثریت نے اسے

Marfat.com

نامنظور کر کے فلسطین ہی کو اپنا مقصد قرار دیا۔ 1881ء میں فلسطین میں صرف چوبیس ہزار یہودی تھے۔ روس میں زار کے ظلم سے بچنے کے لئے بہت سے یہودیوں نے روس چھوڑ کر فلسطین کا رخ کیا۔ چنانچہ 1914 میں فلسطین میں پچاسی ہزار یہودی آباد تھے۔ اُس وقت وہاں فلسطینیوں کی تعداد چھ لاکھ تھی۔

اُس وقت بین الاقوامی صورت حال کیا تھی۔ اس کا جاننا بھی ضروری ہے۔ انیسویں صدی میں سلطنت برطانیہ سب سے بڑی طاقت تھی۔ مگر اس صدی کے دوسرے آخر میں جرمنی بھی ایک بڑی طاقت کی حیثیت سے ابھرا۔ یہ دونوں اور یورپ کی باقی طاقتیں صنعتی اعتبار سے ترقی کے منازل طے کر رہی تھیں اور ظاہر ہے کہ ان کے درمیان خام مال، تیار مال کی فروخت اور دوسرے وسائل کے لئے مقابلہ لازمی تھا۔ چانچہ ایک طرف برطانیہ، فرانس اور روس کا اتحاد بن گیا اور دوسری طرف جرمنی، اٹلی اور آسٹریا ہنگری کا اتحاد بن گیا۔ اس منظر نامے میں ترکی کی کوئی حیثیت ہی نہ تھی۔ اس لئے کہ وہ ہر اعتبار سے پس ماندہ تھا اور اسی لئے یورپ کا ''مرد بیمار'' کہلاتا تھا۔ چنانچہ جب پہلی جنگ عظیم 1914ء میں چھڑ گئی تو ترکی نے بلاضرورت اس میں جرمنی کا ساتھ دیا اور روسی بندرگاہوں پر حملہ کر کے اپنی طرف سے جنگ کی ابتدا بھی کر دی۔ چنانچہ برطانیہ اور اس کی اتحادی افواج نے ترکی مقبوضات، جن میں فلسطین بھی شامل تھا، کو اپنا ٹارگٹ بنالیا۔

اب دیکھئے کہ اُس وقت عالم عرب کی صورت حال کیا تھی۔ 1517ء میں عثمانی ترکوں نے فلسطین پر قبضہ کر لیا تھا۔ اسی کے لگ بھگ مصر سمیت مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ بھی ترکوں کے قبضے میں چلے گئے۔ عربوں میں قبائلی معاشرت تھی اور ترکوں کا رویہ ان کے ساتھ حاکمانہ تھا۔ چنانچہ جگہ جگہ بغاوتیں پھوٹتی رہیں۔ قوم پرستی کا جذبہ بڑھتا رہا۔ اور ترک انتہائی بے رحمی کے ساتھ مختلف بغاوتوں کو کچلتے رہے۔ چنانچہ پورے عالم عرب میں بلحاظ مجموعی ترکوں کے خلاف نفرت کی ایسی فضا پیدا ہو گئی کہ وہ ترکوں کے خلاف ہر طاقت کا خیر مقدم کرنے کے لئے تیار تھے۔

چنانچہ جب پہلی جنگ عظیم چھڑی تو برطانیہ نے ترکی کو شکست دینے کے لئے ایک

Marfat.com

پلان بنایا۔اس پلان کے تحت برطانیہ نے ایک طرف دنیا بھر کے یہودیوں کی حمایت حاصل کر نے کی کوشش کی، جواب بہت مالدار ہو چکے تھے اور جن کے پیسے اور علم وہنر کی برطانیہ کو سخت ضرورت تھی۔دوسری طرف برطانیہ نے ان عرب طاقتوں کی حمایت کا اعلان کیا جو ترکوں سے برسرپیکار تھے۔کہا جاتا ہے کہ کیمسٹری کا یہودی پروفیسر ڈاکٹر وائزمین جو اُس وقت صیہونی تحریک کا سربراہ تھا، نے برطانوی حکومت کو چند ایسی ایجادات بنا کر دیں جن سے جنگ میں برطانیہ کا پلہ بھاری ہو گیا۔اس کے عوض اس نے برطانوی حکومت سے یہ انعام مانگا کہ وہ یہ وعدہ کرے کہ جنگ عظیم میں کامیابی کی صورت میں فلسطین میں یہودیوں کا ایک قومی وطن قائم کیا جائے گا۔چنانچہ نومبر 1917 میں وزیر خارجہ لارڈ بالفور نے ایک خفیہ خط کے ذریعے یہ وعدہ کر لیا۔اس خط کو عرف عام میں ''اعلانِ بالفور'' کہا جاتا ہے۔

دوسری طرف برطانیہ نے جنگ عظیم کے دوران میں سرزمین حجاز (یعنی مکہ ومدینہ) کے حاکم حسین ابن علی، جسے عام طور پر ''شریف حسین آف مکہ'' کہا جاتا ہے، کو یہ پیش کش کی کہ اگر وہ ترک عثمانی حکومت کے خلاف بغاوت کر کے اپنی آزادی کا اعلان کرے تو برطانوی حکومت اس کی حمایت اور مدد کرے گی۔چنانچہ شریف حسین نے یہی کیا اور ترک حکومت کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔یہ بڑی عجیب لیکن اہم بات ہے کہ 24 اکتوبر 1915ء کو مصر میں برطانوی ہائی کمشنر سر ہنری مک موہن نے شریف حسین کے نام خط میں تمام عرب آبادی کی آزادی کا وعدہ کیا تھا ''ماسوائے شام کے چند مغربی اضلاع کے''۔یہی وہ بات ہے جس کی بنیاد پر برطانیہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس نے اسرائیل کے قیام کے اپنے ممکنہ عزم کو کبھی خفیہ نہیں رکھا۔تاہم اس کے بعد برطانیہ اور فرانس نے مئی 1916ء میں ایک خفیہ معاہدہ کیا جس کو سائی کس پائی کاٹ معاہدہ کہا جاتا ہے جس کے مطابق جنگ کے بعد لبنان اور شام فرانس کو ملنا تھا اور عراق، اردن اور فلسطین برطانیہ کو۔

برطانیہ کے اس معاہدے کا راز 1917ء میں روسی حکومت نے اُس وقت افشا کیا

Marfat.com

جب جنگ عظیم اول کے درمیان میں ہی روس میں کمیونسٹوں نے زار کا تختہ الٹ کر اپنی حکومت قائم کرلی۔اعلان بالفور کا بھی اسی طریقے سے پتہ چلا۔

اِدھر یہ حال تھا اور اُدھر عرب، انگریزوں کے گن گا رہے تھے۔دسمبر 1917ء میں جب برطانوی افواج یروشلم پہنچیں تو یروشلم کے تمام شہریوں نے شہر سے باہر آکر ان کا والہانہ استقبال کیا، حالانکہ اس وقت تک برطانیہ کے یہودیوں سے کئے گئے تمام وعدے سامنے آچکے تھے۔

اس کے بعد اگلے تیس برس میں برطانیہ نے فلسطین میں یہودی آبادکاری کے لئے ہر جائز و ناجائز ہتھکنڈوں سے کام لیا۔تاہم برطانیہ کی اس کوشش میں بہت سے عربوں نے بھی اپنا حصہ یوں ادا کیا کہ شام اور لبنان میں بیٹھے ہوئے تمام غیر حاضر زمینداروں نے منہ مانگی قیمت پر اپنی زمینیں یہودیوں کو فروخت کردیں۔بہت سے فلسطینیوں نے بھی اپنی زمین یہودیوں کو فروخت کردی اگرچہ بہت سے لوگوں اور اہلِ علم نے انہیں اس سے روکا۔

جب یہودیوں کی آبادی کافی بڑھ گئی تب وہاں کے مسلمانوں کو ہوش آیا اور 1936ء سے لے کر 1939ء تک فلسطینیوں نے برطانوی حکومت کے خلاف بغاوت کی۔مگر اس بغاوت کے مقابلے میں برطانوی اور یہودی اکٹھے تھے، چنانچہ بغاوت کچل دی گئی۔یہ بھی ایک دلخراش حقیقت ہے کہ اُس وقت بھی فلسطینی آپس میں تقسیم تھے، جب کہ یہودی پہلے دن سے ہی ایک متحد تنظیم ''جیوش ایجنسی'' کے تحت منظم تھے۔اس کے ساتھ ہی یہودیوں نے ایک منظم اور تربیت یافتہ فوج بھی تیار کرلی۔یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس مملکت کے قیام کے لئے یہودیوں نے جتنی قربانی دی، اس کی تاریخ میں مثالیں بہت کم ہیں۔مختلف حکومتوں کے خوف سے بھاگنے والے تو خیر آ ہی رہے تھے، لیکن بہت بڑے مالدار اور نامی گرامی یہودی بھی اپنی آرام دہ زندگی چھوڑ کر فلسطین کے صحراؤں میں آکر اپنے مستقبل کی مملکت کی تعمیر میں جُت گئے۔

فلسطین میں یہودیوں کی آبادی آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی۔ساری دنیا سے یہودی

Marfat.com

اپنے مستقبل کے قومی وطن کی خواہش میں یہاں آتے گئے۔دوسری جنگ عظیم کے دوران میں جرمنی سے بھاگ کر آنے والوں کی تعداد میں بہت اضافہ ہوا، کیونکہ ایک اندازے کے مطابق ہٹلر نے ساٹھ لاکھ یہودیوں کو قتل کر دیا تھا اور باقی جان بچا کر فلسطین بھاگ آئے۔1948ء میں یعنی اسرائیل کے قیام کے وقت وہاں سات لاکھ اٹھاون ہزار یہودی بس گئے تھے۔جب برطانیہ نے دیکھا کہ اب وہاں ایک یہودی وطن بن سکتا ہے تو اس نے اس پورے علاقے کو اقوام متحدہ کے حوالے کر دیا۔اس وقت صورت حال یہ بنی کہ امریکہ اور روس سمیت تمام طاقت ور ممالک اسرائیل کے حامی تھے۔چنانچہ نومبر 1947ء میں اقوام متحدہ نے ایک قرارداد کے ذریعے فلسطین کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کا اعلان کیا۔اسرائیل کو کل رقبے کا چھپن (56%) فیصد دیا گیا، حالانکہ یہودیوں کی آبادی اُس وقت کل آبادی کی ایک تہائی تھی اور فلسطینی ریاست کو چوالیس (44%) فیصد دیا گیا، حالانکہ فلسطینیوں کی آبادی دو تہائی تھی۔ یہ صریحاً ایک ناجائز تقسیم تھی۔چنانچہ فلسطینیوں اور اردگرد کے عرب ممالک نے اسے ماننے سے انکار کر دیا۔

راقم کے نزدیک اُس وقت فلسطینیوں اور دیگر عرب ممالک کا یہ انکار ایک غلطی تھی۔اس لئے کہ یہ انکار زمینی حقائق کے خلاف تھا اور اس سے فلسطینیوں کو مزید نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔اُس وقت تمام بڑی طاقتیں اسرائیلی ریاست کے قیام کے حق میں تھیں۔یہودی، مسلمانوں کی نسبت بہت زیادہ طاقت ور اور پر جوش تھے۔اس کے مقابلے میں مسلمان ممالک کمزور اور آپس میں ایک دوسرے سے دشمنی رکھنے والے تھے۔بات یہ ہے کہ اپنا مقصد کبھی نہیں بھولنا چاہیے لیکن سمجھوتہ ہمیشہ پیش آمدہ حالات کی بنیاد پر کرنا چاہیے۔اور اُس وقت کا صبر سے انتظار کرنا چاہیے جب حالات ایک نئی کروٹ لے لیں۔سمجھوتہ کبھی بھی منصفانہ نہیں ہوا کرتا، بلکہ یہ ہمیشہ عملی ہوا کرتا ہے۔

یہ بات بھی بہت اہم ہے کہ اردن کا شاہ عبداللہ بھی فلسطینی ریاست کا سخت مخالف تھا۔اس لئے کہ اس سے اُس کو اپنی ریاست کے لئے خطرہ محسوس ہوتا تھا۔چنانچہ اس نے اسرائیلی

Marfat.com

حکومت سے خفیہ مذاکرات کر کے فلسطینی ریاست رکوانے اور اس کے بعض حصوں پر خود قبضہ کرنے اور بعض حصوں پر اسرائیلیوں کو قبضہ کرنے کی اجازت دینے کا خفیہ سمجھوتہ کرلیا۔

چودہ مئی 1948ء کو آخری برطانوی رجمنٹ کے رخصت ہوتے ہی اسرائیل نے اپنی آزادی کا اعلان کرلیا۔لیکن فلسطین نے اپنی آزادی کا اعلان نہیں کیا۔حالانکہ ہونا یہ چاہیئے تھا کہ فلسطینی اپنی چوالیس فیصد زمین پر آزادی کا اعلان کرتے اور بقیہ زمین حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کرتے۔اس کے بجائے اردگرد کے چار عرب ممالک شام، اردن، مصر اور عراق نے مل کر اسرائیل کے خلاف اعلان جنگ کرلیا۔یہ تمام افواج بہت کمزور، نیم تربیت یافتہ، اور مورال کے لحاظ سے انتہائی پست تھیں۔یہ سب ملک آپس میں ایک دوسرے کے بھی دشمن تھے اور ان کے بہت سے کمانڈر اسرائیلیوں سے ملے ہوئے تھے۔چنانچہ ان کو شکست فاش اٹھانی پڑی۔اسرائیل نے مزید علاقے پر قبضہ کرلیا۔اب اس کے پاس ستتر (77%) فیصد علاقہ تھا۔مغربی کنارے کو اردن نے اور غزہ کی پٹی کو مصر نے اپنے قبضے میں کرلیا۔گویا فلسطینی ریاست نہ بننے کے جرم میں اسرائیل کے ساتھ یہ دونوں ممالک بھی شریک تھے۔کیونکہ اگر یہ دونوں ممالک اپنے زیر قبضہ علاقوں میں فلسطینی ریاست بنا دیتے تو ساری دنیا اس کو فوراً تسلیم کرلیتی اور اسرائیل سے مزید گفت وشنید نہایت آسان ہوتی۔

عرب ممالک نے ایک اور طریقہ سے بھی اسرائیل کو بڑا فائدہ پہنچایا۔وہ یوں کہ 1948ء سے پہلے کے اسرائیل میں یورپ سے آنے والے اعلیٰ تعلیم یافتہ یہودی شامل تھے۔ان کو اشکینازے (Ashkenaze) کہا جاتا ہے۔لیکن 1948ء کے بعد آنے والے لاکھوں یہودیوں میں سے اکثر کا تعلق مشرقی ممالک خصوصاً مسلم عرب ممالک یعنی تیونس، مراکش، مصر وغیرہ سے ہے۔ان کو سیفارڈم (Sephardim) کہا جاتا ہے۔اسرائیل میں اب انہی مشرقی یہودیوں کی اکثریت ہے۔عرب ممالک چاہتے تو ان یہودیوں کے بدلے ریاست فلسطین کے لئے گفت وشنید کرسکتے تھے۔مگر ان کے ہاں اس امر کا کوئی شعور نہ تھا۔

Marfat.com

اکتوبر 1956ء میں اسرائیل نے صحرائے سینا اور غزہ کی پٹی پر حملہ کر کے انہیں دو دن کے اندر فتح کر لیا۔ دو دن بعد برطانیہ اور فرانس کی فوجیں، پہلے سے اسرائیل کے ساتھ طے شدہ منصوبے کے تحت، نہر سویز میں اتر گئیں اور اس پر قبضہ کر لیا۔ اس مداخلت پر امریکہ نے سخت ردعمل کا اظہار کیا اور صدر روز ویلٹ کے الٹی میٹم پر قابض افواج یہ جگہیں خالی کرنے پر مجبور ہو گئیں۔ اس سے عربوں خصوصاً مصر کو یہ سبق حاصل ہونا چاہیئے تھا کہ اسرائیل کے مقابلے میں وہ کتنے کمزور ہیں اور اپنی کمزوری دور کرنے کی طرف توجہ دینی چاہیئے تھی۔ مگر اس کے برعکس اس پورے عرصے کے دوران میں تمام عرب ریاستیں آپس میں لڑتی بھڑتی رہیں۔ مصر اور سعودی عرب کی افواج کئی برس تک یمن میں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا رہیں۔ کچھ عرب ممالک امریکی کیمپ میں شامل تھے اور کچھ روس کے گن گاتے تھے۔ بذات خود روس اور امریکہ دونوں اسرائیل کے پورے پورے پشتی بان تھے۔

جون 1967ء میں ایک اور عرب اسرائیل جنگ ہوئی۔ اس وقت مصر کے صدر جمال عبدالناصر تھے، جو بلاضرورت نعرے بازی، دھمکیوں اور پر جوش تقریروں میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ اُن کا تکیہ کلام ہی یہ تھا کہ ہم اسرائیل کو اٹھا کر بحیرہ روم میں غرق کر دیں گے۔ مئی کے اواخر اور جون کے شروع میں انہوں نے ہر جگہ یہ کہنا شروع کیا کہ ہم اسرائیل سے جنگ کے لئے تیار ہیں اور بس اسرائیل پر ہمارا حملہ ہوا ہی چاہتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے بحیرہ روم میں تمام بحری جہازوں کی آمد و رفت رکوا دی۔ اقوام متحدہ کے امن مشن کو، جو اسرائیل اور مصر کی سرحدات پر موجود تھا، باہر نکال دیا اور کہا کہ ہم اسرائیل پر حملے کے لئے اپنی افواج جمع کر رہے ہیں۔

بجائے اس کے کہ عرب ممالک اسرائیل پر حملہ کرتے، پانچ جون 1967ء کو اسرائیل نے نہایت خاموشی سے تینوں عرب ملکوں یعنی مصر، شام اور اردن پر بیک وقت حملہ کر دیا۔ ایک دن کے اندر اندر اس نے ان تینوں ممالک کے تمام ہوائی جہازوں کو ختم کر دیا اور سب ہوائی اڈے تباہ کر دیے۔ چھ دن کے اندر اندر اسرائیل نے مصر سے ساری غزہ کی پٹی اور صحرائے سینا چھین

Marfat.com

لئے۔صحرائے سینا کا رقبہ ساٹھ ہزار مربع کلو میٹر سے زیادہ ہے، یعنی بذاتِ خود اسرائیل کے رقبے سے تین گنا زیادہ۔خود صدر ناصر کے مطابق اس وقت سویز کینال سے لے کر قاہرہ تک مصری فوج کا ایک سپاہی بھی موجود نہ تھا۔اور اگر اسرائیلی فوج چاہتی تو آسانی کے ساتھ قاہرہ پر قابض ہو سکتی تھی۔اس کے ساتھ اسرائیل نے اردن سے دریائے اردن کا سارا مغربی کنارہ بشمول یروشلم اپنے قبضے میں کر لیا اور شام سے گولان کی پہاڑیاں، جن کا رقبہ ایک ہزار ایک سو پچاس مربع کلو میٹر ہے، چھین لیں۔گویا اس جنگ میں اسرائیل نے سارے کے سارے فلسطین پر قبضہ کر لیا۔

چھ اکتوبر 1973ء کو مصر کے صدر انور السادات اور شام نے بیک وقت اسرائیل سے اپنے مقبوضہ علاقے واگزار کرانے کے لئے اس پر حملہ کیا۔ابتدا میں ان دونوں کو کامیابی ہوئی۔مگر امریکہ کی طرف سے ہنگامی بنیادوں پر اسرائیل کی بہت بڑی اسلحی امداد نے جنگ کا پانسہ پلٹ دیا۔شام کے محاذ پر اسرائیل نے مزید علاقے پر قبضہ کر لیا اور سویز کے محاذ پر اس کی افواج مغربی ساحل پر بھی اتر گئیں۔اسی جنگ پر بعد میں تبصرہ کرتے ہوئے انور السادات نے کہا کہ اس جنگ سے مجھے یہ احساس ہو گیا کہ میں اسرائیل سے تو لڑ سکتا ہوں مگر امریکہ سے نہیں لڑ سکتا۔

1978ء میں سادات نے امریکی ثالثی کے ذریعے کیمپ ڈیوڈ میں اسرائیل سے سمجھوتہ کیا، جس کے تحت اسرائیل نے صحرائے سینا خالی کر دیا۔گویا سادات نے مصر کا علاقہ تو واپس لے لیا مگر فلسطین کا جو پورا علاقہ اس کے پاس تھا یعنی غزہ کی پٹی اور جسے اسرائیل نے 1967ء میں قبضہ کر لیا تھا، اسے اس نے اسرائیل ہی کے قبضے میں رہنے دیا۔ان مذاکرات میں شام اور فلسطین کے لیے خالی کرسیاں رکھی جاتی تھیں، مگر شام اور تنظیم آزادئ فلسطین نے ان مذاکرات کا بائیکاٹ کیا۔بعد میں ان دونوں کو اسرائیل کے ساتھ مذاکرات پر مجبور ہونا پڑا۔گویا ان دونوں طاقتوں کو چاہیے تھا کہ وہ بھی اُس وقت مذاکرات میں شریک ہو جاتیں۔تاہم مصر کے لیے بھی یہ بات بہت نامناسب تھی کہ غزہ کا جو علاقہ اسرائیل نے اُس سے چھینا تھا، اُس کا ذکر اور فیصلہ مذاکرات میں آیا ہی نہیں۔

Marfat.com

یوں تو فلسطین کی لاتعداد سیاسی اور عسکری تنظیمیں قائم ہوئیں۔ مگران میں سب سے اہم پی ایل او ہے۔ جس کا قیام 1964ء میں عمل میں لایا گیا تھا۔ اس کے بنیادی چارٹر میں یہ بات شامل تھی کہ سارا فلسطین (بمعہ اسرائیل) فلسطینیوں کا ہے اور یہودیوں کا اس میں کوئی حق نہیں۔ اس تنظیم کے عسکری بازو کو ''فلسطین لبریشن آرمی'' کا نام دیا گیا۔ الفتح کی بنیاد 1957ء میں رکھ دی گئی تھی۔ 1967ء سے لے کر 1970ء تک مختلف مسلح فلسطینی تنظیموں نے اسرائیل کے خلاف بہت سی گوریلا کاروائیاں کیں۔ ستمبر 1970ء اور جولائی 1971ء میں ان مسلح تنظیموں کی اردن کی افواج سے لڑائی ہوگئی جس کے نتیجے میں انہیں اردن سے نکال دیا گیا۔ اسی طرح لبنانی فوج کے ساتھ لڑائی کے بعد وہاں بھی ان کا خاتمہ کر دیا گیا۔ اس کے بعد مصر اور شام نے بھی اپنی سرحدوں کی طرف سے ان کی مسلح کاروائیوں پر پابندی لگا دی۔ 1987ء میں اسرائیل نے لبنان میں موجود فلسطینی گوریلوں کا خاتمہ کرنے کے لئے اسی (80) دن تک ایک آپریشن کیا جس کے بعد ایک معاہدے کے تحت چھ ہزار فلسطینی جنگجوؤں کو یمن، تیونس، الجزائر اور سوڈان کے دور دراز کیمپوں میں منتقل کر دیا گیا۔ ان تمام ناکامیوں کی وجہ سے پی ایل او نے اسرائیل کو ختم کرنے کا نکتہ واپس لے لیا۔ اور اس کے ساتھ پرامن طریقے سے ایک فلسطینی ریاست کے قیام کو اپنا مقصد بنالیا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ عسکریت کیوں ناکام ہوئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پی ایل او ایک تنظیم ضرور تھی، بلکہ تقریباً ایک سو تنظیموں کا ایک اتحاد تھی، مگر اس کی پشت پر کوئی ایسی ریاست نہیں تھی جو کھلم کھلا اس کو اپناتی اور اسرائیل کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ رکھتی۔ اس لئے ایک ایک کر کے تمام عرب ممالک نے اس کو اپنے سے دور (یعنی disown) کیا۔ یہ تنظیم اپنے مسلح حملوں کے ذریعے زیادہ سے زیادہ یہ کرسکتی تھی کہ اسرائیل کو تنگ کرے۔

دوسری طرف پی ایل او کو اس اتحاد اور ایک متفقہ لیڈر یاسر عرفات چننے کا بڑا سیاسی فائدہ پہنچا۔ 1974ء میں یاسر عرفات نے فلسطین کے نمائندے کی حیثیت سے اقوام متحدہ کی

Marfat.com

جنرل اسمبلی سے خطاب کیا۔ اقوام متحدہ نے فلسطین کو ایک قوم تسلیم کیا اور اس کے حق خود ارادیت کے لئے کئی قراردادیں منظور کیں۔

19 اگست 1993ء کو اسرائیل اور پی ایل او کے درمیان ''اوسلوامن معاہدہ'' ہوا۔ اس معاہدہ پر گواہوں کی حیثیت سے امریکہ اور روس کے وزرائے خارجہ نے دستخط کئے۔ یہ معاہدہ دوسال کے خفیہ مذاکرات کے بعد طے پایا۔ اس معاہدے کا فائدہ یہ ہوا کہ اسرائیل نے باضابطہ طور پر فلسطینی ریاست کو نظری اعتبار سے تسلیم کرلیا۔ اس معاہدے کا منفی نکتہ یہ ہے کہ اس میں ایک پیچیدہ اور بہت آہستہ روطریقہ کار کے مطابق فلسطینی اتھارٹی کو اختیارات تفویض کئے جانے تھے۔ ظاہر ہے کہ ایک ایسے علاقے میں جو انتہائی حساس ہو، جہاں بیسوں نقطہ نظر کے لوگ بستے ہوں، جہاں لاکھوں لوگوں کے پاس اسلحہ ہو، جہاں پر ہر کوئی دوسرے کو شک کی نگاہ سے دیکھتا ہو، وہاں ایک تنظیم کو بہت محدود قسم کے اختیارات تفویض کئے جائیں اور اس سے یہ توقع رکھی جائے کہ ان اختیارات سے کام لے کر اپنے لوگوں کو قابو کرے گی۔ ایسی توقع رکھنا بالکل غلط ہے۔ اس سے حالات مزید پیچیدہ ہونگے اور نئے نئے مسائل جنم لیں گے۔ اس کے بجائے صحیح طریقہ کار یہ تھا کہ فلسطینی وفد اس بات پر اصرار کرتا کہ فلسطینی حکومت کو مغربی کنارے اور غزہ کی پٹی پر مکمل اختیار دے کر یہ ریاست تسلیم کر لی جائے اور اسی طریقے سے یہ ریاست وجود میں آجائے، جس طرح ریاستیں وجود میں آیا کرتی ہیں۔ بے شک یہ مذاکرات کامیاب نہ ہوتے لیکن اس موقف سے انحراف نہ کیا جاتا۔

راقم کا تجزیہ یہ ہے کہ اسرائیل جانتا تھا کہ اتنے پیچیدہ طریقِ کار کا کیا نتیجہ نکلنا ہے، لیکن اس نے جان بوجھ کر فلسطینی وفد کو پھنسایا تاکہ فلسطینی اتھارٹی ناکام ہو جائے اور آخری حل میں اسرائیل کو مزید رعایتیں اور غرب اردن کی مزید زمین مل جائے۔ فلسطین وفد اس جال میں پوری طرح پھنس گیا۔ اس معاہدے کا دوسرا منفی نکتہ یہ تھا کہ اس میں حساس ترین مسئلے یعنی یروشلم کی تقسیم اور دیوار گریہ اور قبۃ الصخرۃ کے مستقبل کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا گیا تھا۔ ان کے

Marfat.com

بغیر بھلا مذاکرات کا کیا مطلب تھا۔ چنانچہ اس معاہدے پر عمل درآمد میں دونوں فریقوں کی طرف سے ناکامی ہوئی اور حالات مزید بگاڑ کی طرف چلے گئے۔

حماس اور پہلا انتفاضہ:

دسمبر 1987ء میں حماس کے نام سے ایک ایسی مزاحمتی تحریک سامنے آئی جو اپنے جذبات کی آبیاری اسلام سے کرتی ہے۔ اس کے رہنما جسمانی طور پر معذور لیکن انتہائی باصلاحیت شیخ احمد یاسین تھے۔ اس تنظیم کے کارکن اجتماعی اخلاقیات کے اعتبار سے دوسری تنظیموں سے بہت ممتاز تھے، اس لئے اسے جلد مقبولیت حاصل ہو گئی۔ اگلے سال اس تحریک نے انتفاضہ یعنی مزاحمت شروع کی۔ اس کی مزاحمت کا انداز اچھوتا تھا۔ بچوں، خواتین اور نوجوانوں کے پاس چھوٹے چھوٹے پتھر ہوتے جنہیں وہ اسرائیلی ٹینکوں اور بکتر بند گاڑیوں پر پھینکتے۔ ظاہر ہے اس سے ان ٹینکوں کا تو کچھ نہ بگڑتا مگر اس سے اس مزاحمت کی مظلومیت، اس کا برحق ہونا اور اس کا عزم بھرپور طریقے سے ظاہر ہو جاتا۔ یہ بین الاقوامی طور پر اپنے آپ کو منوانے اور عوام کو متحد، منظم اور پرعزم رکھنے کا نہایت اچھا ذریعہ تھا۔ یہ تحریک اصلاً عدم تشدد کی تحریک تھی۔ اسی لئے ہمیشہ اس تحریک کے لوگ تو شہید ہوتے رہے لیکن اس نے کسی اسرائیلی بچے یا خاتون پر تشدد نہیں کیا۔ اس سے اس تحریک کی اخلاقی ساکھ پوری دنیا میں بیٹھ گئی۔

اس راقم کے نزدیک یہ اپنی اصل میں نہایت قابل قدر تحریک تھی، تاہم اس کے دو اجزا صحیح نہیں تھے۔ ایک یہ کہ اس تحریک کا مقصد بھی یہی تھا کہ اسرائیل کو جڑ سے اکھاڑا جائے۔ درپیش صورت حال میں یہ ناقابل عمل بات تھی۔ دوسرا یہ کہ ٹینک کو پتھر مارنا بذات خود عدم تشدد ہے لیکن اس میں تشدد کے جراثیم موجود تھے۔ یہ اقدام کسی بھی وقت اس سے کسی اگلے قدم میں تبدیل ہو سکتا ہے۔ عدم تشدد کی صحیح حکمت عملی موجودہ دنیا میں وہی ہے جو گاندھی، قائداعظم اور نیلسن منڈیلا نے استعمال کی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اس تحریک کے پہلے چار سالوں میں اس میں عوام کی شرکت اور اس کی اخلاقی ساکھ فقید المثال رہی۔ لیکن آخری دو سالوں میں اس نے بھی دوسری تنظیموں کی طرح

Marfat.com

مسلح اقدامات شروع کر دئے۔جس سے فلسطینی عوام آپس میں بری طرح تقسیم ہو گئے۔

فلسطینی اتھارٹی کا اقتدار

5 جولائی 1994ء کو فلسطینی انتظامیہ نے دستوری حلف اٹھایا۔اس کے بعد فلسطینی انتظامیہ کے سامنے چند بڑے مسائل نے جنم لیا۔پہلا مسئلہ یہ تھا کہ حماس اور اسلامی جہاد غرب اردن اور اسرائیل کے اندر مسلح کاروائیاں کر رہی تھیں۔اسرائیل نے مطالبہ کیا کہ ان کاروائیوں کو روک دیا جائے۔فلسطینی اتھارٹی کے پاس ان کو روکنے کی کوئی طاقت نہیں تھی چنانچہ اسرائیل نے اس کو بہانہ بنا کر اسے اوسلو معاہدے پر عمل درآمد میں سب سے بڑی رکاوٹ قرار دیا۔ٹیکس جمع کرنا،امن برقرار رکھنا،مجرموں کو سزائیں دینا ایسے کام ہیں جن سے عوامی مقبولیت میں کمی آتی تھی۔چنانچہ عوام کی طرف سے بھی فلسطینی اتھارٹی کے ساتھ تعاون نہیں تھا۔

بدقسمتی سے جس طرح عام طور پر مسلمانوں میں آمریت کے جراثیم ہیں،وہی حال یاسر عرفات اور اس کی پوری ٹیم کا ہوا۔اتھارٹی نے اپنے سیاسی مخالفین کو جیل میں ڈال دیا۔کرپشن بہت بڑھ گئی۔علاقہ ایک پولیس سٹیٹ کا منظر پیش کرنے لگا۔کاروبار خراب ہو گئے۔چنانچہ اس اتھارٹی کی بین الاقوامی اور اندرونی پوزیشن بہت خراب ہو گئی۔اور اسرائیل کو یہ موقعہ مل گیا کہ وہ اس صورت حال کو ایکسپلائیٹ کرے۔

تاہم اس معاہدے کے کچھ فوائد بھی ہوئے۔اگر فلسطینی قوم متحد رہتی اور فلسطینی اتھارٹی کی فروگزاشتوں پر تنقید کرتے ہوئے خالصتاً عدم تشدد سے کام لیتی تو بعد کی آزمائش اور مصیبتیں کم ہو سکتی تھیں۔مثلاً اس معاہدے کے بعد فلسطینی ریاست کو دنیا کو دوتہائی ممالک نے تسلیم کر لیا۔نوے فیصد فلسطینی عملاً اسرائیل کے قبضے سے آزاد ہو گئے اور اب ہر فلسطینی کے پاس اسرائیلی پاسپورٹ کے بجائے فلسطین کا پاسپورٹ ہے۔تاہم حماس نے اس درمیان میں خودکش حملوں کا سلسلہ جاری رکھا۔اس صورت حال سے اسرائیل کی انتہا پسند لیکوڈ پارٹی نے فائدہ اٹھایا اور 1996ء میں وہ انتخابات جیت گئی جس سے فلسطینیوں کے راستے میں مزید مشکلات پیدا ہو

Marfat.com

گئیں۔

جولائی 2000ء کے مذاکرات

جولائی 2000ء میں کیمپ ڈیوڈ میں صدر کلنٹن کے ذریعے یاسر عرفات اور اسرائیل کے اعتدال پسند لیبر پارٹی کے وزیراعظم ایہود بارک کے درمیان مذاکرات ہوئے۔ یہ مذاکرات کئی دن جاری رہے۔ کلنٹن نے ان مذاکرات کی کامیابی کی سرتوڑ کوشش کی مگر یہ کامیاب نہ ہو سکے۔ ناکامی کی اصل وجوہات دو تھیں ایک یہ کہ یروشلم کے معاملے میں یاسر عرفات کا رویہ غیر لچکدار تھا۔ اور دوسرا یہ کہ ایہود بارک نے اُن چھ لاکھ (جن کی تعداد اب بہت بڑھ چکی ہے) فلسطینی مہاجرین کو واپس لینے سے انکار کر دیا جو 1948ء کی عرب اسرائیل جنگ میں بے گھر ہو گئے تھے۔ بالآخر کلنٹن نے ایک فامولہ پیش کیا، جس کے مطابق مسجد اقصیٰ اور مشرقی یروشلم فلسطین کے پاس ہوتا اور دیوار گریہ سمیت مغربی یروشلم اسرائیل کے پاس ہوتا۔ واضح رہے کہ مشرقی یروشلم میں دولاکھ فلسطینی بستے ہیں اور مغربی یروشلم میں ساڑھے چار لاکھ یہودی بستے ہیں۔ مہاجرین کے متعلق کلنٹن کی تجویز تھی کہ انہیں فلسطینی ریاست میں آباد کیا جائے اور ان کی آباد کاری کے سارے اخراجات امریکہ برداشت کرے گا۔ یہ فارمولہ ایہود بارک نے منظور کر لیا اور یاسر عرفات نے اسے مسترد کر دیا، چنانچہ مذاکرات ناکام ہو گئے۔

راقم کے نزدیک یہ فلسطینیوں اور یاسر عرفات کی سب سے فاش غلطی تھی۔ انہیں جو کچھ مل رہا تھا، اس سے زیادہ ملنا مستقبل قریب میں ناممکن تھا۔

اس حل کے بارے میں تفصیلی بحث ہم بعد میں کریں گے، جب بیت المقدس، قبۃ الصخرا، دیوار گریہ اور مسجد اقصیٰ جیسی اصلاحات کی وضاحت کی جائے گی۔

28 دسمبر کے بعد دوسرا انتفاضہ

مذاکرات کی ناکامی سے معتدل وزیراعظم ایہود بارک کی اپنے ملک میں مقبولیت کم ہو گئی اس لئے کہ وہ اس وعدے پر برسراقتدار آیا تھا کہ وہ فلسطینیوں کے ساتھ معاہدہ کرے

Marfat.com

گا۔اس کی اس کم ہوتی ہوئی مقبولیت سے اس کے حریف لیکوڈ پارٹی کے لیڈر ایریل شیرون نے فائدہ اٹھانے کا سوچا۔چنانچہ اس نے یہ اعلان کیا کہ وہ 28 دسمبر 2000ء کو قبۃ الصخرا کا باہر سے دورہ کرے گا۔واضح رہے کہ اس کا یہ دورہ مسجد اقصیٰ کا نہیں تھا۔مسجد اقصیٰ کی نگرانی آج بھی اردن کی وزارت اوقاف کے پاس ہے۔قبۃ الصخرا ایک چٹان کے اوپر گنبد کا نام ہے۔(یہی وہ گنبد ہے جس کی تصویر کو لوگ عام طور پر غلطی سے مسجد اقصیٰ سمجھتے ہیں)۔جس کی ایک تاریخی اہمیت ضرور ہے مگر اس کی کوئی دینی اہمیت نہیں۔اس طرح ایرل شیرون دو مقاصد حاصل کرنا چاہتا تھا۔ایک یہ کہ وہ اسرائیلی عوام کو یہ دکھانا چاہتا تھا کہ وہ فلسطینیوں کے خلاف،ایہود بارک کے برعکس،ایک سخت موقف اختیار کرنے والا فرد ہے۔دوسرا وہ اس طریقے سے فلسطینیوں کو اشتعال دلانا چاہتا تھا تاکہ ہنگامے ہوں،حالات ایہود بارک کے کنٹرول میں نہ رہیں اور اسے نئے انتخابات کروانے پڑیں۔

سوال یہ ہے کہ اس وقت کونسی حکمت عملی فلسطینی عوام کے حق میں بہتر تھی؟۔کیا انہیں اشتعال میں آنا چاہیئے تھا؟اور یا انہیں شیرون کی چال ناکام بنانی چاہیئے تھی؟ ظاہر ہے ان کے حق میں صحیح حکمت عملی یہ تھی کہ وہ اس دورے کی زبانی کلامی خوب مذمت کرتے،مگر کوئی متشددانہ اقدام نہ کرتے تاکہ شیرون کی سازش ناکام ہو جاتی۔مگر فلسطینی،شیرون کی چال میں آگئے۔اگلے دن سے ایک نیا انتفاضہ شروع ہو گیا۔پرتشدد ہنگامے شروع ہو گئے۔اگلے چند دن مہینوں میں ان ہنگاموں میں سینکڑوں فلسطینی اور بیسویں یہودی کام آئے۔بالآخر ایہود بارک کو نئے انتخابات کا اعلان کرنا پڑا،جس میں شیرون نے باسٹھ (62) فیصد ووٹ لے کر ریکارڈ کامیابی حاصل کی۔

شیرون کی کامیابی کے بعد اسرائیل کی طرف سے ظلم و بربریت کا ایک نیا دور شروع ہو گیا۔فلسطینیوں کی طرف سے ہر تشدد کا اسرائیل کی طرف سے دس گنا ردعمل کے ساتھ جواب دیا گیا۔کئی کئی دن تک یاسر عرفات کے دفتر کا محاصرہ کیا گیا۔اس کے دفتر کی بجلی اور پانی کو بند کر دیا گیا۔حتیٰ کہ اس کے لئے خوراک کی فراہمی بھی بند کر دی گئی۔بلڈوزروں کے ذریعے مشتبہ افراد

Marfat.com

کے گھر مسمار کر دیئے گئے۔

اسی دوران میں فلسطینیوں کی طرف سے خودکش حملے شروع ہو گئے۔ یوں تو اس سے بہت پہلے سے اکا دکا خودکش حملے جاری تھے، مگر اب باقاعدہ ایک ترتیب کے ذریعے یہ کیے گئے۔ کچھ خودکش حملے تو براہ راست فوجی تنصیبات پر کیے گئے لیکن کئی حملے سول جگہوں مثلاً ریستوران، بسوں اور عام علاقوں میں کیے گئے۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ اسرائیل کے اندر خوف کی ایک فضا بن گئی۔ اور اس کا نقصان یہ ہوا کہ باقی دنیا نے اسرائیل کے خلاف ان خودکش حملوں کی مذمت کر دی۔

یہ خودکش حملے حکمت عملی اور اصول دونوں کے خلاف تھے۔ خودکش حملوں کے لئے وہی انسان اپنے آپ کو پیش کرتا ہے جو انتہائی پرعزم اور بہادر ہو۔ ایسے ہی لوگ کسی تحریک کا اصل سرمایہ ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ جب اپنی جان، جان آفرین کے سپرد کر دیتے ہیں تو یہ تحریک کے لئے ایک بڑا نقصان ہوتا ہے۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب ایسے حملوں کی رفتار کو برقرار رکھنا ممکن نہیں ہوتا۔ اصولی اعتبار سے بھی یہ حملے غلط ہیں۔ خصوصاً جب یہ حملے غیر فوجی تنصیبات کے خلاف ہوں اور اس میں عام لوگ ہلاک ہوں تو عام انسان کا ضمیر بھی اسے گوارا نہیں کرتا۔

ایسے حملوں کا توڑ کرنے کے لئے حریف طاقتیں بھی اپنی حکمت عملی بنا لیتی ہیں۔ اسرائیل نے اس سے نمٹنے کے لئے یہ حکمت عملی اپنائی کہ خودکش حملہ آوروں کا گھر مسمار کر دیا اور ان کے رشتہ داروں کو جلاوطن کر دیا۔ ظاہر ہے کہ اسرائیل کا یہ طرز عمل بہت ظالمانہ اور غلط تھا۔ مگر بہر حال اس سے یہ خودکش حملے آہستہ آہستہ تھم گئے۔

انتفاضہ کا یہ دوسرا دور کسی مثبت نتیجہ کے بغیر ختم ہو گیا۔ اس سے فلسطینیوں کے جان و مال کا بڑا نقصان ہوا۔ اور یہ بات صاف واضح ہو گئی کہ اس سے پہلے اسرائیل فلسطینی ریاست کے لئے جتنی زمین دینے کے لئے تیار تھا، اب وہ ان سے بھی سخت تر شرائط پر معاملہ کرے گا۔

Marfat.com

امریکہ کا نیا روڈ میپ

امریکہ نے یہ الزام لگایا کہ امن منصوبے کے راستے میں اصل رکاوٹ یاسر عرفات ہے اور جب تک وہ کسی اور فرد کو وزیراعظم نامزد نہیں کر لیتا، تب تک امریکہ اس مسئلے میں کوئی دلچسپی نہیں لے گا۔ چونکہ ساری دنیا جانتی ہے کہ اگرچہ امریکہ، اسرائیل کا پشتی بان اور حمایتی ہے، لیکن اس کے بغیر یہ مسئلہ حل تو کیا، ایک انچ آگے بھی نہیں سرک سکتا، ملکہ مسلسل فلسطینیوں کے لئے مشکل سے مشکل تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس لئے یاسر عرفات پر ہر طرف سے یہ دباؤ پڑا کہ ایک بااختیار وزیراعظم مقرر کرے۔ چنانچہ اس نے اپنے ایک قریبی ساتھی محمود عباس (ابو مازن) کو وزیراعظم نامزد کیا۔ یہ نام امریکیوں کو بھی قبول تھا۔ اس لئے انہوں نے اس کا خیر مقدم کیا اور صدر بش نے مشرق وسطیٰ کے لئے اپنا روڈ میپ دے دیا۔ اس روڈ میپ کے مطابق اگلے دو برس میں ایک آزاد فلسطینی ریاست کا وجود عمل میں آنا تھا اور اس مقصد کے لئے ایک ایسا پروگرام ترتیب دیا گیا جس میں ہر اہم مرحلے پر اسرائیل اور فلسطین کو ایک ایک قدم لینا تھا۔ اس روڈ میپ میں تین اہم ترین مسائل یعنی فلسطینی مملکت کی حدود، یروشلم کا مستقبل اور فلسطینی مہاجرین کی وطن واپسی کا کوئی حل نہیں دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ اصل حل کا انحصار تو انہی مسائل پر ہے۔ یہ روڈ میپ یاسر عرفات کے ساتھ ساتھ شیرون کو بھی منظور نہیں تھا۔ لیکن امریکہ کے دباؤ پر دونوں فریقوں کو یہ منظور کرنا پڑا۔ اس روڈ میپ کے بعد دونوں طرف سے تشدد کا سلسلہ کسی حد تک کم ہو گیا۔ اسرائیلی فوج کچھ شہروں سے نکل گئی۔ تاہم عمل درآمد کی رفتار تسلی بخش نہیں۔ اسرائیل کی طرف سے غرب اردن، اور غزہ کو اسرائیل سے علیحدہ کرنے والی بہت بڑی دیوار کے منصوبے نے مزید مشکلات پیدا کر دی ہیں۔ اسرائیل کا کہنا ہے کہ یہ دیوار اس لئے تعمیر کی جا رہی ہے کہ تخریب کاروں پر نظر رکھی جا سکے۔ فلسطین کا کہنا ہے کہ یہ دیوار جان بوجھ کر اس طرح تعمیر کی جا رہی ہے کہ غرب اردن اور غزہ کا زیادہ سے زیادہ علاقہ اسرائیل اپنے ساتھ شامل کر سکے اور بالآخر یہی دیوار سرحد بنے۔

Marfat.com

فی الوقت اس روڈ میپ کا ذکر بالکل ہی غائب ہوگیا ہے، اس لیے کہ حالات کی پیچیدگی کی وجہ سے مذاکرات کا سارا سلسلہ بند ہوگیا ہے۔ خودکش حملوں کی وجہ سے اسرائیل کو یہ بہانہ مل گیا کہ چونکہ فلسطینیوں کی طرف سے روڈ میپ کی پابندی نہیں کی جارہی، اس لیے اب وہ بھی اس کا پابند نہیں ہے۔ اسرائیل نے فلسطینی جنگجو تنظیموں کے ساتھ ساتھ نہتے فلسطینیوں کے خلاف بہت بڑی کاروائیوں کا آغاز کردیا اور یہ سلسلہ ابھی تک وقتاً فوقتاً جاری ہے۔

یوں لگتا ہے کہ امریکی روڈ میپ اپنی موت آپ آچکا ہے۔ اس وقت مکمل تعطل کی صورت ہے۔ متفقہ فلسطینی رہنما یاسر عرفات گیارہ نومبر 2004ء کو وت ہوگئے۔ اسی دوران میں اسرائیل نے اعلان کیا کہ وہ غزہ کی پٹی سے اپنی فوج واپس بلالے گا اور وہاں موجود یہودی نوآبادیوں کو ختم کردے گا۔ اس فیصلے سے اسرائیل کا مقصد یہ تھا کہ غزہ کی پٹی کی طرف سے اُس پر خودکش حملے بند ہوجائیں۔ واضح رہے کہ زیادہ تر خودکش حملے غزہ کی پٹی کی طرف سے ہوتے تھے۔ چنانچہ 2005ء میں اسرائیل نے غزہ کے علاقے کو عملاً آزاد کردیا۔

اسی اثناء میں فلسطین کے اندر نئے انتخابات کا وقت قریب آگیا۔ اس انتخاب میں دو بڑی پارٹیاں ایک دوسرے کے مدمقابل تھیں، یعنی الفتح اور حماس۔ الفتح اسرائیل کے وجود کو تسلیم کر کے اُس کے ساتھ مذاکرات کے ذریعے فلسطینی ریاست بنانے کے حق میں تھی۔ جب کہ حماس نے اسرائیل کے وجود کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔ اس موقع پر حماس کو دو مزید معاملات میں برتری ملی۔ ایک یہ کہ الفتح کی موجودہ حکومت نہایت کرپٹ تھی، جب کہ اس کے مقابلے میں حماس کے رہنماؤں کو بہت دیانت دار سمجھا جاتا تھا۔ دوسرا یہ کہ چونکہ غزہ کی پٹی میں حماس کی ایک واضح اکثریت تھی، اس لیے اس پٹی سے اسرائیل کے انخلا کو حماس نے اپنی کامیابی سے تعبیر کیا۔ جب پچیس جنوری 2006ء کو انتخاب ہوا، تو حماس نے ستر فیصدی (70%) نشستیں حاصل کرلیں۔

اب اس موقعے پر ایک ڈیڈ لاک کی کیفیت نے جنم لیا۔ وہ یوں کہ صدارت کے

Marfat.com

عہدے پر الفتح کے محمود عباس فائز تھے، اور وزارت عظمیٰ، حماس کے اسماعیل حانیہ کے پاس تھی۔ دونوں کی پالیسیوں میں زمین آسمان کا فرق تھا، چنانچہ مستقلاً بحران کی ایک کیفیت رہی۔ اس راقم کا تجزیہ یہ ہے کہ اُس وقت محمود عباس کو استعفیٰ دینا چاہیے تھا اور پورا اقتدار حماس کے حوالے کرنا چاہیے تھا۔ یہی جمہوری اصولوں کا تقاضا تھا، اور ممکن تھا کہ اس طرح اسرائیل اور حماس دونوں کے موقف میں ایک دوسرے کے لیے لچک آجاتی۔ تاہم ایسا نہ ہوا۔

فروری 2007ء میں سعودی عرب کی کوششوں سے ''معاہدہ مکہ'' ہوا، جس کے تحت دونوں پارٹیوں پر مشتمل حکومت وجود میں آئی۔ تاہم چونکہ دونوں پارٹیوں کے مسلح ونگ موجود تھے، اس لیے کھچاؤ کی کیفیت جاری رہی۔ جون 2007ء میں حماس کے مسلح ونگ نے غزہ کی پٹی میں الفتح کے مسلح ونگ اور اس کے دفاتر پر حملہ کر کے ان پر قبضہ کرلیا۔ اس لڑائی میں دونوں طرف کے سینکڑوں لوگ مارے گئے۔ اس لڑائی کے نتیجے میں غزہ کی پٹی مکمل طور پر حماس کے قبضے میں آگئی۔ دوسری طرف محمود عباس، جو کہ مغربی کنارے میں موجود تھے، نے حماس کی حکومت کو ختم کرنے کا اعلان کردیا، اور ایک عبوری کابینہ بنادی۔ گویا فلسطینی ریاست وجود میں آنے سے قبل ہی دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ فلسطینی ریاست کے آئین کے مطابق یہ ضروری ہے کہ جلد از جلد نیا انتخاب کرایا جائے۔ حماس نے نئے انتخاب کی مخالفت کی ہے۔ مستقبل کا اغلب منظرنامہ شاید یہ ہے کہ غزہ کی پٹی میں انتخاب منعقد نہیں ہوسکے گا، اور مغربی کنارے میں انتخاب منعقد ہوجائے گا، جس کے نتیجے کے متعلق فی الوقت کچھ کہنا ممکن نہیں۔ اس راقم کا نقطہ نظر یہ ہے کہ پورے فلسطین میں نیا انتخاب ہونا چاہیے تاکہ نئے حالات کی روشنی میں فلسطینی عوام اپنے مستقبل کا تعین کرسکیں۔ اگر اس انتخاب میں حماس ایک دفعہ پھر جیت جاتی ہے، تو پھر محمود عباس کو صدارت سے استعفیٰ دینا چاہیے تاکہ حماس کو اپنی پالیسیاں نافذ کرنے کے لیے کھلا میدان مل جائے۔ (یہ سطور 22 جولائی 2007ء کو قلم بند کی گئیں)۔

Marfat.com

اسرائیل کی تعمیر میں امریکہ کا کردار

اسرائیل کی تخلیق اصلاً برطانیہ کی مرہون منت ہے۔اور اسرائیل کی تعمیر میں یہودیوں کی ان اتھک جدوجہد کے ساتھ ساتھ امریکی یہودیوں کا پیسہ اور حکومت امریکہ کی مسلسل مادی واخلاقی امداد بھی شامل ہے۔

فی الوقت یہودیوں کی سب سے زیادہ تعداد امریکہ میں بستی ہے جن کی تعداد باون (52) لاکھ ہے۔اس کے بعد اسرائیل کا نمبر آتا ہے جہاں اڑتالیس (48) لاکھ یہودی بستے ہیں۔امریکی یہودی انتہائی بااثر اور مالدار ہیں۔ ہر اہم ادارے میں ان کے بہت مضبوط لوگ ہیں۔دونوں سیاسی پارٹیوں میں اہم ترین عہدوں پر وہ فائز ہیں۔اگرچہ ان یہودیوں کے اندر بہت سے معاملات پر بے شمار اختلافات پائے جاتے ہیں تاہم اسرائیل کی سلامتی، بقا، تحفظ اور تعمیر کے معاملے میں وہ سب پوری طرح متحد ہیں۔یہی وجہ ہے کہ کسی امریکی حکومت کے لئے اسرائیل کی مخالفت کرنا ممکن نہیں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسرائیل کے قیام کے پہلے دن سے ہی اسے امریکی امداد کی فراہمی شروع ہوگئی۔ یہ امداد دو شکلوں میں ہے۔ایک شکل امریکی یہودیوں کی طرف سے اسرائیل کو براہ راست رقم کی فراہمی اور دوسری شکل امریکی حکومت کی طرف سے ریاستی سطح پر امداد۔امریکہ کی طرف سے سب سے زیادہ امداد اسرائیل کو ملتی ہے۔ بلکہ یہ کسی بھی ملک کی طرف سے کسی بھی ملک کو ملنے والی سب سے زیادہ امداد ہے۔صرف یہی نہیں بلکہ اگر اسرائیل کو کوئی مسئلہ درپیش آجائے مثلاً کسی جنگ میں اس کے اخراجات ہو جائیں تو امریکہ فوراً اس نقصان کو پورا کردیتا ہے۔اسرائیل نے جان بوجھ کر اپنے ملک میں ایسی طرز معاشرت رکھی ہوئی ہے کہ اگر امریکہ سے کوئی سیاح اسرائیل چلا جائے تو اسے کسی غیریت کا احساس نہ ہو۔اس معاملے میں اسرائیل نے یہودی نظامِ اخلاقیات کی تمام پابندیوں کی دھجیاں اڑائی ہوئی ہیں۔درحقیقت اسرائیل نے ایک بڑے عرصے سے یہ شعوری فیصلہ کیا ہوا ہے کہ وہ مشرقِ وسطیٰ میں امریکی مفادات کا رکھوالا ہوگا اور

Marfat.com

عملاً امریکہ کے اکیاون ویں (51st) ریاست کی حیثیت سے زندگی گزارے گا۔ چنانچہ یہ ایک تلخ حقیقت ہے، تاہم ہمیں اس کا شعور ہونا چاہیے کہ مستقبل قریب میں بھی اسرائیل کے لئے امریکی امداد یونہی جاری رہے گی۔

چند اہم نکات:

اب تک کی بحث سے چند اہم نکات ہمارے سامنے آتے ہیں

☆ اسرائیل کی تخلیق برطانیہ نے کی اور اس کی تعمیر میں امریکہ نے ایک بڑا کردار ادا کیا

☆ مسلمانوں کی خودغرضی، کوتاہ اندیشی، غلط فیصلوں، عدم جمہوریت اور حقائق کی بنیاد پر حکمت عملی نہ بنانے کی روش نے اسرائیل کے قیام کو آسان اور اس کی تعمیر کو آسان تر بنا دیا ہے۔ مثلاً اگر سلطنت عثمانیہ میں جمہوریت اور صوبائی خودمختاری ہوتی، اگر وہ ہوا کا رخ بھانپ کر عرب مقبوضات کو آزادی دے دیتی اور اگر ترکی کی حکومت پہلی جنگ عظیم میں کود نہ پڑتی تو اسرائیل کا قیام ناممکن حد تک مشکل ہوتا۔

☆ عربوں کی نااتفاقی، عاقبت نااندیشی اور اپنے ذاتی مفادات کے لئے اجتماعی مقاصد کو قربان کرنے کی روش نے بھی اسرائیل کی تعمیر اور تسلسل میں پورا کردار ادا کیا۔ مثلاً پہلی جنگ عظیم میں عربوں نے برطانیہ کی حمایت کی۔ قیام اسرائیل کے وقت فلسطینی ریاست نہ بننے کے معاملے میں اسرائیل اور اردن کے شاہ عبداللہ نے باقاعدہ خفیہ معاہدہ کیا۔ پچھلے پچاس سال میں تمام عرب مسلسل آپس میں لڑتے رہے۔ اردن اور مصر نے فلسطینی ریاست پر قبضہ کیا اور اپنے زیرقبضہ علاقے میں فلسطینی ریاست نہ بننے دی۔ سادات نے اسرائیل سے گفت وشنید میں صحرائے سینا تو واپس لے لیا، مگر غزہ کا علاقہ بدستور اس کے قبضے میں رہنے دیا، حالانکہ وہ علاقہ اسرائیل نے مصر سے ہی چھینا تھا۔

☆ فلسطین کے معاملے میں عربوں نے ہمیشہ حکمت عملی اور زمینی حقائق کے خلاف قدم اٹھایا۔ 1917ء میں اعلان بالفور اور سائی کس پیکاٹ معاہدہ منظر عام پر آچکا تھا۔ یہی وہ

Marfat.com

وقت تھا جب عربوں کو انگریزوں کے ساتھ میز پر بیٹھ کر ایک قابلِ عمل معاہدہ کر لینا چاہیئے تھا۔ اس وقت عربوں اور انگریزوں کی طاقت میں ایک نسبت ہزار کا فرق تھا۔ اور جب یہ صورت ہو تو قابلِ عمل پر امن معاہدہ ہی کمزور قوم کے مفاد میں ہوتا ہے۔ پھر 1948ء میں اگر عرب اقوام متحدہ کی قرارداد منظور کر لیتے تو آج کی نسبت ایک تہائی اسرائیل وجود میں آتا۔ اس کے بعد بھی اگر عرب اپنے زیر قبضہ علاقہ میں فلسطینی ریاست بنا دیتے تو اسرائیل سے گفت وشنید آسان ہو جاتی اور یروشلم بمعہ بیت المقدس مسلمانوں کے پاس رہتا۔ اگر صدر ناصر مبالغہ آمیز دعوے نہ کرتے، اور مسلسل دھمکیاں دینے کے بجائے اپنی مملکت کے دفاع کی طرف توجہ دیتے تو 1967ء کا سانحہ پیش نہ آتا۔ اسی طرح فلسطینیوں کی طرف سے ہر متشددانہ کاروائی نے ان کی آزادی کو مزید دور اور ان کے ممکنہ علاقے کو مزید محدود کر دیا ہے۔

☆ آج اسرائیل کم آبادی والی ایک بڑی طاقت بن چکا ہے جس کے پاس سینکڑوں ایٹم بم بھی ہیں۔ دنیا کی تمام بڑی طاقتوں کے ساتھ اس کے تعلقات ہیں۔ ٹیکنالوجی اور فی کس آمدنی لحاظ سے وہ دنیا کے سرفہرست ملکوں میں شامل ہو گیا ہے۔ اردگرد کے تمام عرب ممالک کی مجموعی معاشی، فوجی اور اسلحی ذخائر سے اُس کے ذخائر کہیں زیادہ ہیں۔ کئی مسلمان ممالک بشمول اردن، مصر، تنظیم آزادیٔ فلسطین، قطر اور ترکی نے اسے تسلیم کیا ہوا ہے اور ان کے ساتھ اس کے سفارتی تعلقات قائم ہیں۔

چنانچہ اب ہمیں اس امر پر غور وفکر کرنا ہے کہ موجودہ حالات میں فلسطینیوں اور مسلمانوں کے لئے بہتر اور قابلِ عمل حل کیا ہے۔

اس سوال کے جواب سے پہلے ہمیں بیت المقدس اور یروشلم کی صورت حال کو سمجھنا ہوگا۔ یروشلم اس شہر کا نام ہے جہاں یہ مقدس احاطہ ''بیت المقدس'' کے نام سے موسوم ہے جسے ہیکل سلیمانی بھی کہا جاتا ہے یہ ایک احاطے کا نام ہے جس کی لمبائی اندازاً پندرہ سو (1500) فٹ ہے اور چوڑائی اندازاً ایک ہزار (1000) فٹ ہے۔ یہ دراصل وہ جگہ ہے جہاں حضرت سلیمانؑ

Marfat.com

نے ایک بڑا عمارتی کمپلکس بنایا تھا جو ان کا سیکرٹریٹ تھا۔ اس کی تعمیر کے ساڑھے تین سو برس بعد بابل کے بادشاہ نبوکدنظر نے اس کو تباہ کر دیا۔ اس کے تقریباً ستر سال بعد ان کو دوبارہ یہ جگہ تعمیر کرنے کی اجازت ملی اس لئے کہ اس وقت وہاں فارس کے بادشاہ کا قبضہ ہو چکا تھا۔ اس کے بعد یہ جگہ کئی دفعہ مختلف حملہ آوروں کی طرف سے تباہی کا نشانہ بنتی اور بار بار تعمیر ہوتی رہی۔ حتیٰ کہ پہلی بڑی تباہی کے ساڑھے چھ سو برس بعد یعنی 70ء میں رومی حکومت نے اس کو بالکل تباہ کر دیا۔ یہود کا قتل عام کیا اور زندہ بچ جانے والے یہودیوں کو جلاوطن کر دیا۔ اس تباہی میں ہیکل کی صرف مغربی دیوار کا ایک حصہ محفوظ رہ گیا۔ یہی وہ دیوار ہے جسے اب دیوار گریہ (Wailing Wall) کہا جاتا ہے یعنی وہ جگہ جہاں یہودی آ کر اپنی عظمت رفتہ کی یاد میں روتے ہیں اور عبادات کرتے ہیں۔ یہ گویا ان کے لئے مقدس ترین جگہ اور ان کا قبلہ ہے۔

اس دوسری تباہی کے پانچ سو ستر سال بعد یعنی 638ء میں مسلمانوں نے حضرت عمرؓ کے وقت میں یروشلم فتح کیا۔ حضرت عمرؓ نے اس پوری جگہ کو، جہاں کوڑا کرکٹ پڑا ہوا تھا، صاف کیا اور اس کے جنوب میں ایک جگہ نماز پڑھنے کے لئے مخصوص کر دی۔ یہی جگہ اب مسجد اقصیٰ ہے۔ موجودہ مسجد اقصیٰ کی لمبائی تقریباً ساڑھے چھ سو (650) فٹ اور چوڑائی اندازاً تین سو (300) فٹ ہے۔ راقم کا تجزیہ یہ ہے کہ حضرت سلیمانؑ کے وقت اُن کی اصل مسجد اسی جگہ واقع تھی، اسی لئے حضرت عمرؓ نے خاص اسی جگہ کو مسجد ٹھہرایا۔ ورنہ وہ چاہتے تو اس تمام احاطے کو مسجد قرار دے سکتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے باقی احاطے کو عیسائیوں یا یہودیوں کے لئے ممنوع قرار نہیں دیا۔

درمیان میں اٹھاسی (88) سال کے ایک وقفے کے سوا پچھلے چودہ سو سال سے یہ پوری جگہ مسلمانوں کے قبضے میں رہی۔ 1967ء میں اسرائیل نے اس پر قبضہ کر لیا۔ تاہم حکومتِ اسرائیل نے مسجد پر قبضہ نہیں کیا، بلکہ اس جگہ کی چابیاں حکومتِ اردن کے حوالے کر دیں۔ اس وقت سے لے کر اب تک مسجد کا کنٹرول یروشلم کے مسلم وقف کے پاس ہے۔

Marfat.com

قبۃ الصخرا: اس پورے احاطے کا ایک انتہائی اہم حصہ ''قبۃ الصخرا'' ہے۔ اہم اس
لئے ہے کہ اس کے متعلق مسلمانوں کی معلومات بہت کم ہیں۔ یہ دراصل ایک چٹان ہے جس
کی اونچائی تقریباً پانچ فٹ ہے۔ اس چٹان کے اردگرد لکڑی کا ایک کٹہرا ہے۔ اس کے اوپر ایک بڑا
سبز گنبد ہے۔ یہی وہ گنبد ہے جو ہر تصویر میں نظر آتا ہے اور جسے عام مسلمان لاعلمی کے باعث مسجد
اقصیٰ کی گنبد سمجھتے ہیں۔ یہ بالکل ایسی ہی ایک جگہ ہے جیسے ہمارے ہاں مزار اور گنبد والا مقبرہ ہوتا
ہے۔ صرف اتنا فرق ہے کہ یہاں مزار کے بجائے چٹان ہے۔ گویا یہ کوئی مسجد نہیں بلکہ محض ایک
یادگار ہے۔

اس کی تعمیر کی داستان بھی دلچسپ ہے۔ صحابہ کرامؓ کے زمانے میں اس چٹان اور اس
سے ملحق جگہ کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی۔ یہاں نماز بھی نہیں پڑھی جاتی تھی۔ اسے مسجد کا حصہ بھی نہیں
بنایا گیا۔ یعنی یہ کوئی تقدس کی حامل جگہ نہیں تھی۔ بعد میں بنوامیہ کے زمانے میں ولید بن عبدالملک
نے اس پر گنبد تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ دراصل اُس وقت مکہ معظمہ میں ولید کے مخالف عبداللہؓ بن زبیر
کی حکومت تھی اور جو لوگ بھی باہر سے حج کے لئے جاتے تھے، ان سے ابن زبیر اپنی حکومت کی
بیعت لیتے تھے۔ چنانچہ ولید نے اپنی مملکت کے لوگوں کو حج پر جانے سے روک دیا اور یہاں اس
چٹان کو ایک مقدس مقام قرار دیا تاکہ حج کے بجائے لوگ یہاں آئیں اور اس جگہ کا طواف
کریں۔ ظاہر ہے کہ اس اقدام کا دینی تعلیمات سے کوئی تعلق نہیں تھا بلکہ یہ ایک سیاسی اقدام تھا۔
جب بھی کسی جگہ کو باقاعدہ ایک مقصد کے تحت تقدس دی جاتی ہے تو یہ ضروری ہوتا ہے
کہ اس کی عظمت سے متعلق داستانیں لوگوں میں پھیلائی جائیں اور اس کے متعلق قصے کہانیاں
مشہور کی جائیں۔ چنانچہ قبۃ الصخرا کے متعلق بھی یہی ہوا ہے اور اس ضمن میں بہت سی احادیث بھی
گھڑی گئیں۔ اس طرح کی من گھڑت روایات کو احادیث کی چھ اہم ترین کتابوں میں سے کسی
نے اپنے ہاں جگہ نہیں دی۔ تمام اہل علم ان روایات کو انتہائی ضعیف قرار دیتے ہیں اور ابن القیم اور
البانی جیسے علمائے حدیث ان کو جھوٹا اور من گھڑت کہتے ہیں۔

Marfat.com

Marfat.com

(پورے بیت المقدس کا خاکہ)

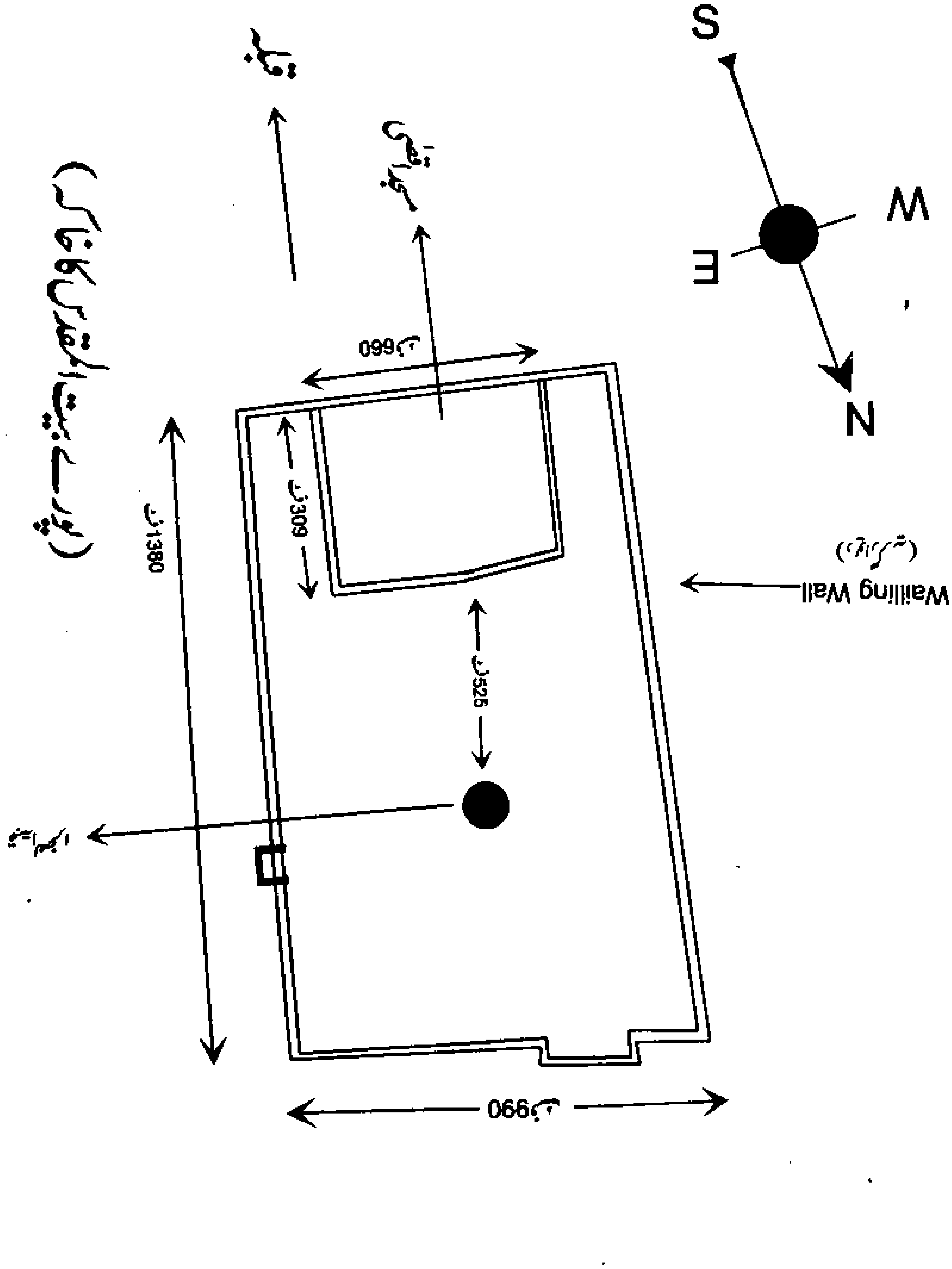

Marfat.com

چونکہ خانہ کعبہ، مسجد اقصیٰ سے جنوب کی طرف ہے۔اس لئے جب مسلمان مسجد اقصیٰ میں نماز پڑھتے ہیں تو ان کی پشت قبۃ الصخرا کی طرف ہوتی ہے۔یہ قبہ، مسجد اقصیٰ کی عمارت سے تقریباً پانچ سو (500) فٹ شمال میں ہے۔یہی وہ جگہ ہے جہاں 28 ستمبر 2000ء کا اس وقت کے اسرائیل کے حزب اختلاف کے رہنما ایریل شیرون نے باہر سے دورہ کیا تھا جس کے نتیجہ میں دوسرا انتفادہ اور فسادات پھوٹ پڑے تھے۔

قارئین کو سمجھانے کے لئے اس پوری جگہ کا خاکہ دیا جارہا ہے۔

یہاں تین اہم سوالات پر غوروفکر ضروری ہے۔ایک سوال یہ ہے کہ کیا سارا احاطہ بیت المقدس یعنی 1500x1000 مربع فٹ جگہ مسلمانوں کا قدرتی، اخلاقی اور مذہبی حق ہے۔اس کا جواب یہ ہے کہ ایسا نہیں ہے۔کیونکہ حضرت عمرؓ نے اس کا ایک ٹکڑا مسجد اقصیٰ کی شکل میں مسجد کے لئے مختص کردیا تھا۔باقی احاطے میں کسی بھی مذہب سے تعلق رکھنے والے کسی بھی فرد کے آنے جانے پر کوئی پابندی نہیں لگائی گئی۔چنانچہ آج بھی اگر کوئی ایسا معاہدہ ہوجائے جس میں تمام مذاہب کے تقدس واحترام کو مدنظر رکھا جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوا کہ پچھلے ساٹھ برس سے معرکہ فلسطین سے متعلق تصویر میں مسجد اقصیٰ کی تصویر تو کہیں نظر نہیں آتی اور ہمیشہ قبۃ الصخرا کی تصویر ہی نمایاں ترین حصے کے طور پر سامنے لائی جاتی ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ فلسطینیوں کی لیڈر شپ شروع سے ہی سیکولر لوگوں کے ہاتھ میں رہی ہے۔اس لئے انہوں نے دانستہ طور پر ایک مذہبی عمارت کو اپنا شعار بنانے سے گریز کیا۔بعد میں جب اسلامی ذہن رکھنے والے لوگوں کو بھی آزادیٔ فلسطین کی تحریک میں اہمیت حاصل ہوگئی تو چونکہ ان پر بھی جذبات کا غلبہ تھا۔اس لئے انہوں نے یہ موقف اختیار کرکیا کہ اس پورے احاطے پر مسلمانوں کے علاوہ کسی کا حق نہیں۔چنانچہ انہوں نے بھی مسجد اقصیٰ کو نمایاں کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ کیا دینی اعتبار سے یہ ممکن ہے کہ ہم اس پوری زمین کے کسی حصے

Marfat.com

پر اسرائیل نامی ایک ریاست کو تسلیم کر کے قانونی طور پر یہودیوں کا یہ حق مان لیں کہ وہ بھی یہاں رہ سکتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ اسرائیل کا وجود بے انصافی، ظلم اور جبر کے نتیجے میں وجود میں آیا ہے اور اس لحاظ سے اس کی اخلاقی حیثیت کچھ بھی نہیں۔ تاہم اس دنیا میں بے شمار ممالک ظلم اور جبر ہی کے نتیجے میں وجود میں آئے ہیں اور ہم سیاسی حقیقت کے طور پر ان کا وجود تسلیم کرتے ہیں اور ان سے معاملات کرتے ہیں، مثلاً ہم امریکہ پر ریڈ انڈین کے بجائے موجودہ سفید فام لوگوں کا وجود تسلیم کرتے ہیں۔ اسی طرح ہم سنکیانگ پر چین کی عمل داری تسلیم کرتے ہیں۔ یہی حال اسرائیل کا ہے۔ دینی اعتبار سے ہمارے لئے کافی ہے کہ مسجد اقصیٰ اور اس تک پہنچنے کے راستے مسلمانوں کے قبضے میں ہوں تا کہ ہم اپنے اس تیسرے مقدس ترین مقام تک آسانی اور خود اعتمادی سے پہنچ سکیں۔ باقی رہا اسرائیل کو تسلیم کرنے کا سوال، تو یہ دینی نہیں بلکہ سیاسی ایشو ہے۔ مسلمان ممالک اس کے مثبت اور منفی اثرات کا معروضی جائزہ لے کر اس کا کوئی بھی مناسب فیصلہ کر سکتے ہیں۔ ہمارا کام تو یہ دیکھنا ہے کہ دستیاب حالات میں مسلمانوں کے لئے بہترین حکمت عملی کونسی ہے، جس کے ذریعے مسلمان امن و وقار سے رہ سکیں اور ترقی کر سکیں۔

حل

مسئلہ فلسطین کے حل میں اس وقت تین معاملات سب سے زیادہ اہم ہیں۔ ایک یہ کہ غرب اردن اور غزہ کی پٹی کا کتنا حصہ فلسطین کو دیا جائے۔ دوسرا یہ کہ یروشلم کے مقدس مقامات کو کیسے تقسیم کیا جائے اور تیسرا یہ کہ جو فلسطینی 1948ء مہاجر ہو گئے تھے۔ ان کی دوبارہ آباد کاری کہاں اور کیسے کی جائے۔ جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے، انصاف کا تقاضا تو یہ ہے کہ یہ دونوں علاقے سو فیصد فلسطینی ریاست کی عمل داری میں دئے جائیں۔ تاہم مسئلہ یہ ہے کہ ان دونوں علاقوں خصوصاً غرب اردن میں اسرائیل نے بہت سی یہودی آبادیاں تعمیر کر لی ہیں۔ چنانچہ اگر ان میں سے کچھ آبادیوں پر فلسطین کی طرف سے لچک دکھائی جائے تو مناسب ہے۔ ویسے بھی فلسطینی ریاست کا اصل مسئلہ زمین نہیں ہے اس لئے کہ اردگرد کے عرب ممالک کے پاس بے تحاشہ علاقے

Marfat.com

ہیں اور اگر وہ چاہیں تو اپنے کچھ علاقے (مثلاً صحرائے سینا) فلسطین کے حوالے کر کے اسے اسرائیل سے کئی گنا بڑا ملک بنا سکتے ہیں۔

دوسرا مسئلہ یروشلم کے مقدس مقامات کا ہے۔جیسا کہ قارئین کے مطالعے میں آچکا ،اس مسئلے کا قابل عمل حل موجود ہے۔وہ یہ کہ مسجد اقصیٰ اور یروشلم کا مسلم اکثریتی علاقہ،فلسطین کے حصے میں آئے اور دیوارِ گریہ،مغربی یہودی اکثریتی علاقے سمیت اسرائیل کو دیا جائے۔جہاں تک قبۃ الصخرا کا تعلق ہے،اسے فلسطین اور اسرائیل کی مشترکہ عمل داری میں دیا جاسکتا ہے۔یہ بھی عین ممکن ہے کہ اسرائیل،اسے مکمل طور پر فلسطین کو دینے پر رضا مند ہو جائے۔اس لئے کہ وہاں عام طور پر یہودی زائرین نہیں جاتے۔اس پورے رقبے جسے ''الحرم الشریف'' بھی کہا جاتا ہے،کا ایک قابلِ عمل حل یہ بھی ہے کہ اسے سب زائرین کے لیے کھلا چھوڑ دیا جائے اور اقوام متحدہ کی ضمانت کے ساتھ اس رقبے پر اسرائیل اور فلسطین کی یکساں عمل داری ہو۔

تیسرا مسئلہ ان لاکھوں فلسطینیوں کا ہے جو 1948ء میں مہاجر ہو گئے تھے۔انصاف کا تقاضا تو یہ ہے کہ ان سب کو واپس اپنے اپنے گھروں کو آنے کی اجازت دی جائے۔ان کے سابقہ گھر موجودہ اسرائیل میں واقع ہیں۔تاہم اسرائیل کبھی یہ بات نہیں مانے گا،اس لئے کہ اس طرح اسرائیل میں یہودی اقلیت میں تبدیل ہو جائیں گے۔یہ تاریخ کا ایک سفاک جبر ہے کہ مہاجرین کے لئے عموماً واپس اپنے علاقے میں جانا ممکن نہیں ہوتا۔مثلاً افغانستان سے روسی افواج کو نکلے ہوئے پندرہ برس ہو چکے،مگر افغان مہاجرین ابھی تک پاکستان میں ہی ہیں۔بنگلہ دیش میں پچھلے تیس برس سے لاکھوں بہاری،مہاجر کیمپوں میں زندگی بسر کر رہے ہیں،مگر پاکستان ان کو قبول کرنے سے انکاری ہے۔یہی صورت فلسطینی مہاجرین کی ہے۔ان کی آبادکاری کی سب سے قابل مل صورت یہ ہے کہ ان کو فلسطینی ریاست میں آباد کیا جائے اور اس کی ذمہ داری اقوام متحدہ اٹھائے۔

امت مسلمہ کی ترقی کے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ فلسطین میں امن قائم ہو جائے۔لیکن یہ تبھی ممکن ہے جب ہم اس امن کی قیمت ادا کر کے اسے خرید لیں۔

Marfat.com

تیرھواں باب

مسئلہ عراق

موجودہ عراق کی آبادی اندازاً دو کروڑ ہے۔اس کا رقبہ اندازاً چار لاکھ چالیس ہزار مربع کلومیٹر ہے۔اس کی آبادی چار واضح حصوں پر مشتمل ہیں۔اندازاً باون فیصد (52%) عرب شیعہ ہیں، اندازاً 23 فیصد (23%) عرب سُنی ہیں، اندازاً اٹھارہ فیصد (18%) کُرد ہیں، جب کہ سات فیصد (7%) آبادی ترکمند، آشوریوں اور آرمینین لوگوں پر مشتمل ہے۔یہ علاقہ حضرت عمرؓ کے دور میں ایرانیوں کے ہاتھوں سے مسلمانوں کی عمل داری میں آ گیا تھا۔1534ء میں عثمانی ترکوں نے اس علاقے پر قبضہ جمالیا۔یہ قبضہ تقریباً چار سو برس تک رہا،لیکن چونکہ ترکی سے عراق ایک لمبے فاصلے پر واقع تھا،اس لیے عموماً عراق میں نیم خود مختار حکومتیں رہیں۔جب سلطنت عثمانیہ نے پہلی جنگ عظیم میں جرمنی کا ساتھ دینے کا اعلان کرلیا تو انتقاماً برطانیہ نے ترکی کے زیرِ قبضہ سارے مقبوضات پر قبضہ کرنے کا فیصلہ کرلیا اور یوں 1920ء میں یہ علاقہ برطانیہ کے قبضے میں چلا گیا۔یہ وہ وقت تھا جب شریف حسین آف مکہ نے ترکی کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا اور برطانیہ نے اُس سے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ ترکی کے خلاف برطانیہ کا ساتھ دے گا تو سارے عرب علاقوں کو آزادی دے دی جائے گی۔چنانچہ عراق پر قبضے کے دو برس بعد، یعنی 1921ء میں انگریزوں نے شریف حسین کے بیٹے فیصل کو عراق کا بادشاہ بنا دیا۔تاہم اکثر اہم وزارتیں بدستور انگریز مشیروں ہی کے پاس رہی۔

جولائی 1958ء میں ایک فوجی انقلاب کے ذریعے بریگیڈیئر عبدالکریم قاسم نے اقتدار پر قبضہ جمالیا۔اس کے پانچ برس بعد ایک اور فوجی انقلاب آیا اور عبدالسلام عارف نے اقتدار سنبھال لیا۔جولائی 1968ء میں ایک اور فوجی انقلاب آیا اور احمد حسن البکر نے اقتدار چھین لیا۔پھر 1979ء میں صدام حسین برسرِاقتدار آیا اور یہاں سے عراق کی حقیقی بدقسمتی کا آغاز

Marfat.com

ہوا۔ اقتدار میں آنے کے ایک برس بعد صدام نے ایران کے خلاف ستمبر 1980ء میں جنگ شروع کردی۔ جو آٹھ برس تک جاری رہی۔ اگرچہ پہلے ایک برس میں عراق کو کچھ کامیابی ملی، اس کے بعد ایران نے اپنے علاقے سے عراقی افواج کو نکال باہر کیا۔ تاہم ایران نے اس پر بس نہیں کیا بلکہ وہ عراقی سرزمین کے اندر گھس گیا۔ شاید ایران کا خیال یہ تھا کہ عراق کی شیعہ آبادی اس کی حمایت کرے گی، تاہم اُس کی یہ امید پوری نہ ہوسکی اور عراقی افواج نے اپنے علاقوں کو دوبارہ حاصل کرلیا۔ اس کے اگلے چند برس بارڈر کے اردگرد یہ لڑائی مسلسل جاری رہی۔ حتیٰ کہ اگست 1988ء میں دونوں ملکوں کے درمیان جنگ بندی کا معاہدہ ہوگیا۔

اس لڑائی سے دونوں مسلمان ممالک کو بے حد نقصان پہنچا۔ دونوں کی معیشت جنگ کی نظر ہوگئی۔ ایک اندازے کے مطابق اس جنگ میں چھ لاکھ ایرانی اور چار لاکھ عراقی جاں بحق ہوئے۔ اس جنگ کی ابتدا کا اصل جرم صدام حسین پر عائد ہوتا ہے۔ تاہم جب ایران نے ایک برس کے اندر اندر اپنے علاقوں کو واپس لے لیا تھا، تو پھر اُسے بھی چاہیے تھا کہ وہ فاتحانہ انداز میں یک طرفہ طور پر جنگ بندی کا اعلان کرتا۔ اس سے فوجی فتح کے ساتھ ساتھ ایران کو ایک بہت بڑی اخلاقی فتح بھی مل جاتی۔ تاہم ایران نے ایسا نہ کیا اور اگلے سات برس تک یہ بے مقصد اور بے فائدہ جنگ جاری رہی۔ اس جنگ میں سارے عرب ممالک نے عراق کا ساتھ دیا اور پٹرو ڈالرز کے ذریعے اُس کی بڑی مدد کی۔ دوسری طرف اسرائیل نے اس جنگ سے یہ فائدہ اٹھایا کہ اُس نے جون 1981ء میں بغداد کے قریب نیوکلیئر ری ایکٹر پر حملہ کرکے دو منٹ کے اندر اندر اس پورے ری ایکٹر کو تباہ و برباد کیا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اسرائیل کے طیارے سعودی عرب اور اُردن کے بارڈرز کے اندر پرواز کرتے ہوئے عراق کے عین قلب میں پہنچے مگر ان تینوں ممالک کو کانوں کان خبر نہ ہوسکی۔ کیا یہ محض نااہلی تھی یا اس کے اندر کوئی اور کہانی بھی چھپی ہوئی تھی؟ اس کے بارے میں فی الحال ہم کچھ نہیں جانتے۔ اس آٹھ سالہ لڑائی میں اسلحہ بنانے والے ممالک کو بہت فائدہ پہنچا۔ گویا اس جنگ سے مغرب، بالخصوص امریکہ اور اسرائیل کو بہت بڑا فائدہ پہنچا۔ گویا

Marfat.com

کہنے کو تو ایران اور عراق دونوں اسرائیل کے مخالف تھے، مگر دونوں نے اپنے طرزِ عمل سے اسرائیل کو بہت فائدہ پہنچایا۔ صدام اس کی بنیاد بنا اور ایک سال بعد ایران نے بھی اس میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

اس جنگ کے خاتمے کے دو برس بعد یعنی اگست 1990ء میں عراقی فوج نے کویت پر حملہ کر کے اُسے فتح کر لیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عراق، کویت کے زیرِ قبضہ دو جزیروں پر ملکیت کا دعوے دار تھا۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کے تنازعات تقریباً سارے ہمسایہ ممالک کے درمیان میں ہوتے ہیں، لیکن ان کی بناء پر جنگ چھیڑنا پرلے درجے کی بے وقوفی ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب صدام حسین نے اس تنازعے کے بارے میں بغداد میں موجود امریکی خاتون سفیر سے گفتگو کی تو سفیر نے کہا کہ امریکہ اس تنازعے کے معاملے میں غیر جانبدار ہے۔ چنانچہ صدام نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کر لیا کہ اگر وہ کویت کے خلاف جنگ چھیڑ دے تو امریکہ مداخلت نہیں کرے گا۔ اگر واقعی صدام حسین نے اس بات سے یہ نتیجہ نکالا تھا تو اس کی عقل پر ماتم کیے بغیر چارہ نہیں۔ اور فرض کر لیجئے کہ امریکی سفیر نے اُسے کھلے الفاظ میں بھی اگر یہ شہہ دی کہ وہ کویت پر حملہ کر سکتا ہے، تو کیا صدام کو یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کے کیا اثرات ہوں گے۔ ویسے بھی صدام کا دعویٰ تو صرف دو چھوٹے جزیروں پر تھا۔ اگر وہ ان دو جزیروں پر قبضہ کر لیتا تو حالات شاید پھر بھی قابو میں رہتے۔ لیکن اُس نے تو آگے بڑھ کر پورے کویت پر بھی قبضہ کر لیا۔

اس قبضے کے فوراً بعد ساری دنیا نے عراق کی مذمت کی اور اقوام متحدہ نے اُسے الٹی میٹم دیا کہ وہ کویت کو خالی کر دے، ورنہ اُس کے خلاف فوجی کاروائی کی جائے گی۔ عراق نے ان چند مہینوں سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا اور وہ امریکہ اور اُس کے اتحادیوں کا موڈ بھی نہیں سمجھ سکا۔ چنانچہ ساڑھے پانچ مہینے بعد یعنی جنوری 1991ء کو امریکہ اور اُس کی اتحادی افواج نے عراقی شہریوں پر بمباری شروع کر دی یہ بمباری تقریباً ایک مہینہ جاری رہی اور اس بمباری میں عراق کا تقریباً سارا انفراسٹرکچر تباہ ہو کر رہ گیا، مگر صدام اپنی ضد پر اڑا رہا۔ چنانچہ فروری میں اتحادی افواج نے

Marfat.com

زمینی حملہ شروع کیا اور دو تین دن کے اندر اندر کویت کو آزاد کر لیا۔ اس لڑائی کی بھی عالم اسلام کو بہت بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔ کویت کی ساری دولت جنگی اخراجات کے نام پر امریکہ کے پاس چلی گئی۔ سعودی عرب کا بھی چالیس ارب ڈالر سے زیادہ کا خرچہ آیا، کیونکہ صدام نے کہہ دیا تھا کہ اس کے بعد وہ سعودی عرب پر بھی حملہ کرے گا۔ عراق کی اپنی ساری آمدنی بھی ختم ہو کر رہ گئی اور اُس کے تقریباً ڈیڑھ لاکھ فوجی اور شہری اس سارے جنگ میں جاں بحق ہو گئے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس جنگ کی وجہ سے عالم اسلام میں جذباتیت کو بہت زیادہ فروغ ملا۔ عوام نے عمومی طور پر یہ سمجھا کہ گویا کویت کو فتح کر کے اسرائیل کو فتح کر لیا گیا ہے اور یا پھر امریکہ کو زیر کر لیا گیا ہے۔

اس شکست کے بعد عراق پر پابندیوں کا ایک بڑا دور چلا۔ عراق کا جنوبی علاقہ، جو شیعہ آبادی پر مشتمل ہے، تقریباً خود مختار ہو گیا۔ امریکہ نے اس پورے علاقے کو عراقی فضائیہ کے لیے نو فلائی زون قرار دیا۔ دوسری طرف کُرد بھی تقریباً آزاد ہو گئے، وہی کُرد جن پر صدام حسین نے 1987ء میں کیمیاوی ہتھیار استعمال کر کے ہزاروں لوگوں، بشمول عورتوں اور بچوں کے، کو موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا۔ عراق کی تیل کی برآمدات پر مکمل پابندی لگا دی گئی اور اُسے صرف اتنا تیل برآمد کرنے کی اجازت دی گئی جو اُس کی خوراک کی ضروریات کو پورا کر سکے۔

نائن الیون کے سانحے کے ایک برس کے اندر اندر امریکہ نے صدام کے خلاف یہ پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ اس کے پاس بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیار (Weapons of Mass Destruction) موجود ہیں۔ یہ بات قطعاً جھوٹ تھی۔ برطانیہ کو چھوڑ کر سارے مغربی ممالک نے امریکی دعوے کو غلط قرار دے دیا۔ اقوام متحدہ کے سارے بڑے کمیشنوں کے سربراہوں نے بھی امریکی دعوے کو جھٹلایا۔ تاہم امریکی پروپیگنڈا جاری رہا۔ اُس وقت امریکی وزیر خارجہ کولن پاوَل نے سلامتی کونسل میں تقریر کرتے ہوئے اپنی طرف سے اس بات کے کچھ نام نہاد ثبوت بھی پیش کیے۔ اگرچہ بعد میں کولن پاوَل نے متعدد مرتبہ یہ اعتراف کیا کہ سلامتی کونسل میں اس کی یہ تقریر CIA کی طرف سے فراہم کردہ جھوٹ پر مبنی تھی

Marfat.com

اور یہ کہ وہ دن اس کی پوری زندگی میں سب سے زیادہ شرمساری کا دن تھا۔

امریکہ اس معاملے کو سلامتی کونسل میں لے گیا، لیکن روس، فرانس اور چین نے اُس کی حمایت کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ چنانچہ امریکہ نے خود ہی اس معاملے سے نمٹنے کی ٹھان لی۔ دسمبر 2002ء میں امریکہ نے صدام حسین کو یہ الٹی میٹم دیا کہ وہ اپنے قریبی ساتھیوں سمیت عراق چھوڑ دے۔ اُس وقت سعودی عرب نے اعلان کیا کہ وہ صدام اور اس کے ساتھیوں کو سیاسی پناہ دینے کے لیے تیار ہے۔ (اُس وقت راقم نے اپنے ایک مضمون کے ذریعے یہ لکھا کہ اگرچہ امریکہ کا الزام بالکل غلط ہے۔ تاہم ضرورت اس بات کی ہے کہ عراق عوام کو امریکہ کے ظلم وستم سے بچایا جائے۔ اس کا حل یہ ہے کہ صدام اقتدار عراقی دانشوروں پر مشتمل ایک عبوری حکومت کے حوالے کر کے خود اپنے خاندان سمیت سعودی عرب جائے اور یہ عبوری حکومت اگلے تین ماہ کے اندر اندر عراق میں انتخابات کروا کر ملک منتخب نمائندوں کے سپرد کر دے)۔ تاہم صدام نے اس موقعے سے بھی کوئی فائدہ نہ اٹھایا۔ اور وہ آنے والی تباہی کا کوئی تجزیہ ہی نہ کر سکا۔ ویسے بھی بدقسمتی سے عالم اسلام کے اندر وسیع تر مفادات کے لیے اپنی انا کو قربان کرنے کا رجحان بہت کم ہے۔

بالآخر مارچ 2003ء میں امریکہ نے عراق پر حملہ کر دیا اور بظاہر ایک مہینے کے اندر اندر عراق پر قبضہ کر لیا۔ امریکہ کی یہ کارروائی نہایت غیر اصولی اور ظالمانہ تھی۔ امریکہ نے عراق پر یہ حملہ کیوں کیا؟ اس کے متعلق مختلف تھیوریاں اور اس میں اس راقم کے نقطہ نظر کا تذکرہ پانچویں باب میں ہو چکا ہے۔ جنگ کے بظاہر اختتام کے فوراً بعد امریکہ نے دو بڑی غلطیاں کیں۔ ایک یہ کہ اُس نے عراقی فوج اور پولیس کے محکمے کو ختم کر دیا اور دوسری یہ کہ بعث پارٹی پر پابندی لگا دی۔ چنانچہ یہ سب لوگ زیرِ زمین چلے گئے۔ اس کے بعد عراق میں تین طرفہ لڑائی شروع ہو گئی۔ سب سے خوفناک لڑائی شیعوں اور سنیوں کے درمیان ہے۔ دوسری لڑائی شیعوں کے سخت ترین امریکہ مخالف گروہ اور امریکی فوج کے درمیان ہے، اور تیسری لڑائی سنیوں کی طرف سے شیعوں اور امریکی افواج پر خودکش حملوں کی شکل میں ہے۔ عراقی آرمی اور بعث پارٹی میں اکثریت سنیوں کی

Marfat.com

تھی جو جنگی مہارت کے اعتبار سے تربیت یافتہ تھے۔ دوسری طرف اہل تشیع کے عسکریت پسند بھی پچھلے کئی برس کے دوران میں جنگی تربیت حاصل کر چکے تھے۔ پچھلی کئی دہائیوں سے اقتدار عملاً سنیوں کے ہاتھ میں تھا اور اب ان کو یہ معلوم ہو گیا کہ مستقبل کے عراق میں انہیں دوسرے درجے کے شہری کی حیثیت سے زندگی گزارنی پڑے گی۔ چنانچہ 2003ء کے وسط میں خاک وخون اور خودکش حملوں کا جو کھیل شروع ہوا ہے وہ تادم تحریر (جولائی 2007) جاری ہے۔ ایک اندازے کے مطابق پچھلے تین برس میں چھ لاکھ عراقی اس لڑائی کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں۔ دوسری طرف امریکہ کا بھی کچھ کم نقصان نہیں ہوا۔ اُسے اس لڑائی پر ہر مہینے اندازاً دس ارب ڈالر کی رقم خرچ کرنی پڑ رہی ہے۔ اس کے کم وبیش چار ہزار سپاہی اس جنگ میں کام آ چکے ہیں۔ اس جنگ کی وجہ سے امریکی قوم جس طرح تقسیم ہو گئی ہے، پچھلے سو برسوں میں ایسی تقسیم کبھی نہیں دیکھی گئی تھی۔

مستقبل کے لیے بے پناہ خطرات اور اندیشے ہیں۔ اگر امریکی افواج موجود رہتی ہیں تو یہ تصادم جاری رہے گا۔ اور اگر وہ نکلتی ہیں تو خدشہ ہے کہ شیعہ سنی تصادم نہ صرف یہ کہ لاکھوں مزید افراد کو ہلاک کر دے گا بلکہ عجب نہیں کہ عالم اسلام میں شیعہ سنی تفریق اپنی آخری انتہاؤں کو پہنچ جائے۔ صدر بش کی سربراہی میں امریکہ نے یہ غیر منصفانہ جنگ چھیڑ کر عالم اسلام اور خود اپنے آپ کو بھی بہت بڑا نقصان پہنچایا۔ خدشہ ہے کہ اس کے مزید بھیانک نتائج ہمیں مستقبل میں دیکھنے کو ملیں گے۔

ہم بخوبی دیکھ سکتے ہیں کہ اگر عراق کسی وقت بھی پرامن طریقے سے جمہوری کلچر کی طرف رُخ کر لیتا تو اتنی بڑی تباہی سے اس ملک کو بچایا جا سکتا تھا۔ اگر صدام ایران پر حملہ نہ کرتا، اگر صدام کویت پر قبضہ نہ کرتا، اگر قبضے کے بعد وہ کویت سے پرامن طور پر نکل جاتا اور اگر صدام سعودی عرب کے پیش کش قبول کر کے وہاں سیاسی پناہ حاصل کر لیتا تو اتنی بڑی تباہی نہ آتی۔ بڑی طاقتوں کے ظلم سے بچنے کا واحد طریقہ صبر وحکمت اور اپنی انا کی قربانی ہے۔ صبر وحکمت کو استعمال کر کے بڑی طاقتوں کی سازشوں کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے، اور ان کے ہتھیاروں کو پرامن طریقے

Marfat.com

سے کند کیا جاسکتا ہے۔ لیکن ابھی عالم اسلام نے اس کا شعور وادراک نہیں ہوا۔ اب بھی اگر عراقی عوام اور رہنما چاہیں تو اس مسئلے کا ایسا پرامن حل تلاش کر سکتے ہیں جس کے ذریعے عراق بھی متحد رہے اور امریکہ کو مزید ٹھہرنے کا بہانہ بھی نہ ملے۔ وہ طریقہ یہ ہے کہ شیعہ، سُنی اور کُرد رہنما آپس میں مل بیٹھیں اور صوبائی خودمختاری کی حدود طے کرلیں۔ اگر یہ تینوں فریق آپس میں ایک دوسرے کے لیے لچک پیدا کر کے کچھ لو اور کچھ دو کے اصول پر عمل کرنے کا عزم کرلیں تو ایک پرامن عراق وجود میں آسکتا ہے۔ پھر یہ سب لوگ مل کر امریکہ سے یہ مطالبہ کر سکتے ہیں کہ چونکہ عراق میں آئین اور قانون کی عملداری پوری طرح بحال ہوگئی ہے، اس لیے اب یہاں سے امریکی افواج کو چلے جانا چاہیے۔ لیکن کیا اہل عراق نے جمہوری کلچر سے یہ وابستگی، عراق کے وسیع تر مفادات کا ادراک اور اپنی انا کی قربانی کا جذبہ سیکھ لیا ہے؟

Marfat.com

چودھواں باب

بوسنیا اور چیچنیا

پچھلے کچھ برسوں کے دوران میں یورپ کے اندر ایک ایسی ریاست نے جنم لیا جس میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔اس ریاست کا نام بوسنیا ہے۔اس سے پہلے یورپ میں واحد مسلم ریاست البانیہ کی تھی۔لیکن چونکہ البانیہ میں انتہائی سخت گیر قسم کی سوشلسٹ حکومت قائم تھی اس لیے اس ریاست کا مسلم تشخص نہ ہونے کے برابر تھا۔البتہ سویت یونین کے خاتمے کے بعد اس ریاست کا مسلم تشخص اب آہستہ آہستہ سامنے آرہا ہے۔

بوسنیا کی ریاست خالصتاً جمہوریت اور حکمت کی پیداوار ہے۔اس کے ساتھ ساتھ وہاں کی عوام نے بے مثال شجاعت اور مردانگی کا مظاہرہ کیا ہے۔یہ ملک دراصل یوگوسلاویہ کا ایک حصہ تھا، جو کہ ایک سوشلسٹ ملک تھا اور وہاں مارشل ٹیٹو نے تیس برس تک حکومت کی۔ وہ 1980ء میں فوت ہوا۔اس کے معا بعد وہ وقت آیا جب سوشلسٹ ریاستیں آہستہ آہستہ بکھرنے لگیں۔یوگوسلاویہ کا اکثریتی صوبہ سربیا تھا۔جہاں آرتھوڈاکس عیسائیوں کی اکثریت ہے۔سابقہ یوگوسلاویہ کے سب صوبوں کے درمیان گہرے نسلی اور مذہبی اختلافات ہیں۔یوگوسلاویہ سے آزادی کا سب سے پہلا اعلان سلووینیا نے کیا۔دسمبر 1991ء میں ایک ریفرنڈم کے ذریعے عوام نے یوگوسلاویہ سے آزادی کی حق میں فیصلہ دیا۔اس کے کچھ مدت بعد ایک اور صوبے کروشیا نے بھی آزادی کا فیصلہ کردیا۔واضح رہے کہ ان دونوں علاقوں میں رومن کیتھولک عیسائیوں کی اکثریت ہے۔

جب درج بالا دونوں صوبوں نے اپنی الگ الگ ریاستیں حاصل کرلیں تو بوسنیا کے عوام نے بھی متحد ہوکر آزادی حاصل کرنے کا فیصلہ کردیا۔چنانچہ اس مقصد کے لیے سب سے پہلے بوسنیا کی پارلیمنٹ میں آزادی کا بل پیش کردیا گیا جسے پارلیمنٹ نے منظور کرلیا۔اس کے بعد

Marfat.com

فروری 1992ء میں ریفرنڈم ہوا جس میں 99% ووٹروں نے آزادی کے حق میں ووٹ دیا۔ اس کے بعد مارچ میں بوسنیا نے آزادی کا باضابطہ اعلان کردیا اور اپریل میں یورپی برادری اور اقوام متحدہ نے بھی اسے اپنا رکن بنالیا۔ اس تفصیل سے یہ اچھی طرح معلوم ہوجاتا ہے کہ بوسنیا کے عوام نے صرف اُس وقت آزادی حاصل کرنے کا فیصلہ کیا جب گردوپیش کے حالات اس کے لیے پوری طرح تیار ہو چکے تھے اور اس اعلان سے پہلے جمہوری اصولوں کے متعلق ہر قدم لیا گیا۔

آزادی کے اعلان کے فوراً بعد یوگوسلاویہ کے جانشین صوبے یعنی سربیا نے بوسنیا پر حملہ کردیا اور وہ مظالم ڈھائے جس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس جارحیت کے جواب میں بوسنیائی فوج اور وہاں کے عوام نے مکمل دفاعی حکمت عملی اختیار کی۔ انہوں نے اعلیٰ ترین اخلاقی اصولوں کے مطابق اپنا دفاع کیا اور دفاع کرتے وقت سویلین سرب باشندوں کے خلاف کوئی ظلم نہیں کیا۔ واضح رہے کہ بوسنیا میں سرب باشندوں کی بھی ایک قابل لحاظ تعداد بستی ہے۔ اس وقت بوسنیا کے صدر عالی جاہ عزت بیگ تھے جو ایک دانشور اور تعلیم یافتہ انسان تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ دین پر بھی گہری نظر رکھتے تھے اور وہ پوری زندگی حکمت اور جمہوریت کی اصولوں پر پوری طرح کاربند رہے۔ نہ صرف یہ کہ بوسنیا کی فوج نے سویلین سربوں کو کچھ نہیں کہا، اس کے برعکس انہوں نے صرف اور صرف اپنے دفاع پر توجہ دی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ دنیا کو سرب فوج کے مظالم اور اس کی جارحیت سے پوری دنیا کو باخبر کرتے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پوری دنیا، سارے ذرائع ابلاغ اور اقوام متحدہ بوسنیا کے حق میں اور سربیا کے خلاف ہوگئی۔ یہی وجہ ہے کہ بین الاقوامی عدالتِ انصاف نے سربیا کے کئی اہم سیاسی اور فوجی رہنماؤں کو جنگی جرائم کا مجرم قرار دے کران کو سزائیں سنائی ہیں۔ حتیٰ کہ سربیا کے سابق صدر میلوسوچ کو بھی عدالتی کٹہرے میں کھڑا ہونا پڑا اور اُس کی موت بھی جیل خانے میں ہوئی۔ اس وقت تک اقوام متحدہ نے بوسنیا کے مسلمانوں پر مظالم ڈھانے والے ساٹھ اہم ترین سربوں کو سزائیں سنائی ہیں اور تقریباً ایک سو سرب افراد پر اس الزام کے تحت مقدمہ جاری ہے۔

Marfat.com

جب بوسنیا نے انتہائی نامساعد حالات کے باوجود دو برس تک کامیابی کے ساتھ اپنا دفاع کیا تو دشمن کی طرف سے جارحیت میں آہستہ آہستہ کمی آنے لگی اور سربیا یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ وہ جنگ کے ذریعے بوسنیا کو نیچا نہیں دکھا سکتا۔ پھر جب ساری دنیا پر بھی یہ واضح کیا گیا کہ بوسنیائی عوام اپنی آزادی کے لیے ہر قربانی دینے کا عزم کیے ہوئے ہیں، تب کہیں جا کر امریکہ درمیان میں کود پڑا اور اُس نے سب فریقوں کے درمیان مذاکرات شروع کروا دیے۔ ان مذاکرات کے نتیجے میں دسمبر 1995ء میں ''ڈیٹن امن سمجھوتہ'' پر دستخط ہو گئے۔ یہ ایک عملی سمجھوتہ تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ اس کے تحت مسلمانوں کو سارے حقوق مل گئے۔ تاہم اس کے ذریعے ایک اکثریتی مسلمان ملک وجود میں آ گیا، جس کے باشندے اسلام کے اصولوں کے مطابق اپنی زندگی بسر کرسکتے ہیں۔ گویا یہ کامیابی کی ایک ایسی کہانی (Success story) ہے جسے حکمت، صبر، جمہوریت اور اخلاقی اصولوں کی پاسداری کی بنیاد پر جیتا گیا۔

اس کے بالکل برعکس چیچنیا ناکامی کی ایک کہانی ہے۔ اس علاقے کی آبادی اندازاً تیرہ لاکھ ہے۔ یہ علاقہ تقریباً چاروں طرف سے روس میں گھرا ہوا ہے اور اس کی صرف ایک چھوٹی سی سرحد بحیرہ کیسپین سے ملتی ہے۔ اس علاقے میں مسلمان بستے ہیں۔ اسی طرح روس کے اندر روس مزید بھی ایسے علاقے ہیں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت حال میں چیچنیا کے لیے آزادی حاصل کرنے کا فیصلہ عملی اعتبار سے ناممکن تھا۔ دنیا میں کہیں بھی کوئی ایسی آزاد ریاست وجود میں نہیں آئی جو چاروں طرف سے ایک دوسرے ملک میں گھری ہوئی ہو، اور جس کو سامان رسد پہنچانے کا کوئی راستہ نہ ہو۔ چونکہ روس کے اندر کئی مزید مسلمان اکثریتی علاقے بھی موجود تھے، اس لیے چیچنیا کے عوام کے لیے مناسب راستہ یہ تھا کہ وہ رشین فیڈریشن کی سرحدوں میں رہتے ہوئے مکمل اندرونی خودمختاری کا مطالبہ کرتے۔ ایسا مطالبہ جمہوری اصولوں کے عین مطابق ہوتا اور یہ بھی ممکن تھا کہ مستقبل میں روس کے اندر مزید مسلمان علاقوں کو بھی ایسی ہی خودمختاری مل جاتی۔

Marfat.com

1991ء میں سوشلسٹ سویت یونین شکست وریخت کے عمل سے گزر رہا تھا اور سارے ملک میں بدامنی تھی، چنانچہ اس موقعے سے جنرل جوہر داؤد نے فائدہ اٹھا کر چیچنیا میں انقلاب برپا کردیا اور اپنی خودمختار حکومت کا اعلان کردیا۔ چونکہ اُس وقت روس اپنے داخلی مسائل میں بُری طرح الجھا ہوا تھا، اس لیے اُس نے جنرل داؤد کے خلاف کوئی عملی کاروائی نہیں کی۔ تاہم جب باقی ملک کے حالات اُس کے کنٹرول میں آگئے تو 1994ء میں روس نے اپنی فوج چیچنیا میں داخل کردی اور یوں کئی برس تک جنگ کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ اپریل 1996ء میں جنرل داؤد کو شہید کرایا گیا۔ اس لڑائی میں اندازاً اسی ہزار مسلمان شہید ہوئے۔

اس کے بعد ایک سمجھوتے کے نتیجے میں جنوری 1997ء میں انتخاب ہوا جس میں اسلان مسخدوف نے کامیابی حاصل کی۔ اُنہوں نے اعلان کیا کہ اُن کا مطمحِ نظر بالآخر روس سے مکمل آزادی ہے۔ چونکہ وہ جمہوری طریقے سے برسراقتدار آئے تھے اور انہوں نے رشین فیڈریشن کے خلاف عملاً بھی کوئی کاروائی نہیں کی، اس لیے روس نے انہیں برداشت کیے رکھا۔ تاہم اُن سے یہ غلطی سرزد ہوئی کہ انہوں نے چیچنیا کی سرزمین پر موجود مسلح تنظیموں کو غیر قانونی قرار نہیں دیا۔ جب بھی کسی جگہ ریاستی فوج کے علاوہ مسلح تنظیمیں موجود ہوتی ہیں، تو وہ اپنے لیے نئے نئے ٹارگٹ تلاش کرتی ہیں۔ چنانچہ یہاں بھی ایسا ہوا۔ اگست 1999ء میں شامل بسایوف نامی ایک مسلح کمانڈر نے اعلان کیا کہ وہ اپنی ریاست سے باہر بھی اسلام کا جھنڈا لہرانا چاہتا ہے۔ چنانچہ اُس نے قریبی ریاست داغستان پر حملہ کرکے وہاں کے چند دیہات پر قبضہ کرلیا۔ اس جارحانہ اقدام سے پورے روس کے اندر غم وغصے کی ایک لہر دوڑ گئی اور سارے روس کے اندر یہ احساس پیدا ہوگیا کہ ہم نے تو چیچنیا کو اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا، لیکن یہ لوگ تو اب آگے بڑھ کر ہم پر حملہ کرنے لگے ہیں۔ چنانچہ روس کے صدر پیوٹن نے چیچنیا کے خلاف فوجی کاروائی کا اعلان کردیا۔ اس اعلان میں اُسے سارے ملک کی حمایت حاصل تھی۔ اس کے نتیجے میں چیچنیا کے اندر خون کی ایک اور ہولی کھیلی گئی، مزید ہزاروں مسلمان شہید ہوگئے اور چیچنیا پر روس کا قبضہ ہوگیا۔ یہ

Marfat.com

قبضہ ابھی تک برقرار ہے۔ اگر چہ اب بھی کہیں نہ کہیں اکا دکا کاروائیاں ہوتی ہیں، لیکن بلحاظ مجموعی پچھلے چند برس سے امن ہے۔ اس وقت وہاں انتخاب کے نتیجے میں روس کی حمایت یافتہ حکومت اقتدار میں ہے۔

اگر 1991ء میں جنرل داؤد، اپنے برسر اقتدار آنے کے فوراً بعد ریاست میں انتخاب کروا دیتے، اُس پارلیمنٹ سے مکمل اندرونی خودمختاری کا مطالبہ منظور کروا لیتے، اور اس پر ریفرنڈم کے ذریعے مہر تصدیق ثبت کروا لیتے تو غالباً روس کو کوئی اعتراض نہ ہوتا اور لاکھوں مسلمانوں کا خون یوں نہ بہتا۔ اگر اسلان مسخدوف 1997ء میں برسر اقتدار آنے کے بعد یہ اعلان کر دیتے کہ وہ روس کے اندر کامل اندرونی خودمختاری چاہتے ہیں اور وہ پرائیویٹ مسلح تنظیموں پر پابندی لگا دیتے تو روس کو دوبارہ فوج کشی کا جواز نہ ملتا۔ چونکہ اس پورے معاملے میں زمینی حقائق اور حکمت کا خیال نہیں رکھا اس لیے یہ جدوجہد ناکامی سے دوچار ہوئی۔

ان دونوں واقعات میں ہمارے لیے ایک بڑا سبق موجود ہے۔ وہ یہ کہ اقدام صرف اُسی وقت کرنا چاہیے جب حالات اُس کے لیے پوری طرح حالات سازگار ہوں۔ ہر اقدام جمہوری اصولوں کے مطابق ہونا چاہیے۔ کوئی غلط اجتماعی قدم نہیں اٹھانا چاہیے۔ سب اخلاقی اصولوں کی پابندی کرنی چاہیے تاکہ دنیا کی رائے عامہ کی ہمدردیاں ساتھ رہیں۔ اور آخری بات یہ کہ سمجھوتہ ہمیشہ زمینی حقائق کی بنیاد پر کرنا چاہیے، نہ کہ اپنی خواہشات کی بنیاد پر۔

Marfat.com

پندرھواں باب

کوسوو یورپ کی تیسری مسلمان ریاست

کوسوو، سابقہ یوگوسلاویہ کا ایک ایسا صوبہ تھا جہاں البانوی نژاد مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ اس صوبے کی آبادی تقریباً بیس لاکھ تھی اور اس میں نوے فیصد باشندے البانوی نژاد تھے جن کی اکثریت مسلمان تھی۔ باقی دس فیصد سرب تھے۔

چونکہ سربیا ہی آنجہانی یوگوسلاویہ کا سب سے بڑا صوبہ تھا اور یوگوسلاویہ کی فوج اور صنعت میں اس کا حصہ سب سے زیادہ تھا۔ اس لئے سربیا نے اپنی آزادی کے فوراً بعد سرب نسل کو بچانے کے بہانے اپنی افواج کوسوو بھیج دیں۔ یوں کوسوو میں بروقت کوئی ایسی تحریک آزادی شروع نہیں ہوسکی، جس کی وجہ سے اسے بوسنیا کے ساتھ آزادی حاصل ہوسکتی۔ تاہم وہاں مسلمانوں کی ایک پرامن تحریک آزادی جناب ابراہیم رگوا کے زیر قیادت ابھر آئی۔ لیکن چونکہ اس جدوجہد آزادی کے لئے ابھی حالات بہت غیر مناسب تھے، اس لئے یہ ایک غیر نمایاں شکل (low profile) میں رہی۔ تاہم جب بوسنیا میں امریکی مداخلت کے بعد ڈیٹن امن سمجھوتے کے تحت امن قائم ہوا اور مسلمانوں کو آزادی کی فضا میں سانس لینے کا موقعہ ملا تو کوسوو کی تحریک آزادی کو بھی مہمیز ملی۔ یوں یہاں آزادی کی تحریک زور پکڑنے لگی۔

بوسنیا کے تجربے سے سبق حاصل کرتے ہوئے کوسوو کی تحریک آزادی نے شروع ہی سے چند ایک اصول طے کرلئے۔ ایک یہ کہ جدوجہد بنیادی طور پر پرامن ہوگی، یہ ایک ہی تنظیم کے زیر قیادت ہوگی، اس کا لیڈر بھی ایک ہی ہوگا اور اس کا اصل کام دنیا پر یہ ثابت کرنا ہوگا کہ کوسوو کے عوام آزادی چاہتے ہیں۔ چنانچہ یہ پرامن جدوجہد شروع ہوئی۔

کوسوو میں کئی علاقے ایسے تھے جو سرب فوج کے کنٹرول سے باہر تھے، چنانچہ ایسے علاقوں میں تحریک آزادی نے اپنی انتظامیہ بھی قائم کرلی۔ چونکہ یہ بھی خطرہ تھا کہ سرب افواج ان

Marfat.com

علاقوں پر حملہ نہ کر دیں اس لئے مدافعتی دستے بھی تیار ہو گئے۔ تاہم بہت سختی کے ساتھ اس امر کا خیال رکھا گیا کہ یہ دستے دفاع کے علاوہ کوئی اقدام نہیں کریں گے اور خصوصاً سرب آبادی کے خلاف کسی قسم کی جارحیت نہیں کریں گے۔ یہی وجہ ہے کہ اس پورے عرصے میں جب کہ سرب افواج نے بے شمار دفعہ جارحیت کی اور مسلمانوں پر ظلم ڈھانے کی اپنی پوری کوشش کی لیکن کوسوو کے مسلمانوں کی طرف سے صرف اور صرف اپنا دفاع کیا گیا اور آگے بڑھ کر جواب میں کوئی حملہ نہیں کیا گیا۔

جب یہ بات بالکل واضح ہوگئی کہ کوسوو کے البانوی نژاد باشندے سربیا سے آزادی چاہتے ہیں تو اُس وقت ابراہیم رگوانے نیٹو سے مداخلت کی اپیل کر دی۔ چونکہ اس سے پہلے بوسنیا کے معاملے میں نیٹو سے بہت غفلت ہو چکی تھی جس کے نتیجے میں امن کا سہرا امریکہ کے سر سج گیا تھا اس لئے نیٹو نے فوری مداخلت کی اور سربیا کو الٹی میٹم دیا کہ وہ اپنی افواج کوسوو سے باہر لے جائے۔ سربیا نے یہ مطالبہ ماننے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ نیٹو کی فضائی افواج نے سربیا کے دارالحکومت بلغراد پر فضائی حملہ شروع کیا۔ سن ننانوے کا یہ فضائی حملہ کئی ہفتے تک جاری رہا، جس کے نتیجے میں بلغراد کی بے شمار عمارات ملبے کا ڈھیر بن گئیں اور سربیا کو سر تسلیم خم کر دینا پڑا۔ گویا نیٹو نے مسلمانوں کے ایک علاقے کو آزادی دلانے کے لئے اپنے ہم مذہب عیسائیوں پر کئی ہفتے تک بمباری کی۔

بہر حال جب سن ننانوے میں سربیا کی افواج وہاں سے نکل گئیں تو ایک معاہدے کے تحت کوسوو میں اقوام متحدہ کے امن مشن کو تعینات کیا گیا۔ اس امن مشن میں پاکستانی دستوں کی ایک بڑی تعداد بھی شامل تھی اور ہے۔ اس امن مشن کی زیر نگرانی انتخابات ہوئے جن میں حسب توقع ابراہیم رگوا کی پارٹی کو اکثریت حاصل ہوئی۔ چونکہ یہ خطرہ تھا کہ ابھی یہ نوزائدہ ملک اپنے پاؤں پر کھڑا نہ ہو سکے گا اس لئے مقامی حکومت کو رفتہ رفتہ اختیارات سونپے گئے۔ اقوام متحدہ کے اسی امن مشن کے تحت اس ملک میں دوسرے عام انتخابات ابھی اکتوبر 2005ء کے تیسرے ہفتے

Marfat.com

میں منعقد ہوئے۔

وہاں کی تحریک آزادی نے بھی اس حکمت وفراست کا مظاہرہ کیا کہ سربیائی افواج کے انخلا کے بعد اعلان آزادی کرنے میں کوئی جلدی نہیں کی، بلکہ اقوام متحدہ کی مداخلت کو تسلیم کیا اور اعلان کیا کہ وہ اقوام متحدہ کی اسکیم کے تحت ہی آزادی کا اعلان کریں گے۔اسی پالیسی کے تحت کوسوو نے ابھی تک آزادی کا رسمی اعلان نہیں کیا اور اس کے تمام تر حکومتی اخراجات یورپ اور امریکہ کومل کر برداشت کر رہے ہیں۔وہ وقت دور نہیں جب یورپ کے اندر کوسوو نام کا ایک مسلمان ملک معرض وجود میں آکر اقوام متحدہ کا رکن بھی بن جائے گا۔کیونکہ اقوام متحدہ نے اعلان کردیا ہے کہ کوسوو کو بہت جلد ایک آزاد ریاست کا درجہ دے دیا جائے گا۔

کوسوو کی جدوجہد آزادی کیوں کامیاب ہوئی۔اگر درج بالا پوری بحث کو ذہن میں رکھا جائے تو اس کی وجوہات یہ ہیں۔

- یہ جدوجہد متحد، پرامن اور جمہوری اصولوں کے مطابق تھی۔اور ایک ہی لیڈرشپ کے تحت تھی۔
- مسلمانوں نے صرف اپنا دفاع کیا اور اس سے آگے بڑھ کر کوئی جارحانہ اقدام نہیں کیا۔
- کوسوو کے مسلمانوں نے اپنے آپ کو بین الاقوامی جہادی تحریکوں سے دور رکھا اور ان کو اپنے ہاں آنے کی اجازت نہ دی۔
- کسی حالت میں بھی انہوں نے جلد بازی کا راستہ اختیار نہیں کیا۔بلکہ ہر قدم پر حکمت اور صبر سے کام لیا۔

Marfat.com

سولھواں باب

سوڈان اور صومالیہ کا المیہ

سوڈان 1956ء میں آزاد ہوا اور وہاں جمہوری حکومت بن گئی۔ دو ہی سال بعد فوجی انقلاب آیا اور جنرل ابراہیم عبود نے اقتدار سنبھال لیا۔ اس کے چھ برس بعد یعنی 1964ء میں، عوامی تحریک کی مزاحمت کے نتیجے میں، جنرل ابراہیم نے اقتدار چھوڑ دیا۔ 1969ء میں کرنل جعفر نمیری نے ایک اور فوجی انقلاب برپا کر دیا۔ یہ ظالمانہ اقتدار سولہ برس تک جاری رہا۔ پھر ایک اور عوامی تحریک چلی، جس کے نتیجے میں جنرل عبدالرحمان نے اقتدار پر قبضہ کرلیا۔ انہوں نے ایک برس کے اندر اندر انتخاب کروانے کا وعدہ کیا اور اس وعدے کو پورا بھی کیا۔ چنانچہ 1986ء میں اُمہ پارٹی کے جناب صادق المہدی پارلیمانی انتخابات کے ذریعے وزیراعظم بن گئے۔ ابھی اس حکومت کو صرف تین برس ہوئے تھے کہ جنرل عمر البشیر نے نیشنل اسلامک فرنٹ کے تعاون سے اقتدار پر قبضہ کرلیا۔ جنرل عمر البشیر اور نیشنل اسلامک فرنٹ کے جناب حسن ترابی کا یہ اتحاد دس برس تک جاری رہا، حتیٰ کہ 2000ء میں جنرل صاحب نے حسن ترابی کو حکومت سے نکال دیا۔ جنرل عمر البشیر ابھی تک برسرِ اقتدار ہیں۔

ابتدا سے ہی سوڈان میں دو بڑی پارٹیاں تھیں۔ ایک جناب صادق المہدی کی اُمہ پارٹی جو جمہوریت اور اسلام کی علم بردار تھی۔ دوسری ڈیموکریٹک یونینسٹ پارٹی جو جمہوریت کے ساتھ سماجی انصاف پر زور دیتی تھی۔ سن اسی کی دہائی میں جناب حسن ترابی نے نیشنل اسلامک فرنٹ کی تشکیل کی۔ حسن ترابی، مولانا مودودی اور جماعت اسلامی سے بہت متاثر ہیں۔ وہ کئی مرتبہ پاکستان تشریف لا چکے ہیں اور ہر دفعہ وہ جماعت اسلامی کے ہیڈ کوارٹر منصورہ میں رہائش پذیر ہوتے ہیں۔

آزادی کے دو برس بعد ہی فوج نے اقتدار پر قبضہ کرلیا۔ تاہم جب بھی عوام کو انتخاب

Marfat.com

کا موقع ملا، انہوں نے ہمیشہ اُمہ پارٹی یا ڈی یو پی ہی کو ووٹ دیا۔ سوڈان کے فوجی حکمرانوں نے اپنے اقتدار کو طول دینے کے لیے سوشلزم، اسلام اور قبائلی سسٹم کا نام خوب استعمال کیا۔ مثلاً جنرل ابراہیم عبود اپنے دورِ اقتدار میں مسلسل اسلام کا نام استعمال کرتے رہے۔ کرنل نمیری نے سوشلزم کے نام پر اپنے اقتدار کو طول دیا اور پھر جب انہیں معلوم ہوا کہ اسلام کا نام لینے میں زیادہ کشش ہے تو انہوں نے یک دم 1984ء میں شریعت نافذ کرنے کا اعلان کر دیا اور کہا کہ آئندہ وہ اسلام کے مطابق حکومت کریں گے۔

جب 1986ء میں ایک جمہوری حکومت برسر اقتدار تھی، تو جناب حسن ترابی کی نیشنل اسلامک فرنٹ کے تعاون سے جنرل عمر البشیر نے اس حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ پھر جنرل بشیر اور حسن ترابی ہنسی خوشی اسلام کے نام پر حکومت کرنے لگے۔

چونکہ ہر ڈکٹیٹر کو ایک نام نہاد جمہوری چہرے کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے غیر جماعتی پارلیمنٹ کا ڈول ڈالا گیا۔ کہا گیا کہ چونکہ اسلام میں سیاسی پارٹیوں کی گنجائش نہیں اور سیاسی جماعتیں ملکی وحدت کو پارہ پارہ کر دیتی ہیں چنانچہ ایسا نظام وضع ہونا چاہیے جس میں سیاسی تنظیمیں نہ ہوں۔ اس کے لیے ایک پیچیدہ ڈھانچہ بنا دیا گیا جس کے تحت پارلیمنٹ کی نشستیں طبقات کی بنیاد پر تقسیم کی گئیں مثلاً مزدوروں، کسانوں، سرکاری ملازمین کی نشستیں اور اسی طرح نامزد نشستیں۔ یہ پارلیمنٹ بنائی گئی اور جناب حسن ترابی کو اس کا اسپیکر بنا دیا گیا۔ صدر کے بعد سب سے زیادہ اختیارات سپیکر کو دیے گئے۔ کچھ مدت بعد وہی جھگڑا پیدا ہوا جو ایسے موقعہ پر ہمیشہ پیدا ہوا کرتا ہے یعنی اختیارات کا تنازعہ۔ ظاہر ہے کہ فوج کے مقابلے میں کون ٹھہر سکتا ہے۔ چنانچہ جناب حسن ترابی کے اختیارات ختم کر دیے گئے اور ''عدم اعتماد'' کے ذریعے ان کو سپیکر شپ سے ہٹا دیا گیا۔

محترم قاضی حسین احمد صاحب بھی اس بحران کو حل کرنے سوڈان گئے اور واپس آکر خوش خبری سنائی کہ انہوں نے اقتدار کے دونوں ''جائز دعویداروں'' میں صلح کرا دی ہے۔ مگر ایسے معاملات میں کہاں صلح ہوتی ہے۔ اقتدار بلا شرکت غیرے جنرل صاحب کے پاس رہا۔

Marfat.com

ہر فوجی حکمران کو اپنے "حلقہ انتخاب" کے ساتھ ساتھ دوسرے ساتھیوں کی بھی تلاش ہوتی ہے چنانچہ جنرل عمر البشیر نے بھی آبادی کے اور عناصر کو ساتھ ملانے کی کوشش کی۔ اس دفعہ ان کا ہدف سوڈان کی عربی بولنے والی آبادی تھی۔ واضح رہے کہ سوڈان میں چالیس فیصد آبادی عرب ہے اور پچاس فیصد سے کچھ اوپر کی آبادی سیاہ فاموں پر مشتمل ہے۔ تمام کلیدی عہدے عربوں کے پاس ہیں۔

جس طرح ہر غیر جمہوری یا نیم جمہوری ملک میں صوبے مرکز سے نالاں رہتے ہیں۔ یہی حال سوڈان کا ہے۔ جنوب کے صوبوں میں عیسائیوں کی اکثریت ہے اس لیے وہاں علیحدگی کی مسلح جدوجہد پچھلی کئی دہائیوں سے جاری ہے۔ اس کے برعکس اگرچہ دارفر میں سو فیصد آبادی مسلمان ہے تاہم دو تنظیمیں یعنی سوڈان لبریشن آرمی اور جسٹس اینڈ ایکویٹی موومنٹ صوبائی خود مختاری کے لیے مسلح جدوجہد کر رہی ہیں۔ ان کی جدوجہد پچھلے چند برس سے جاری ہے۔ ان سے نمٹنے کے لیے سوڈان کی مرکزی حکومت نے ایک منصوبہ بنایا۔ عربی بولنے والوں پر مشتمل دو تنظیمیں کھڑی کیں۔ ایک پاپولر ڈیفنس فورس اور دوسری جنجاوید ملیشیا۔ ان کو یہ کام سونپا دیا گیا کہ وہ دارفر سے ساری سیاہ فام آبادی کو نکال باہر کریں اور ہجرت نہ کرنے والوں کو ہلاک کر دیں۔ سوڈانی فوج بھی اس کام میں ان کا بھرپور ہاتھ بٹاتی رہی۔ چنانچہ فروری 2003ء سے لے کر اب تک پچاس ہزار سیاہ فام مسلمانوں کو ہلاک کر دیا گیا اور دس لاکھ افراد کو اپنے گھروں سے نکال دیا گیا جن میں سے اکثر اس وقت ہمسایہ ملک چاڈ میں پناہ گزین ہیں۔ گویا ظالم اسرائیل نے پچھلے تیس برس سے جتنے فلسطینیوں کو شہید کیا ہے، ان سے پانچ گنا زیادہ مسلمانوں کو خود سوڈانی فوج اور جنجاوید ملیشیا نے شہید کیا ہے۔ اسی طرح ظالم اسرائیل نے جتنے فلسطینیوں کو ہجرت پر مجبور کیا ہے، اس سے تین گنا بڑی تعداد میں سیاہ فام مسلمانوں کو سوڈان سے ہجرت پر مجبور کر دیا گیا ہے۔

یہ ہے وہ صورت حال جس سے اب لازماً امریکہ اور دوسرے ممالک فائدہ اٹھائیں گے۔

یہاں یہ بھی واضح رہے کہ سوڈان کی فوجی حکومتوں کے دور میں سوڈان میں مسلسل خانہ

Marfat.com

جنگی ہوتی رہی ہے۔ اس خانہ جنگی میں دس لاکھ سے زیادہ سوڈانی جاں بحق ہوئے ہیں۔ اس کے برعکس مختصر جمہوری ادوار میں مجموعی طور پر امن رہا ہے اور مذاکرات جاری رہے ہیں۔

یہ سب کچھ پچھلے پانچ برس سے جاری ہے۔ اس دوران مغربی پریس میں بار بار رپورٹیں چھپی ہیں۔ لیکن مسلمان ممالک کے ذرائع ابلاغ میں یہ خبریں عموماً جگہ نہیں پاسکیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلم صحافت کی نظر میں اگر ایک مسلمان حکمران اپنے ملک کے باشندوں پر ظلم ڈھائے، تو وہ اس کے خلاف آواز اٹھانے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ اسی طرح مسلم امہ کے قائدین صرف اسی مسئلے کو اچھالنے میں دلچسپی رکھتے ہیں جہاں ان کو سیاسی نعرے بازی کے ذریعے سیاسی فوائد ملنے کی امید ہو۔ مظلوم مسلمانوں کے لیے ان کی رگ عدل وانصاف نہیں پھڑکتی۔

جب یہ معاملہ سامنے آگیا تو حسب معمول وضاحتیں پیش کی جانے لگیں۔ کہا گیا کہ یہ سب کچھ دراصل مغرب بالخصوص سی آئی اے کی سازش ہے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم شتر مرغ کی طرح آنکھیں بند کر کے حقائق کو یکسر مسترد کر دیتے ہیں۔ جب سن اکہتر میں پاکستانی فوج بنگالی بستیوں کو جلا رہی تھی، یہاں مغربی پاکستان میں ہم سب کا خیال یہ تھا کہ یہ بھارتی اور مغربی پروپیگنڈا ہے۔ اگر سوڈان کا مسئلہ سی آئی اے کی سازش تھی تو سوڈان کو چاہیے تھا کہ وہ پہلے اقدام کر کے 2002ء میں دنیا کے سامنے اپنی شکایت رکھتا۔ اس کے ثبوت پیش کرتا اور مسلم حکومتوں سے اپیل کرتا کہ چونکہ حالات اس کے قابو سے باہر ہو رہے ہیں اس لیے وہ اپنی افواج مدد کے لیے بھیجیں۔ وہ اقوام متحدہ کے پاس شکایت لے جاتا۔ اس طرح امریکہ دفاعی پوزیشن میں چلا جاتا اور اس کی سازش دم توڑ جاتی۔ لیکن انصاف کی بات تو یہ ہے کہ ایسا کچھ تھا ہی نہیں۔ اس لیے سوڈان کے لیے اس لائحہ عمل پر عمل ممکن ہی نہیں تھا۔ دو قریبی ہمسایہ ممالک یعنی چاڈ اور اریٹریا کی طرف سے کسی گروپ کی حمایت بعید از قیاس نہیں۔ بلکہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اریٹریا کے مسلم مذہبی انتہا پسند سیاہ فاموں کے ایک گروپ کی مدد کر رہے ہیں کیونکہ یہ لوگ حسن ترابی کے حامی ہیں۔ چاڈ بھی فرانسیسی اثر والا ایک ایسا ملک ہے جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں۔

Marfat.com

یہ بھی کہا گیا کہ یہ دراصل کسانوں اور خانہ بدوشوں کی لڑائی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر ایسا ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ تمام ہلاک شدہ گان اور تمام مہاجرین کا تعلق غیر عرب سیاہ فام آبادی سے ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسی باتیں محض اپنے جرم کی سنگینی کو کم کرنے کے لیے کی جارہی ہیں۔ پورے علاقے میں ایک بھی عرب مہاجر نہیں ہے۔

ان دس لاکھ مہاجرین میں سے ہر ایک کے پاس سنانے کے لیے ایک سے ایک بڑھ کر دلخراش واقعہ موجود ہے۔ ایک رپورٹ کے مطابق ''کور'' نامی ایک قصبے کی ایک مہاجر عورت نے کہا کہ جنجادید جس گاؤں پر بھی قبضہ کر لیتی ہے، اس کی خوب صورت عورتوں کو الگ کر کے غلام بنالیا جاتا ہے اور باقیوں کو بھگایا جاتا ہے یا ماردیا جاتا ہے۔ خود یہ عورت اب جنجادید کی زیادتیوں کے نتیجے میں ایک بچے کی ماں بن چکی ہے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ رپورٹیں سچی ہیں یا جھوٹی۔ تاہم ٹیلی وژن کا کیمرہ تو جھوٹ نہیں بولتا۔ بہرحال اگر سوڈانی حکومت کا دامن صاف ہوتا تو وہ بیرونی صحافیوں پر پابندیاں لگانے کے بجائے ان کو آنے کی دعوت دے دیتی تاکہ وہ بلا روک ٹوک بچشم سر سب کچھ دیکھ لیتے۔

مسلمان ملکوں کی ایسی ہی کمزوریوں اور جرائم سے امریکہ فائدہ اٹھاتا ہے۔ مصیبت تو یہ ہے کہ ان سیاہ فام مسلمانوں کی امداد کے لیے امریکہ نے تین کروڑ ڈالر کی اشیاء بھیج دی ہیں۔ کسی مسلمان ملک کو یہ بھی توفیق نہیں ہوئی کہ ان کی مدد کے لیے کچھ بھیج دیتا۔ چنانچہ کیا اس امداد کے نتیجے میں امریکہ کو سیاہ فام مسلم آبادی میں اپنے ہمدرد دستیاب نہیں ہو جائیں گے؟۔ اگر خدانخواستہ کل امریکہ یہاں اپنی فوجیں یہاں اتار دیتا ہے تو کیا عراق کے کردوں کی طرح یہ لوگ بھی اس کے دست و بازو نہیں بن جائیں گے؟۔

اسی طرح صومالیہ بھی ایک بدقسمت مسلمان ملک ہے۔ اس ملک کو 1960ء میں آزادی ملی۔ چونکہ اس ملک میں قبائلی عصبیت زوروں پر ہے، اس لیے اس ملک میں مستقلاً آویزش رہی ہے۔ تاہم جمہوریت کی وجہ سے آہستہ آہستہ صورت حال بہتر ہو رہی تھی۔ 1969ء میں میجر

Marfat.com

جنرل سعید برے نے فوجی انقلاب برپا کر دیا اور سوشلزم کو اپنی منزل قرار دے دیا۔ یہ حکومت اگلے بیس برس تک قائم رہی۔ اور اس نے ظلم و بربریت اور کرپشن کی انتہا کر دی۔ چنانچہ آخری دس سال مسلسل خانہ جنگی کی کیفیت رہی۔ سعید برے نے ایک شہر ہارگیسا پر اتنی بمباری کی کہ پچاس ہزار افراد اسی ایک شہر میں بمباری سے مر گئے۔ 1991ء میں جنرل سعید نے حکومت چھوڑ کر جلاوطنی اختیار کر لی۔ 1991ء کے بعد سے صومالیہ شدید طوائف الملوکی اور انتشار کی حالت میں ہے۔ شمالی حصے نے ''صومالی لینڈ'' کے نام سے، مئی 1991ء میں، آزادی کا اعلان کر دیا۔ چنانچہ یہ حصہ پرامن ہے۔ باقی صومالیہ میں مختلف وار لارڈز نے اپنی اپنی حکومتیں قائم کر لیں۔ ان میں سے کئی وار لارڈز کی حمایت امریکہ نے بھی کی۔ اقوام متحدہ نے صومالیہ کے لیے ایک عبوری حکومت قائم کر لی۔ گویا بیک وقت کئی حکومتیں کام کر رہی تھیں۔ ان میں سب سے اہم حکومت جنرل فرح عدید کی تھی، کیونکہ موغادیشو پر اُس کا قبضہ تھا۔

2006ء میں ایک نئی تنظیم اسلامک کورٹس یونین کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس میں کچھ وار لارڈز کے ساتھ ساتھ علماء بھی شامل تھے۔ چونکہ عام لوگ کئی دہائیوں کی خانہ جنگی سے سخت تنگ آئے ہوئے تھے، اس لیے عوام نے بلحاظ مجموعی اس تنظیم کا خیر مقدم کیا۔ اس تنظیم نے بہت جلد مقبولیت حاصل کی اور جون 2006ء میں موغادیشو کو بھی فتح کر لیا۔ اس تنظیم نے اپنے زیرِ قبضہ علاقے میں امن اور انصاف قائم کر دیا۔ صومالیہ کے ایک بڑے علاقے پر قبضہ کرنے کے بعد چاہیے تو یہ تھا کہ یہ تنظیم اعلان کرتی کہ ہم بہت جلد جمہوری انتخابات کے ذریعے صومالیہ میں ایک نمائندہ حکومت کا قیام عمل میں لائیں گے۔ تاہم اس تنظیم سے بھی طالبان والی غلطی ہوگئی، اور اس نے فیصلہ کیا کہ وہ بیدوا نامی قصبے میں واقع اقوام متحدہ کی قائم کردہ حکومت کو ختم کرے گی۔ چنانچہ دسمبر 2006ء میں اس نے بیدوا پر حملہ کر دیا۔ اس حملے کے نتیجے میں ایتھوپیا کو یہ بہانہ مل گیا کہ وہ اقوام متحدہ کی عبوری حکومت کو بچانے کے نام پر صومالیہ میں مداخلت کرے۔ چنانچہ اُس نے یہ مداخلت کی اور دو ہفتے کے اندر اندر سارے صومالیہ پر قبضہ کر کے بظاہر اقتدار عبوری

Marfat.com

حکومت کے حوالے کر دیا۔ ظاہر ہے کہ یہ مسئلے کا حل نہیں۔ صومالیہ پہلے ہی کی طرح منتشر اور بکھرا ہوا ہے۔ صبر وحکمت کی کمی کی وجہ سے مخلص ترین افراد پر مشتمل تنظیم آئی سی یو کا خاتمہ ہو گیا۔ فی الوقت اس بدقسمت ملک کے مسئلے کا واحد حل یہ ہے کہ آئی سی یو عسکری جدوجہد کو خیر باد کہے اور سیاسی پارٹی بن کر ملک میں انتخاب کا مطالبہ کرے۔ تاہم یہ بات واضح ہے کہ اگر ایسا ہو بھی گیا، (جس کا کوئی امکان نظر نہیں آ رہا)، تب بھی چند برس سے پہلے شاید ہی کسی بہتری کی امید کی جا سکے۔

درج بالا تجزیے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سوڈان اور صومالیہ کے مسائل کے حل کا پہلا قدم ہی جمہوریت اور حکمت وصبر میں مضمر ہے۔ ان دونوں اقدار کی طرف قدم بڑھانے سے ہی امید کا راستہ کھل سکتا ہے۔

Marfat.com

سترھواں باب

مسلم اقلیتوں کے مسائل:

دنیا کے کئی ممالک میں اس وقت مسلمان ایک اہم اقلیت کی حیثیت سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ان میں سے اکثر ممالک میں مسلمانوں کو مذہبی لحاظ سے کوئی مشکل نہیں ہے۔وہ اپنے دین پر عمل کر سکتے ہیں اور اپنے دین کی تبلیغ بھی کر سکتے ہیں۔کسی کے قبول اسلام پر بھی کوئی پابندی نہیں۔البتہ سماجی سطح پر ان کو مسائل درپیش ہیں۔چونکہ ان میں اکثریت تارکین وطن کی ہے اس لئے اصلی باشندے انہیں اپنے برابر نہیں سمجھتے۔تاہم یہ مسئلہ تو ہر جگہ ہے بلکہ مالدار مسلمان ممالک میں جتنا ہے،اس کا عشر عشیر بھی یورپ اور امریکہ میں نہیں۔مثلاً ایک دنیا جانتی ہے کہ مالدار عرب بادشاہتوں میں غریب مسلم ملکوں سے جانے والوں کو کس نظر سے دیکھا جاتا ہے۔یا مثلاً کسی غریب ملک کے ایک مسلمان کو تو مغربی ممالک یا امریکہ میں گرین کارڈ بھی مل جاتا ہے اور کچھ شرائط پوری کرنے کے بعد وہ وہاں کا باشندہ بھی بن سکتا ہے لیکن ایسے ہی ایک مسلمان کے لئے کسی مالدار عرب ملک میں شہری بننا ناممکن ہے۔ایک اور مثال لیجئے خود ہمارے وطن عزیز میں پچھلے بیس برس کے دوران میں، یعنی 1985ء کے بعد نسلی فسادات میں صرف صوبہ سندھ میں جتنے پختونوں، پنجابیوں، سندھیوں اور مہاجروں نے ایک دوسرے کو قتل کیا اور املاک لوٹیں، وہ امریکہ، برطانیہ، فرانس اور جرمنی میں اسی عرصے میں مسلمانوں کو بحیثیت مجموعی پہنچنے والے نقصان سے ہزار گناہ زیادہ ہے۔

البتہ کچھ جگہیں ایسی ہیں جہاں واقعتاً مسلمانوں کو اپنے مذہب پر عمل درآمد میں مشکلات کا سامنا ہے۔ان میں میانمار (سابق برما) کے روہنگیا اور چین کے صوبہ سنکیانگ کے مسلمان شامل ہیں۔مسلمان ممالک پر لازم ہے کہ وہ ان دونوں معاملات پر مسلمانوں کی حالت زار کے متعلق صحیح اعداد و شمار اور رپورٹ اکٹھی کریں اور پھر ان دونوں ممالک پر یہ زور دیا

Marfat.com

جائے کہ اپنے اپنے علاقوں میں مسلمانوں کو مذہبی آزادی دے۔ میانمار کی صورت حال تو بہت بری ہے۔ اسی لئے تین لاکھ برمی مسلمان پناہ کے لئے بنگلہ دیش پہنچ گئے ہیں۔ چنانچہ مسلمان ممالک کا اصل کام یہ ہے کہ وہ ان مسلمانوں کو اس مصیبت سے نجات دلائیں۔ اس کے ساتھ وہ یہ وعدہ بھی کر سکتے ہیں کہ ان علاقوں کے مسلمان اپنی حکومتوں کے خلاف کسی غیر قانونی کام میں ملوث نہیں ہونگے۔

کچھ علاقے ایسے ہیں جہاں مسلمان، مرکزی حکومتوں کے خلاف مسلح جدوجہد میں مصروف ہیں۔ مثلاً فلپائن میں منڈاناؤ کے علاقے کے مسلمان پچھلے تیس برس سے بھی زیادہ سے اپنی آزادی کے لئے مسلح جدوجہد میں مصروف ہیں۔ یہ جدوجہد، باوجود ہزاروں قربانیوں کے، اب تک بے نتیجہ رہی ہے اور مستقبل میں بھی اس سے کوئی نتیجہ نکلنے کا امکان نہیں ہے۔ ویسے بھی یہ کوئی صحیح حکمت عملی نہیں ہے کہ جس چھوٹی سی جگہ مسلمانوں کو اکثریت مل جائے، وہاں وہ اپنی آزاد مملکت کے لئے جدوجہد شروع کر دیں۔ اس کی چار وجوہات ہیں۔ ایک یہ کہ اس طرح دوسری غیر مسلم ریاستیں آئندہ اپنے ہاں اشاعت اسلام کی اجازت نہیں دیں گی، اس لئے کہ وہ سوچیں گی کہ ان مسلمانوں کو کسی چھوٹے سے علاقے میں بھی اکثریت مل جاتی ہے تو یہ ملک توڑنے کے درپے ہو جاتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ مسلمان ملکوں میں بھی ایسے علاقے موجود ہیں۔ جہاں غیر مسلموں کی اکثریت ہے۔ مثلاً سوڈان کے جنوبی علاقے میں عیسائیوں کی اکثریت ہے۔ اپنی اس حکمت عملی کے ذریعے وہاں کی علیحدگی پسند غیر مسلم گروہوں کو ہم اخلاقی جواز فراہم کر دیتے ہیں۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ اب جہاں جہاں جمہوریت ہے، وہاں سے کسی اقلیت کی غلامی کا سوال ہی ختم ہو گیا ہے۔ اس لئے کہ جمہوریت میں ہر ایک کو اپنے حقوق ملتے ہیں اور اگر کہیں نہیں ملتے تو پر امن سیاسی جدوجہد کا راستہ کھلا ہے۔ چوتھی اور سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو اپنے حقیقی مشن کو کبھی نہیں بھولنا چاہئیے۔ وہ مشن غیر مسلموں میں پر امن طریقے سے اسلام کی دعوت پھیلانا ہے۔ جب ہم غیر مسلموں سے اپنے آپ کو سیاسی طور پر کاٹ دیتے ہیں تو

Marfat.com

ان میں اسلام کی دعوت کا راستہ بند ہو جاتا ہے۔ چنانچہ منڈاناؤ کے مسلمانوں کے لئے جدوجہد کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ وہ سیاسی علاقائی خودمختاری کے لئے پرامن جدوجہد کریں، اور پورے فلپائن میں اشاعتِ اسلام کے لئے کام کریں۔

کئی علاقے ایسے ہیں جہاں مسلمان، مسلمانوں کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ مثلاً اس وقت کرد نسل کے لوگ ایران، ترکی اور عراق میں منقسم ہیں اور وہ اپنی آزادی کے لئے مسلح جدوجہد کر رہے ہیں۔ یہ جدوجہد بے فائدہ ہے۔ اس کے بجائے ان کے لئے مناسب راستہ یہ ہے کہ اپنے اپنے ممالک سے غیر مشروط وفاداری کا اعلان کر کے جمہوریت اور صوبائی خودمختاری کا پرامن مطالبہ کریں۔

یہی حال آچے کا ہے جہاں نوے فیصد مسلمان ہیں اور اپنی مسلمان حکومت انڈونیشیا کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ یہ لڑائی دونوں فریقوں کے لئے نقصان دہ ہے۔ اس لئے آچے کے لوگوں کو بھی مسلح جدوجہد چھوڑ کر پرامن سیاسی راستہ اپنانا چاہئے۔

ذخیرہ

Marfat.com

اٹھارھواں باب:

''دہشت گردی کے خلاف جنگ''

نائن الیون کے بعد امریکہ نے دنیا کو ایک نئی اصطلاح سے روشناس کردیا ہے۔ وہ ہے ''دہشت گردی کے خلاف جنگ''۔ دہشت گردی کی اصطلاح کے اب تک کوئی متفقہ معنی بیان نہیں کیے جاسکے۔ اقوام متحدہ اور دوسرے عالمی فورموں پر برسوں سے یہ بحث جاری ہے، تاہم اس کی کوئی تعریف متعین نہیں ہوسکی۔ فی الوقت ہم آسانی کی خاطر دہشت گردی کی اصطلاح کی کچھ تعریفیں متعین کرکے ان کا تجزیہ کریں گے۔

دہشت گردی کی ایک تعریف کے مطابق ''ہر وہ مسلح عمل دہشت گردی ہے جو کسی غیر حکومتی مسلح تنظیم کی طرف سے عام لوگوں کے خلاف ہو''۔ اگر کوئی حکومت ایسی مسلح تنظیموں کی سرپرستی کرتی ہے، تو اُسے بھی دہشت گرد قرار دیا جاسکتا ہے۔ تاہم اگر کوئی مقامی پرائیویٹ مسلح تنظیم اپنی قوم کی آزادی کی خاطر خالصتاً فوجی تنصیبات پر حملہ کرے، تو یہ دہشت گردی نہیں۔ امریکہ، فی الوقت، دہشت گردی کی یہی تعریف کرتا ہے۔ گویا اس تعریف کے مطابق کشمیر میں برسرِ پیکار ''حزب المجاہدین'' دہشت گرد تنظیم نہیں، اس لیے کہ وہ صرف مسلح افواج پر حملے کرتی ہے اور اُس میں غیر مقامی لوگ نہیں ہیں۔ اس کے بالکل برعکس، اس تعریف کے مطابق، ''لشکر طیبہ'' دہشت گرد تنظیم ہے۔ اس لیے کہ یہ تنظیم غیر مسلح لوگوں کو بھی ٹارگٹ بناتی ہے اور اس میں سرحد پار سے بھی لوگ بھرتی ہوتے ہیں۔ چنانچہ اسی معیار کے تحت امریکہ نے بہت سی تنظیموں کو دہشت گرد قرار دیا ہوا ہے۔ ان میں غیر مسلم عیسائی اور نسلی تنظیمیں بھی شامل ہیں، تاہم ان کی بڑی اکثریت القاعدہ جیسی مسلمان تنظیموں پر مشتمل ہے۔

دہشت گردی کی ایک اور تعریف کے مطابق ''ہر غیر حکومتی گروہ کی جانب سے ہوئی بھی مسلح اقدام دہشت گردی ہے''۔ گویا اس تعریف کے مطابق مسلح اقدام کا حق صرف کسی حکومت ہی

Marfat.com

کو حاصل ہے۔ اگر کوئی ریاست بے انصافی پر مبنی کوئی مسلح اقدام کرتی ہے، تو اسے ظالمانہ اقدام یا جنگ تو کہا جا سکتا ہے، مگر دہشت گردی نہیں۔ گویا اس تعریف کے مطابق دہشت گردی کو غیر حکومتی مسلح گروہ کے لیے خاص کر دیا گیا ہے اور ریاستی دہشت گردی کو اس کے دائرے سے نکال دیا گیا ہے۔

دہشت گردی کی ایک اور تعریف یہ ہے "کسی بھی ریاست یا گروہ کی جانب سے خوف اور دہشت کا ماحول پیدا کر کے اپنے مقاصد کے حصول کی کوشش کرنا"۔ یہ ایک وسیع تر تعریف ہے جو ریاستی اور گروہی دونوں کی طرف سے بنائے گئے خوف اور دہشت کے ماحول کا احاطہ کرتی ہے۔

جو غیر حکومتی مسلح گروہ مختلف ممالک یا پوری دنیا میں کاروائیاں کر رہے ہیں، وہ اپنے آپ کو دہشت گرد کہلانے سے انکار کرتے ہیں۔ اُن کے خیال میں وہ بہت اچھے مقاصد کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں اور اس جدوجہد کا ایک راستہ غاصب ملک کے بظاہر عام اور معصوم باشندوں کا قتل بھی ہے تاکہ اُس غاصب ملک کو جھنجھوڑا جا سکے۔ کئی ممالک بھی اِن تنظیموں کے موقف سے جزوی طور پر اتفاق کرتے ہیں۔ مثلاً پاکستان مقبوضہ کشمیر کے اندر مسلح تنظیموں کو آزادی کی تحریکیں سمجھتا ہے۔ اسی طرح اکثر عرب ممالک حماس جیسی مسلح تنظیموں کی جدوجہد کو بنیادی طور پر صحیح سمجھتے ہیں۔ اگرچہ ان ممالک میں سے کچھ کے خیال میں غیر فوجی مقامات پر حملے آج کے حالات میں حکمت عملی کے طور پر مناسب نہیں۔ اکثر مسلمان ممالک اس بات پر زور دیتے ہیں کہ آزادی کی تحریکوں اور دہشت گردی کی تحریکوں میں فرق کیا جانا چاہیے۔ لیکن اس فرق کی حدِ فاصل کہاں ہے، اس کا تعین اگر ناممکن نہیں، تو بہت مشکل ضرور ہے۔

اس راقم کے خیال میں دہشت گردی کی اصطلاح اُسی طرح کی ایک مغربی اصطلاح ہے جیسے سیکولرزم یا فنڈامنٹلزم وغیرہ۔ تاہم چونکہ مغرب اس اصطلاح کا انطباق و استعمال زیادہ تر مسلمان ممالک اور مسلمان تنظیموں پر کرتا ہے، اس لیے ہمیں یہ حق حاصل ہے کہ ہم اپنے طور پر

Marfat.com

دہشت گردی کی تعریف کر کے مغرب کو بتائیں کہ ہم کس چیز کو دہشت گردی سمجھتے ہیں، تا کہ یہ واضح ہو سکے کہ اس معاملے میں مغرب کے ساتھ کہاں کہاں تعاون یا عدم تعاون کا رویہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔

یہ بات واضح ہے کہ ابھی ایک لمبے عرصے تک یہ اصطلاح ایک مبہم سی شکل میں چلتی رہے گی اور ہر ملک اس سے اپنے اپنے معنی اخذ کرتا رہے گا۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اس لفظ کی آڑ میں ہر ملک دراصل اپنے مقاصد حاصل کرنا چاہتا ہے۔ مثلاً امریکہ کبھی یہ نہیں مانے گا کہ عراق میں اُس کی مداخلت دہشت گردی تھی۔ اسی طرح کوئی مسلمان ملک بھی یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہوگا کہ فوجی انقلاب بھی دراصل ایک طرح کی دہشت گردی ہے۔ یہی حال باقی سب ممالک اور گروہوں کا ہے۔ ہر ملک اور گروہ دوسروں کے طرزِ عمل کو تو دہشت گردی قرار دیتا ہے، مگر اپنے حصے کی دہشت گردی کی تاویل کرتا ہے۔

اِس راقم کی رائے میں "ہر وہ مسلح عمل دہشت گردی ہے جس میں دہشت پیدا کر کے اپنے مقاصد کے حصول کی کوشش کی جائے اور اس عمل میں ایسے اقدامات اٹھائے جائیں جن کی وجہ سے براہ راست یا جن کے نتیجے کے طور پر جنگ میں غیر شریک افراد کے جان و مال کو نقصان پہنچے"۔ گویا اس کا مطلب یہ ہے کہ ریاستیں بھی دہشت گردی کا ارتکاب کر سکتی ہیں اور مسلح گروہ بھی۔تاریخ کے مطالعے سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ دہشت گردی ہر دور میں جاری تھی اور آج بھی جاری ہے۔ پچھلے زمانے میں بادشاہ عموماً اس طرح کی دہشت گردی کا ارتکاب کرتے تھے۔ اس میں مسلم اور غیر مسلم کی کوئی تمیز نہیں تھی۔ یورپی ریاستوں نے صلیبی جنگوں میں مسلمانوں اور یہودیوں کے خلاف بدترین دہشت گردی کا ارتکاب کیا۔ ہماری تاریخ میں امیر تیمور اور نادر شاہ جیسے بہت سے بادشاہ گزرے ہیں جنہوں نے لاکھوں عام افراد کا قتل عام کر کے دہشت گردی کا ارتکاب کیا۔ سپین میں لاکھوں مسلمانوں کو قتل کر کے اُس وقت کے عیسائی حکمرانوں نے خوف و دہشت کا بازار گرم کر دیا۔ یورپ میں، قرونِ وسطیٰ میں، پوپ اور دوسرے مذہبی رہنماؤں نے

Marfat.com

سائنسی اور جمہوری ذہنیت رکھنے والے لوگوں کا قتلِ عام کر کے دہشت گردی کی۔ پہلی اور دوسری جنگِ عظیم کو شروع کر کے جرمنی، اٹلی اور جاپان نے دہشت گردی کی، جس کے نتیجے میں کروڑوں افراد موت کے گھاٹ اتر گئے۔ دوسری جنگِ عظیم میں ہیروشیما اور ناگاساکی نامی شہروں پر ایٹم بم پھینک کر امریکہ نے دہشت گردی کا ارتکاب کیا۔ اسی طرح ویت نام پر امریکی حملہ، ہنگری پر روسی حملہ، ایران اور کویت پر عراق کا حملہ، افغانستان میں روسی مداخلت، ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر خودکش حملہ، افغانستان پر امریکی بمباری اور عراق پر امریکی حملہ، یہ سب واقعات دہشت گردی کی کڑیاں ہیں۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ دنیا دہشت گردی سے نجات حاصل کرے تو یہ ضروری ہے کہ ہر طرح کی دہشت گردی کو دہشت گردی تسلیم کیا جائے اور اس کا مداوا کیا جائے۔

بسا اوقات دہشت گردی کا ایک اقدام، یا کوئی غلط یا اشتعال انگیز سیاسی فیصلہ دہشت گردی کے دوسرے اقدامات کی ابتدا اور ان کا جواز بنتا ہے۔ مثلاً صدام حسین نے کویت پر قبضہ کیا، جس کے نتیجے میں امریکہ کو خلیج میں آنے کا بہانہ ملا، پھر اُس نے سعودی عرب کے تحفظ کا بہانہ بنا کر سعودی عرب میں اپنے فوجی اڈے بنا لیے، ان فوجی اڈوں کو جواز بنا کر بن لادن نے سعودی حکمرانوں اور امریکہ کے خلاف مسلح اقدامات شروع کر دیے، ان اقدامات کو آڑ بنا کر امریکہ نے افغانستان پر حملہ کر دیا، پھر اس حملے کے اثرات پاکستان پر بھی پڑے، پاکستانی حکومت نے امریکی مطالبات کو من وعن مان کر طالبان کے ہمدردوں کو اپنا دشمن بنا لیا اور پھر پاکستان میں موجود طالبان کے ہمدرد مسلح گروہوں نے یہاں خودکش حملوں سمیت مختلف اقدامات کیے۔ اگر عمل اور ردِ عمل کا یہ سلسلہ یونہی چلتا رہا تو یہ آگ بجھے گی نہیں، بلکہ مزید بھڑکے گی۔

چونکہ موجودہ قضیے کی ابتدا نائن الیون سے ہوئی، اس لیے مناسب ہے کہ یہاں ٹھہر کر کچھ تجزیہ کیا جائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نائن الیون کا واقعہ ایک دہشت گردی تھی۔ اس لیے کہ اس میں تین ہزار کے لگ بھگ ایسے لوگ ہلاک ہوئے جو جنگ میں کوئی بھی حصہ ادا نہیں کر رہے تھے۔ امریکہ کے اندر اس بارے میں کوئی دو رائے نہیں تھیں کہ یہ کس کی کارستانی ہے۔

Marfat.com

چونکہ بن لادن اُس وقت افغانستان میں تھے، اس لیے امریکہ نے طالبان حکومت کو الٹی میٹم دیا۔

اب یہاں اس نکتے پر سوچنا چاہیے کہ کیا معاملات یہاں تک پہنچانے میں امریکہ کا کوئی کردار نہیں تھا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بات سبھی جانتے تھے کہ بن لادن کو اصل غم وغصہ اس بات پر تھا کہ امریکی افواج نے سعودی عرب کی سرزمین پر اپنے اڈے کیوں بنائے ہوئے ہیں۔ وہ اس اقدام کو اس مقدس سرزمین کی بے حرمتی سمجھتے تھے۔ اور واقعتاً یہ بے حرمتی تھی بھی۔ ظاہر ہے کہ عراق کے فیصلہ کن شکست کے بعد عراق پر جو پابندیاں لگائی گئی تھیں، اُن کے پیشِ نظر اس بات کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ عراق، سعودی عرب پر فوجی حملہ کر سکے گا۔ چنانچہ یہ اڈے بالکل غیر ضروری اور اشتعال انگیز تھے۔ اگر اُسی وقت اس بات کو سمجھ کر یہ اڈے یہاں سے ہٹا لیے جاتے، تو بعد کے بہت سے ناپسندیدہ اقدامات سے بچا جا سکتا تھا۔

دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جب 1985ء میں روسی فوجیں افغان سرزمین سے نکل گئیں، تو امریکہ نے اس پورے علاقے کو حالات کے رحم وکرم پر چھوڑ کر یہاں اپنی دلچسپی ختم کر دی۔ اُس وقت امریکہ نے یہ نہ سوچا کہ یہ ہزاروں لوگ، جن کے پاس اربوں ڈالر کا اسلحہ ہے، اب کیا کریں گے اور کہاں جائیں گے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ایسے جنگجو لوگ آرام سے اپنے گھروں کو سدھار جائیں۔ امریکہ نے یہ بھی نہ سوچا کہ پاکستانی اسٹیبلشمنٹ کے اندر طاقت کے کئی مراکز بن چکے ہیں، جن کی سمتیں ایک دوسرے سے مختلف بلکہ متضاد ہیں۔ چنانچہ اگر امریکہ نے یہ سنگ دلانہ اور سفاکانہ غلطیاں کیں، تو ان کا نتیجہ تو بہر حال برآمد ہونا تھا۔

نائن الیون کے بعد امریکی حکومت اور امریکی قوم اجتماعی طور پر اشتعال کی کیفیت میں مبتلا ہوگئی۔ جب کوئی قوم اس کیفیت میں مبتلا ہو جاتی ہے تو اُس سے پے در پے غلطیاں ہوتی ہیں۔ چنانچہ امریکہ نے افغانستان پر بمباری کا فیصلہ کر لیا، جس کا نتیجہ امریکہ اور پاکستان سمیت ساری دنیا بھگت رہی ہے۔ اُس وقت امریکہ کے سامنے برداشت پر مبنی پُر امن راستہ بھی موجود تھا۔ وہ راستہ یہ تھا کہ طالبان حکومت کی مکمل اقتصادی ناکہ بندی کی جاتی۔ اس طرح طالبان

Marfat.com

حکومت کو مذاکرات پر مجبور ہونا پڑتا۔ اگرچہ یہ راستہ اختیار کرنے میں وقت زیادہ لگتا، تاہم اس کے نتائج پوری دنیا کے لیے نسبتاً کم ضرر رساں ہوتے۔

تاہم امریکہ نے ایسا نہیں کیا۔ غالباً آئندہ بھی امریکہ زیادہ پُرامن راستہ اختیار نہیں کرے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُس کے اقدامات طاقت کی نفسیات کے تحت طے ہو رہے ہیں۔ طاقت کی منطق پُرامن حل کو زیادہ قبول نہیں کرتی۔ یہ بھی ممکن نہیں کہ ہم ان معاملات میں امریکہ کو قائل کر سکیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ امریکہ میں جس اونچی سطح پر سٹریٹیجک معاملات طے ہوتے ہیں، وہاں تک اسرائیل اور بھارت کی رسائی تو ہے، مگر ہماری کوئی رسائی نہیں۔

چنانچہ اب ہمیں یہ سوچنا ہے کہ اگر امریکہ اپنی روش تبدیل نہیں کرتا، تو پھر یک طرفہ طور پر ہماری حکمت عملی کیا ہونی چاہیے؟ کیا مسلمان ریاستوں کو امریکہ کا جنگی مقابلہ کرنا چاہیے؟ کیا اسلام کی محبت میں سرشار مسلح گروہوں کو امریکی مفادات کے خلاف اپنے مسلح اقدامات اور خودکش حملے جاری رکھنے چاہئیں؟ کیا اسلام اور امت مسلمہ کو ان حملوں سے وسیع تر تناظر میں کوئی فائدہ مل سکے گا؟ کیا اس طرح ہم امریکہ کو شکست دے سکیں گے؟ ان تمام سوالات کا، اس راقم کے نزدیک، جواب یہ ہے کہ ہمارے لیے اصل راستہ یہ ہے کہ ہم یک طرفہ طور پر صبر و حکمت اختیار کریں، امریکی اشتعال انگیزی کے مقابلے میں سیاسی دلیل کا طریقہ اختیار کریں، موجودہ مسائل کا پُرامن حل تلاش کریں اور امریکہ کو یہ موقع ہی نہ دیں کہ وہ آئندہ کسی مسلمان ملک میں مداخلت کر سکے۔ یہی راستہ اسلام اور امت مسلمہ کے وسیع تر مفاد میں ہے۔ فی الوقت ہر لڑائی امریکہ کے مفاد میں ہے۔ ہر خودکش حملے کے ذریعے اُسے یہ بہانہ ملتا ہے کہ وہ عالم اسلام کو اس خودکش حملے کے نقصان سے ہزار گنا زیادہ نقصان پہنچائے۔

پچھلے تین سو برس سے امت مسلمہ تقریباً ہر مسلح جنگ میں شکست کھا رہی ہے۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اس معاملے کو ریورس کیا جائے۔ لیکن یہ تبھی ہو سکتا ہے جب اس سے پہلے خوب تیاری کی جائے۔ تیاری کے لیے ہمیں امن کا وقفہ چاہیے۔ چنانچہ یہ وقفہ ہمیں مقابل

Marfat.com

طاقتوں سے، ہر ممکن طریقے سے، حاصل کرنا ہوگا۔

اس راقم کے نزدیک ریاست سے عاری کسی مسلح تنظیم کی طرف سے اقدام اسلام کے اصولِ جنگ کے بھی خلاف ہے۔ اسلام کے اصولِ جنگ میں چار پہلو بہت نمایاں ہیں۔ وہ یہ کہ مسلح اقدام صرف کسی ریاست کا حق ہے، ریاست بھی صرف اُس صورت میں مسلح اقدام کر سکتی ہے جب یہ کسی ظلم یا زیادتی کے خلاف ہو، یہ اقدام صرف اُسی وقت کیا جا سکتا ہے جب دوسرے ملک سے اس کا معاہدۂ امن نہ ہو، اور یہ اقدام صرف اس وقت کرنا چاہیے جب اس جنگ کے جیتنے پر پورا پورا دنیوی امکان موجود ہو۔ اس امت کی چودہ سو سالہ تاریخ میں اس بات پر اہلِ علم کے درمیان مکمل اتفاق رہا ہے کہ جنگ صرف ریاست کا حق ہے۔ مسلح گروہوں کو جنگ کا حق دینے کا موجودہ رجحان 1980ء میں اس وقت شروع ہوا جب جنرل ضیاء الحق کی حکومت نے اپنے مقاصد کے لیے افغان قوم کو تقسیم کر کے آٹھ مسلح تنظیموں میں بانٹ دیا۔ چونکہ اس وقت امریکہ کو روس سے اپنا سکور برابر کرنا تھا، اس لیے امریکہ نے بھی اس تصور کی بڑھ چڑھ کر حمایت کی۔ اُس وقت امریکی ذرائع ابلاغ کو مجاہدین کا لفظ بہت بھلا لگتا تھا۔ لیکن بالآخر عالمی امن پر اس کے وہی اثرات ہوئے جو آج ساری دنیا بھگت رہی ہے۔

اگر مسلمان یک طرفہ طور پر کچھ اقدامات اٹھائیں تو ہم قابض طاقتوں کے ناپاک قدموں سے اپنی سرزمین کو پاک کر سکیں گے اور ساتھ ہی ساتھ ہمارے لیے مستقبل کے بہت سے امکانات کھل جائیں گے۔ مثلاً طالبان یہ اعلان کر لیں کہ وہ اپنے آپ کو ایک سیاسی پارٹی میں بدل دیں گے اور مسلح جدوجہد چھوڑ دیں گے۔ اگر ایسا ہوا تو افغانستان کیا، پاکستان کی بھی تقدیر بدل جائے گی۔ افغانستان کے آئندہ انتخابات میں طالبان ایک مضبوط گروہ کی حیثیت سے سامنے آسکیں گے۔ پھر اُس وقت جو بھی حکومت ہوگی، اُس کے لیے امریکہ سے یہ مطالبہ کرنا نہایت آسان بلکہ ضروری ہو جائے گا کہ امریکہ اس سرزمین کو چھوڑ دے۔ طالبان کے اس اقدام سے افغانستان کے اندر وارلارڈز کی کمر ٹوٹ جائے گی، اور سب گروہ اس بات پر مجبور ہو جائیں

Marfat.com

گے کہ وہ اپنے آپ کو حقیقی سیاسی پارٹیوں کی شکل میں ڈھال لیں۔ طالبان کے اس اقدام کا پاکستان کے حالات پر بھی بہت بہتر اثر پڑے گا۔ امریکہ کو یہاں مداخلت کا بہانہ نہیں مل سکے گا۔ پاکستانی طالبان بھی اپنے آپ کو ایک سیاسی پارٹی کی شکل میں ڈھال سکتے ہیں، اور اُن کی موجودگی پاکستانی سیاست کے لیے ایک نیک فال ثابت ہو سکتی ہے۔ کیونکہ ہمیں ایسی سیاسی پارٹیوں کی ضرورت ہے جو، خواہ کسی بھی نقطہ نظر سے تعلق رکھتی ہوں مگر مخلص اور قول و فعل کے تضاد سے پاک ہوں۔

خودکش حملے

خودکش حملوں کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ خوارج نے درحقیقت خودکش حملوں ہی کے ذریعے حضرت علیؓ، حضرت امیر معاویہؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ کو شہید کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ حسن بن صباح، جس نے خراسان کے پہاڑوں میں اپنی حکومت بنا کر قلعہ الموت کو اس کا مرکز بنا دیا تھا، کا ایک بڑا ہتھیار خودکش حملے ہی تھا۔ اس طرح اُس نے اپنے وقت کے بڑے بڑے بادشاہوں کو لرزہ براندام کر دیا تھا۔ حتیٰ کہ ہلاکو خان نے آ کر اُس کے قلعے کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔

زمانہ حال میں، دوسری جنگ عظیم میں، جاپانیوں نے بھی خودکش حملوں سے کام لیا تھا۔ وہ یوں کہ پائلٹ بارود سے بھرے ہوئے ہوائی جہاز کو اڑاتے ہوئے برطانیہ کے کسی بحری جہاز کی چمنی کے اندر گھس جاتا، یوں وہ اپنے آپ کو ختم کرتے ہوئے دشمن کا سمندری جہاز بمعہ سینکڑوں سپاہیوں کے غرق کر دیتا۔ اگرچہ اس سے برطانیہ کا بڑا نقصان ہوا، لیکن اصل نقصان جاپان کا ہوا۔ کیونکہ اس طریقِ جنگ سے جاپان کے پاس پائلٹ ختم ہو گئے، اور یوں اُس کے پاس اتحادی افواج کے ہوائی حملوں کو روکنے کا کوئی ذریعہ نہ رہا۔

سن اسی کی دہائی میں سری لنکا کے تامل گوریلوں نے بھی خودکش حملوں کو آزمانے کا فیصلہ کیا۔ بھارت کے سابق وزیر اعظم راجیو گاندھی کو بھی خودکش حملے ہی کے ذریعے ہلاک کیا گیا۔ تامل گوریلوں کی طرف سے ابھی تک سری لنکا کی ریاست کے خلاف تین سو سے زیادہ

Marfat.com

خودکش حملے ہو چکے ہیں جن میں سینکڑوں فوجی اور سویلین مارے گئے ہیں۔مگر ان حملوں کی وجہ سے سری لنکا کے موقف میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

خودکش حملوں کا ایک اور سلسلہ اسرائیل کے خلاف شروع ہوا، جب حماس سے تعلق رکھنے والے جاں بازوں نے اسرائیل کے اندر خودکش حملے شروع کیے۔ان حملوں میں بھی بہت سے اسرائیلی فوجی اور سویلین ہلاک ہوئے۔پھر القاعدہ جیسی تنظیموں نے بھی یہ راستہ اپنایا اور پوری دنیا میں امریکی مفادات کے بہت سے ٹھکانوں پر خودکش حملے کیے۔اس سلسلے کا سب سے بڑا حملہ نائن الیون کا تھا۔خودکش حملوں کا یہ سلسلہ بڑھتے بڑھتے عراق تک پہنچا، جہاں امریکی افواج کے مختلف ٹھکانوں پر حملے کیے گئے۔تاہم اصل خودکش حملے سُنیوں اور شیعوں نے ایک دوسرے کے خلاف کیے۔ان حملوں میں دونوں طرف کے ہزاروں لوگ جاں بحق ہو چکے ہیں، اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔

پھر خودکش حملوں کا یہ سلسلہ پاکستان بھی آ پہنچا۔یہاں بھی کئی امریکی ٹھکانوں پر خودکش حملے کیے گئے۔تاہم بہت سے خودکش حملے اہلِ سنت اور اہلِ تشیع سے تعلق رکھنے والے انتہا پسند افراد نے ایک دوسرے کے خلاف کیے۔کچھ ایسے خودکش حملے بھی کیے گئے جن میں اہلِ سنت کے مختلف گروہوں نے ایک دوسرے کو نشانہ بنایا۔کئی خودکش حملوں کے ذریعے جنرل پرویز مشرف اور اُس کے حامیوں کو بھی نشانہ بنایا گیا۔

یہاں سے یہ سلسلہ افغانستان پہنچا۔افغانستان کے اندر 1977ء سے لڑائی اور خانہ جنگی جاری ہے۔تاہم اس جنگ کے دوران میں ستائیس اٹھائیس برس تک کسی گروہ نے بھی دوسرے کے خلاف خودکش حملوں کا ہتھیار نہیں آزمایا۔تاہم 2005ء سے افغانستان کے اندر بھی طالبان کی طرف سے امریکی افواج اور حامد کرزئی کی حکومت کے خلاف خودکش حملے شروع ہو گئے۔یہ حملے اب بھی جاری ہیں۔

پوری دنیا کی تاریخ میں خودکش حملوں کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ خودکش حملوں

Marfat.com

سے دشمن کے بجائے خود اپنے آپ کو زیادہ نقصان پہنچتا ہے۔ وہ یوں کہ خودکش حملوں کے لیے صرف وہی شخص اپنے آپ کو پیش کرتا ہے جو انتہائی پرعزم، باصلاحیت اور قربانی کے جذبے سے سرشار ہو۔ جب کہ ان حملوں میں مرنے والے مخالف قوم کے افراد عموماً عام افراد ہوتے ہیں جو اتفاق سے لقمہ اجل بن جاتے ہیں۔ جب قوم کے باصلاحیت اور پرعزم نوجوان ان حملوں میں کام آجائیں تو پیچھے اوسط درجے کے لوگ ہی بچتے ہیں۔ جاپان نے بھی دوسری جنگ عظیم میں اپنے پائلٹوں کو دشمن کے بحری جہازوں سے ٹکرا کر ایسا ہی غلط فیصلہ کیا تھا، جس کے نتیجے میں اُس کے پاس پائلٹوں کی شدید قلت ہوگئی تھیں۔ چنانچہ یہ کوئی صحیح حکمت عملی نہیں۔

خودکش حملوں سے نمٹنے کے لیے مخالف طاقت بھی آہستہ آہستہ حکمت عملی سیکھ لیتی ہیں۔ مثلاً اسرائیل نے یہ سٹریٹیجی اختیار کی کہ خودکش حملہ آوروں کے سارے اہلِ خانہ کو جیل میں ڈال دیا، پھر ان کو جلاوطن کر کے بے یارومددگار چھوڑ دیا اور ان کے گھروں پر بلڈوزر چلادیے۔ اگرچہ یہ بہت ظالمانہ کاروائی تھی۔ تاہم اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خودکش حملوں کی تعداد کم ہوتے ہوتے نہ ہونے کے برابر رہ گئی۔ کیونکہ خودکش حملہ آور سوچتے تھے کہ ہمارے بعد ہمارے اہلِ خانہ اور پیاروں کو ناقابلِ بیان اذیت کا سامنا کرنا پڑے گا۔

خودکش حملے مخالف طاقت کے اندر ایک ایسی نفسیات پیدا کرتے ہیں، جن میں ضد، انتقام اور نفرت شامل ہوتی ہے۔ بسا اوقات خودکش حملے دشمن کی صفوں میں اتحاد پیدا کرنے کا باعث بنتے ہیں۔ مثلاً جب بھارت کے اندر خودکش حملے ہوئے تو سارا بھارت ان حملوں کے خلاف متحد ہوگیا اور سب لوگوں نے مطالبہ کیا کہ ان خودکش حملہ آوروں کے مطالبات کے سامنے سر نہ جھکایا جائے۔ یوں ان خودکش حملوں سے بھارت کو بحیثیت ریاست بڑی تقویت حاصل ہوئی۔

خودکش حملوں سے مظلوم قوم کی جدوجہد کو سخت نقصان پہنچتا ہے اور دنیا کے نزدیک ظالم و مظلوم ایک ہی صف میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ بلکہ بعض اوقات تو ظالم قوم پروپیگنڈے

Marfat.com

کے زور پر مظلوم قوم کو جارحیت پسند قرار دینے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ آج تک جتنے بھی خودکش حملے ہوئے ہیں، اُن میں فوجی اور غیر فوجی تنصیبات کا خیال عموماً نہیں رکھا گیا۔ چنانچہ جب ریستورانوں، مارکیٹوں اور بسوں میں خودکش حملوں سے سویلین مرجاتے ہیں، تو انسانیت کا مجموعی ضمیر ایسی کارروائیوں کو پسند نہیں کرتا اور ان کی مذمت کرتا ہے۔ جب فلسطینی خودکش حملہ آوروں نے پبلک مقامات پر دھماکے کیے، تو اس کے نتیجے میں ظالم اسرائیل کو تو کوئی خاص نقصان نہیں پہنچا، لیکن دنیا کی رائے عامہ کی نظر میں فلسطینیوں کی جائز آزادی کی جدوجہد پر اخلاقی اعتبار سے داغ لگ گیا۔

جب ایک دفعہ خودکش حملوں کو جائز قرار دیا جائے، خواہ وہ کتنے ہی نیک مقصد کے لیے کیوں نہ ہو، تو پھر یہ سلسلہ کہیں پر بھی جا کر نہیں رکتا۔ پھر اس کے نتیجے میں ایک گناہ گار کے ساتھ سو بے گناہ مارے جاتے ہیں۔ مثلاً جب کچھ علماء نے ظالم طاقت کے خلاف خودکش حملوں کے جواز کا فتویٰ دیا تو بہت جلد بات یہاں تک پہنچی کہ ہر گروہ نے دوسرے گروہ کو ظالم اور خارج از دائرہ اسلام قرار دیتے ہوئے اُس کے خلاف خودکش حملوں کو جائز سمجھ لیا۔ اسی فتوے سے فائدہ اٹھا کر عراق میں اہلِ سنت اور اہلِ تشیع نے ایک دوسرے کے خلاف خودکش حملے کیے، جس کے نتیجے میں ہزاروں لوگ جاں بحق ہو چکے ہیں۔ آج بھی وہاں پبلک مقامات پر خودکش حملوں کے ذریعے ایک دوسرے کے عام افراد کو ہلاک کرنے کا طریقہ زوروں پر ہے۔ پاکستان میں بھی یہی کچھ ہوا۔ مختلف مذہبی گروہوں نے ایک دوسرے پر خودکش حملے کیے، جس کے نتیجے میں دونوں طرف کے سینکڑوں لوگ جاں بحق ہوئے۔ اگرچہ ہر حملے کی ابتدا میں یہ دعویٰ کیا گیا کہ ان حملوں میں بیرونی ہاتھ ملوث ہے، لیکن تحقیقات کے نتیجے میں ہمیشہ یہ بات سامنے آئی کہ درحقیقت یہ خودکش حملہ ایک مذہبی یا سیاسی گروہ نے اپنے مخالف مذہبی یا سیاسی گروہ کے خلاف کیا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خودکش حملے ایک ایسا پنڈورا باکس ہیں جس کو کھولنے کے نتیجے میں پھر کوئی بھی محفوظ نہیں رہ سکتا۔

خودکش حملوں کے جواز میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ "یہ دراصل ظلم کا ردعمل ہیں، چونکہ

Marfat.com

مظلوم قوم کو دیوار سے لگا دیا گیا ہے، اس لیے ان لوگوں کے پاس خودکش حملوں کے سوا کوئی راستہ نہیں بچا۔ چنانچہ یہ خودکش حملے جائز ہیں''۔ یہ دلیل صحیح نہیں ہے۔ ظلم خواہ کتنا بھی بڑھ جائے، ہمیں اس کے مقابلے کے لیے اللہ نے خودکش حملوں کی اجازت نہیں دی۔ اللہ کا دین تو اس دنیا میں آیا ہی اس لیے ہے کہ ہمارے اقدامات اور ردعمل کو قابو میں رکھے، اور ہمیں ہر چیز کے حدود اور آداب سکھائے۔ یہ بات بھی غلط ہے کہ مظلوم اقوام مثلاً فلسطینیوں، عراقیوں، افغانیوں یا کشمیریوں کے پاس کوئی اور راستہ بچا ہی نہیں۔ درحقیقت مزاحمت کا سب سے بڑا ہتھیار عدم تشدد پر مبنی مظلومانہ جمہوری جدوجہد اور آپس میں اتحاد و اتفاق ہے۔ ان دونوں تدابیر سے مظلوم مسلمان اقوام نے کبھی فائدہ اٹھایا ہی نہیں۔ مثلاً فلسطینی اور کشمیری آپس میں بیسیوں تنظیموں میں بٹے ہوئے ہیں اور انہوں نے آج تک ایک متحد مقصد اور ایک متفقہ قائد پر اتفاق نہیں کیا۔ اسی طرح اگر آج طالبان مسلح مزاحمت چھوڑ کر جمہوری جدوجہد کا راستہ اختیار کریں تو بہت جلد امریکیوں کو یہاں سے نکالا جا سکتا ہے اور بعید نہیں کہ جمہوریت کے نتیجے میں افغانستان میں طالبان کی حکومت قائم ہو جائے۔

یہ بات ہر مسلمان کو معلوم ہے کہ خودکشی جائز نہیں ہے۔ تاہم بعض علماء نے آج کل کے خودکش حملوں کے جواز میں فتویٰ دیا ہے۔ اس ضمن میں سب سے اہم نام علامہ یوسف قرضاوی کا ہے۔ علامہ قرضاوی ان خودکش حملوں کو جہاد کی اعلیٰ ترین قسم قرار دیتے ہیں۔ اس ضمن میں وہ دلیل دیتے ہیں کہ جنگِ موتہ کے دوران، جب کہ دشمن کی تعداد بہت زیادہ تھی اور مسلمان لشکر کی تعداد کم تھی، میں مسلمان فوجیوں نے موت پر بیعت کی تھی۔ علامہ قرضاوی کے خیال میں، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دشمن کے خلاف خودکش حملہ جائز ہے۔ یہ راقم بصد ادب و احترام علامہ قرضاوی کے اس نقطہ نظر سے متفق نہیں ہے۔ میرے خیال میں اُن کی یہ دلیل صحیح نہیں ہے۔ جنگ موتہ میں مسلمان لشکر، ریاستِ مدینہ کے حکم پر لڑ رہا تھا۔ موت پر بیعت کا مطلب یہ تھا کہ ہم آخری دم تک لڑیں گے لیکن میدانِ جنگ سے بھاگیں گے نہیں۔ یہ بات قرآن مجید کے اس ارشاد کے عین مطابق ہے جس میں مسلمان لشکر کو میدان جنگ سے پیٹھ پھیر کر بھاگنے سے منع کیا گیا ہے۔

Marfat.com

ظاہر ہے کہ اِس ہدایت اور اِس واقعے کا خودکش حملوں سے کوئی تعلق نہیں بنتا۔ جنگ موتہ میں کسی مسلمان نے دشمن کے لشکر پر خودکش حملہ نہیں کیا۔ سارے مسلمان شہید بھی نہیں ہوئے۔ بلکہ عملاً یہ ہوا کہ مسلمان لشکر کے اس عزم و ہمت کے نتیجے میں دشمن کا لشکر بے حوصلہ ہوگیا اور مسلمان لشکر کے سردار حضرت خالدؓ بن ولید کو یہ موقع مل گیا کہ وہ رات کی تاریکی میں اپنے لشکر کو محفوظ مقام پر منتقل کردیں۔ اس کے بعد دشمن کے لشکر کو مسلمانوں کا پیچھا کرنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ درج بالا تجزیے کی روشنی میں اس راقم کا موقف یہ ہے کہ جنگ موتہ کے واقعات اور آج کل کے خودکش حملوں کا آپس میں کوئی موازنہ یا تعلق نہیں ڈھونڈا جاسکتا۔

اس ساری بحث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ خودکش حملوں کا موجودہ سلسلہ امت مسلمہ کے وسیع تر مفاد میں نہیں ہے اور یہ تدبیر اصولی اعتبار سے بھی غلط ہے۔

Marfat.com

انیسواں باب

مغرب کی طرف سے امت مسلمہ کے خلاف اشتعال انگیز کاروائیاں کیوں ہو رہی ہیں؟

مسلمہ اخلاقیات کا تقاضا یہ ہے کہ دنیا میں آزادیٔ رائے ہونی چاہیے۔ آزادیٔ رائے ہی کی بنیاد پر مکالمہ جنم لیتا ہے، جس کے نتیجے میں انسان کو خوب سے خوب تر راستہ ملتا ہے۔ تاہم دنیا میں ہر اچھی چیز کی بھی کچھ حدود و قیود ہوتی ہیں۔ مثلاً بالکل بجا طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ کسی انسان کے ہاتھ کی آزادی اُس جگہ ختم ہو جاتی ہے جہاں سے دوسرے انسان کی ناک شروع ہوتی ہے۔ اسی طرح آزادیٔ رائے کی بھی حدود ہیں۔ اس کے آداب یہ ہیں کہ بات تہذیب اور شائستگی کے ساتھ کی جائے، ناروا اور غلط الزامات نہ لگائے جائیں، فریقِ مخالف کا احترام کیا جائے اور کسی کے مذہب یا مقدس ہستیوں کا مذاق نہ اڑایا جائے۔ یہ چیزیں دل آزاری کو جنم دیتی ہیں، جس کے نتیجے میں انسانوں کے درمیان دشمنیاں اور نفرت پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ ہر اچھی گفتگو، مکالمے، تحریر، تقریر اور تصویر میں اس کا خیال رکھا جاتا ہے۔

ہر زمانے میں ایسے لوگ موجود ہوتے ہیں جو ان آداب کا خیال نہیں رکھتے۔ تاہم معاشرے کی اکثریت ان آداب کا خیال رکھتی ہے اور اُن لوگوں سے لاتعلقی کا اظہار کرتی ہے جو دوسروں کی مقدس ہستیوں کے بارے میں توہین آمیز اور تضحیک کا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ تاہم پچھلے کئی برس سے مغرب کا یہ وطیرہ رہا ہے کہ وہ توہین اور دل آزاری پر مبنی تحریروں اور تقریروں کو آزادیٔ اظہار کے پردے میں جائز قرار دیتا ہے اور الٹا اُن لوگوں پر تنقید کرتا ہے جو ایسی توہین کے خلاف احتجاج کرتے ہیں۔ اس کی ابتدا بدنام زمانہ مصنف سلمان رشدی کی کتاب "شیطانی آیات" سے ہوئی۔ یہ کتاب اسلام اور حضورؐ پر (خاکم بدہن) گھٹیا حملوں سے بھری ہوئی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس پر مسلمانوں کا احتجاج بالکل فطری تھا۔ تاہم مغرب نے نہ صرف یہ کہ سلمان رشدی

Marfat.com

کی مدافعت کی، بلکہ اُسے اعلیٰ ترین اعزازات سے نوازا، اور مختلف سربراہان مملکت سے اُس کی ملاقاتیں کروائیں۔ حال ہی میں برطانیہ نے اُسے ادب کے سب سے بڑے اعزاز سے نوازا ہے۔

اسی طرح بدنامِ زمانہ بنگلہ دیشی مصنفہ تسلیمہ نسرین، جس نے اپنے ناول ''لجا'' میں اسلام کے خلاف بہت بدزبانی کی ہے، کو یورپی پارلیمنٹ نے اظہار خیال اور آزادیٔ رائے کے سب سے بڑے ایوارڈ سے نوازا۔ مغرب کے اکثر میڈیا گروپوں نے بھی تسلیم نسرین کی حمایت کی۔ حالانکہ اس کے بالکل برعکس مغرب نے امن کو خطرے کے بہانے کی آڑ میں بہت سے مسلمان مصنفین پر پابندی لگائی ہے۔ حتیٰ کہ بوسنیا کے سابق صدر عالی جاں عزت بیگ کی کتاب Islam between East and West پر بھی فرانس میں پابندی لگادی گئی۔

اس کے بعد سے لے کر اب تک یہ سلسلہ مسلسل جاری ہے۔ کہیں کارٹونوں کے ذریعے اسلام کی تضحیک کی جاتی ہے، کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ ہمارے ملک میں قرآن مجید پر پابندی لگادی جائے یا مساجد کے مینار نہ بنائے جائیں۔ حتیٰ کہ امریکہ کے ایک ریپبلیکن رہنما نے یہاں تک ہرزہ سرائی کی کہ اگر اُس کے ملک کے خلاف حملوں کا سلسلہ بند نہ ہوا تو مکہ اور مدینہ پر بمباری کی جائے۔

تاہم یہاں یہ بات واضح ہونی چاہیے کہ سارا مغرب اس طرح نہیں سوچتا۔ جب ڈنمارک میں ایک اخبار نے دل آزار کارٹون چھاپے تو ڈنمارک کی حکومت کا رویہ بہت افسوس ناک رہا۔ وزیر اعظم نے مسلمان ممالک کے سفیروں سے ملاقات سے بھی انکار کردیا اور کہا کہ چونکہ یہ آزادیٔ اظہار کا مسئلہ ہے اس لیے اس معاملے پر معذرت کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ لیکن اس کے بالکل برعکس جب ناروے کے ایک اخبار نے ان کارٹونوں کو دوبارہ شائع کیا تو ناروے کے وزیر اعظم نے علی الاعلان مسلمانوں سے معافی مانگی اور اس بات پر بہت ندامت کا اظہار کیا کہ ایک اخبار کی غیر ذمہ داری کی وجہ سے مسلمانوں کے دل آزاری ہوئی۔ یورپ اور

Marfat.com

امریکہ کے اندر بہت سے اہم دانش وروں اور صائب الرائے افراد نے مسلمانوں کی دل آزاری پر مبنی چیزوں کی سخت مذمت کی۔ حتیٰ کہ امریکی حکومت نے بھی نیم دلی کے ساتھ ان چیزوں کی مذمت کی۔

تاہم یورپ کے چند بڑے ممالک مثلاً برطانیہ، فرانس، جرمنی اور اٹلی کا رویہ بڑا ہی افسوس ناک رہا۔ چنانچہ یہاں ہمارے سامنے ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ ایک طرف تو مغرب دہشت گردی کے خلاف نام نہاد جنگ میں مسلمان ممالک کی مدد کا خواست گار ہے، لیکن دوسری طرف مغرب کے چند اہم بڑے ممالک مسلمانوں کی دل آزاری کے درپے ہیں اور اس طرح کے کرتوتوں کے ذریعے مسلمانوں کو مسلسل اشتعال دلا رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ آخر وہ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟

اس راقم کے نزدیک اس کا جواب یہ ہے کہ مغرب ہمیں مسلسل ایک ہیجانی کیفیت میں رکھنا چاہتا ہے۔ جب کوئی قوم ہیجانی کیفیت کا شکار ہو جاتی ہے تو مشتعل ذہن کی نفسیات کے ساتھ وہ مسلسل ایسے Desperate اقدامات اٹھاتی ہے جو اُس کے طویل المیعاد مفادات کے خلاف ہوتے ہیں۔ ہیجانی کیفیت میں مبتلا قوم ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ سوچ بچار نہیں کر سکتی۔ حتیٰ کہ وہ دشمن کی چالوں کا تجزیہ اور اُس کا صحیح توڑ بھی نہیں کر سکتی۔ یہی کارٹونوں والے سانحے کی مثال لے لیجئے۔ جب ان کارٹونوں کی اشاعت کے دو تین مہینے بعد یہ خبر عالمِ اسلام میں پھیلی تو مختلف جگہوں میں مظاہرے شروع ہوئے۔ اکثر مظاہروں میں تشدد کے واقعات بھی ہوئے۔ پاکستان اور افغانستان میں خصوصاً بہت زیادہ تشدد آمیز رویہ دیکھنے میں آیا۔ لاہور اور پشاور میں ایک دن یوں بھی گزرا جب ہر طرف لاقانونیت اور لوٹ مار کا بازار گرم تھا۔ پشاور میں بے شمار دکانیں لوٹی گئیں اور ٹرانسپورٹروں نے مقابل کمپنیوں کی بیسیوں بسوں کو آگ لگا دی۔

عالم اسلام میں ریاستی سطح پر یہ ہوا کہ کئی سربراہوں نے ان کارٹونوں کی مذمت کی اور یہ اعلان کیا کہ وہ ایسے واقعات کی روک تھام کے لیے اقوام متحدہ کا دروازہ کھٹکھٹائیں گے۔ بہت سی

Marfat.com

سیاسی وغیر سیاسی تنظیموں نے اعلان کیا کہ وہ آئندہ کے لیے ڈنمارک کی مصنوعات کا بائیکاٹ کریں گے۔ سعودی عرب کے اندر اس بائیکاٹ پر عمل ہوا اور چند ہی دنوں میں ڈنمارک کی ڈیری مصنوعات کی درآمد پچیس فیصد رہ گئی۔

جب چند ہفتوں کا یہ ہیجانی دور ختم ہوگیا، تو سب کچھ اُسی طرح نارمل ہوگیا جس طرح پہلے تھا۔ جلسے جلوس ختم ہوگئے، اقوام متحدہ کا دروازہ نہیں کھٹکھٹایا گیا، ڈنمارک کی مصنوعات کا بائیکاٹ ختم ہوگیا اور اب یوں لگتا ہے جیسے مسلمان اس سانحے کو بھول گئے ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہمارا ردِعمل واقعی یوں ہی ہونا چاہیے تھا، جیسا ہوا؟ یا اس سے مختلف ہونا چاہیے تھا؟ کیا اس موقع پر ہمیں کوئی طویل المیعاد منصوبہ بندی نہیں کرنی چاہیے تھی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہمارا فوری ردِعمل ہیجانی تھا، جو درحقیقت ہمارے دشمن کے مفاد میں تھا۔ اور ہمارا طویل المیعاد کوئی ردعمل تھا ہی نہیں۔ زندہ قوموں کا یہ وطیرہ نہیں ہوتا۔ اور اس طریقے سے دنیا کے اندر کوئی معرکہ نہیں جیتا جاسکتا۔

زندہ قوموں کے شایانِ شان طرزِعمل یہ ہوتا کہ ساری دنیا کے مسلمان، سیاست اور مسلک پرستی سے بالاتر ہوکر، بالکل اتفاق کے ساتھ لاکھوں کی تعداد میں نکل کر پر امن مظاہرے کرتے، جارحانہ زبان استعمال نہ کرتے اور دنیا بھر کے امن پسند غیر مسلموں سے اپیل کرتے کہ وہ بھی اس احتجاج میں اُن کے ساتھ شریک ہوجائیں۔

دوسرا نکتہ مسلمان تنظیموں کے عمل کرنے کا تھا۔ اُن کو چاہیے تھا کہ وہ ڈنمارک کی مصنوعات کی فہرست مرتب کرکے ہر مسلمان کو پہنچاتے، تاکہ ان مصنوعات کا موثر اور مسلسل بائیکاٹ جاری رہتا۔

تیسرا نکتہ مسلمان حکمرانوں کے عمل کرنے کا تھا۔ وہ یہ کہ وہ او آئی سی کی سطح پر اس کے خلاف ایکشن لیتے اور متفقہ طور پر اس ضمن میں ایک قرارداد اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل اور جنرل اسمبلی میں پیش کرتے۔ اس موقع پر مسلمان حکمرانوں کو یہ بھی کہنا چاہیے تھا کہ جو ملک بھی اس

Marfat.com

قرارداد کے حق میں ووٹ نہیں دے گا، اُسے دوست تصور نہیں کیا جائے گا۔

اگر افراد، تنظیموں اور مسلمان حکمرانوں کی طرف سے ایسا طرز عمل ہوتا، تو یقیناً اس کا اثر ہوتا۔ لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہوا۔ ہمارے لوگ اس واقعے کو بھول گئے ہیں۔ سیاسی تنظیمیں اس سانحے کو فراموش کر کے نئے نئے ہیجانی مسائل کی تلاش میں ہیں تا کہ نعرہ بازی اور جذباتیت کے ذریعے اپنے مفادات کو حاصل کیا جا سکے۔ اور جہاں تک حکمرانوں کا تعلق ہے، انہوں نے تو یقیناً اطمینان کا سانس لیا ہوگا کہ مسلمان اس واقعے کو بھول گئے ہیں، اور یوں ان کے اوپر سے دباؤ ختم ہو گیا ہے۔

مغرب کی طرف سے دشمنی اور تضحیک پر مبنی ہر اقدام پر ہمارا ردِعمل وقتی اور ہیجانی ہوتا ہے۔ ہم بھول جاتے ہیں کہ مغرب کا اصل مقابلہ تو صرف جمہوریت، تعلیم، انصاف اور ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ حکمت پر مبنی اقدامات ہی کے ذریعے ہو سکتا ہے۔ مغرب تو یہ چاہتا ہے کہ ہمارا ہیجانی طرزِ عمل مسلسل جاری رہے۔ اسی میں مغرب کا فائدہ ہے۔ کیونکہ اس طرزِ عمل کے ذریعے ہم مقابلے کے اصل عوامل کو فراموش کر بیٹھتے ہیں۔ چنانچہ مغرب مسلسل ترقی کر رہا ہے اور ہم مسلسل پیچھے کی طرف جا رہے ہیں۔

اس راقم کا یہ تجزیہ ہے کہ مغرب کا اسلام دشمن اور مسلمان دشمن طبقہ یہ سب کچھ جان بوجھ کر رہا ہے، تا کہ مسلمانوں کے اندر فوری ردعمل کی نفسیات مسلسل پختہ ہوتی رہیں، اور یوں طویل المیعاد منصوبہ بندی کی طرف ان کا دھیان نہ جائے۔ جب ایک فرد فوری ردعمل پر مبنی ایک Drastic اقدام لے لیتا ہے، تو اس کا کلیجہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ اس نے اپنے حصے کا کام کر دیا ہے اور دشمن کو اپنا غم وغصہ دکھا دیا ہے۔ چنانچہ اس کے بعد طویل المیعاد منصوبہ بندی لی طرف اس کی توجہ نہیں جاتی۔ وہ وقت اور زمانے کو اپنے مفاد میں استعمال نہیں کرتا، بلکہ وقت کے تھپیڑوں اور حالات کی رو کے ساتھ بہتا چلا جاتا ہے۔ جب تک مسلمان اپنی اس ذہنیت کو نہیں بدلیں گے، تب تک وہ مقابل قوتوں کے حملوں کا جواب نہیں دے سکیں گے اور وقت کے دھارے کو اپنے قابو میں نہیں لا سکیں گے۔

Marfat.com

بیسواں باب

پس اب کیا کیا جائے؟

اس کتاب کے دوسرے باب میں ہمیں یہ معلوم ہوا تھا کہ ترقی کرنے اور باوقار زندگی گزارنے کے لیے قومی سطح پر چار چیزیں لازم ہیں۔ وہ ہیں، تعلیم سب کے لیے، جمہوری کلچر، انصاف، اور صبر وحکمت۔ اسی طرح اس کتاب کے چھٹے باب میں یہ تجزیہ کیا گیا تھا کہ امت مسلمہ کی نشاۃ ثانیہ کے لیے بھی یہی چار چیزیں ضروری ہیں۔ اس باب میں تعلیم کے ضمن میں خصوصی طور پر سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم پر زور دیا گیا تھا۔

اس کے بعد ساتویں باب میں یہ بتایا گیا تھا کہ درج بالا چاروں چیزیں پاکستان کے لیے بھی انتہائی ضروری ہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ پاکستان کے لیے خصوصی ایجنڈا یہ ہے کہ افغانستان اور مسئلہ کشمیر کا حقیقت پسندانہ حل تلاش کیا جائے اور اُس پر عمل درآمد بھی کیا جائے۔ خصوصی ایجنڈے کا دوسرا نکتہ یہ ہے کہ پاکستان کے سب صوبوں کو مکمل صوبائی خودمختاری دی جائے۔

پھر آٹھویں باب میں یہ بتایا گیا تھا کہ یہ ہر فرد کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ درج بالا امور کے بارے میں لوگوں کے اندر شعور وآگہی پیدا کرنے کی کوشش کرے، اور خود بھی ان پر عمل پیرا ہو۔ اس باب میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ ہر فرد یہ دیکھے کہ کیا وہ روزانہ کسی نہ کسی انسان کی کوئی مدد کر رہا ہے یا نہیں۔ کیا اُس کے ہاتھ سے کسی کو نقصان تو نہیں پہنچ رہا؟ اُسے اپنی ذاتی زندگی میں تحمل، برداشت، بے تعصبی، قانون پسندی اور عدم تشدد سے کام لینا چاہیے۔ اگر وہ یہ عزم رکھتا ہو کہ درج بالا مقاصد کے لیے وقت اور وسائل بھی صرف کرے تو اُسے اس شعور وآگہی کی کوشش کی اجتماعی جدوجہد کا دست وبازو بھی بننا چاہیے۔

Marfat.com

گویا ہمیں چاہیے کہ اپنے ہاں جمہوریت لائیں، سائنس اور ٹیکنالوجی کو حاصل کریں، انصاف ہماری قومی زندگی میں رچ بس جائے، ہم بین الاقوامی مسائل کو خالصتاً پُرامن طریقے سے حل کرنے کا تہیہ کرلیں، جذباتیت سے مکمل پرہیز کر کے اپنے وطن کی تعمیر کریں اور اجتماعی اخلاقیات کو اپنے اندر راسخ کریں۔

جب بھی مسلمانوں نے درج بالا لائحہ عمل اختیار کرلیا، انشاء اللہ پچاس برس کے اندر اندر اُن کی حالت بدل جائے گی۔ پھر دنیا کے اندر ایک نئی مساوات جنم لے گی۔ مسلمان ممالک صفِ اول میں آجائیں گے اور دنیا مجبور ہوگی کہ ہم سے ہماری جائز اور منصفانہ شرائط پر معاملہ کرے۔

Marfat.com

حصہ دوم

کتاب کے اس دوسرے حصے میں چند ایسے موضوعات پر روشنی ڈالی گئی ہے جن کا پہلے حصے میں کیے گئے تجزیے سے براہِ راست یا بالواسطہ تعلق ہے۔

Marfat.com

اکیسواں باب

اسلامی تہذیب بمقابلہ مغربی تہذیب

اس دنیا میں ہمیشہ مختلف تہذیبوں کے درمیان مشترک مفاد بھی ہوتے ہیں اوران کے درمیان اختلاف بھی ہوتا ہے۔کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ کسی دو تہذیبوں کی ساری اقدار ایک دوسرے سے مختلف ہوں۔کئی انتہائی اہم ایسی اقدار ہیں جو اس وقت تقریباً سب تہذیبوں کے درمیان، کم ازکم نظری (Theoretical) طور پر، یکساں ہیں، مثلاً انصاف، دیانت داری، اور سچائی وغیرہ۔اسی طرح ساری تہذیبیں اس بات پر متفق ہیں کہ قاتل چور، ڈاکو، مجرمانہ حملہ آور، دھوکہ دہی کا مرتکب، رشوت لینے والا، کرپشن کرنے والا، خیانت کرنے والا اوراسی طرح کے دوسرے جرائم کرنے والا انسان سزا کا مستحق ہے۔تاہم کئی اموراایسے ہیں جن کے متعلق مختلف تہذیبوں کے درمیان آپس میں اختلاف ہے۔یہی حال اسلامی اور مغربی تہذیب کا ہے۔اسلامی تہذیب کا بنیادی امتیاز یہ ہے کہ اس میں ہر انسان کی زندگی میں اللہ کی عبادت بالکل نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔جب وہ کسی سے ملتا ہے تو السلام علیکم کہتا ہے۔مکالمے کے درمیان میں مسلسل انشاء اللہ، ماشاء اللہ اور الحمدللہ کا استعمال کرتا ہے۔وہ دن میں پانچ مرتبہ نماز میں اللہ کے سامنے جھکتا ہے اور اگر وہ کسی جگہ پر غیر مسلموں کے ساتھ ہو تو اس کی نماز اور کھانے کی میز پر اس کا حلال وحرام میں تمیز اس کو فوراً دوسروں سے ممتاز کر دیتا ہے۔یہی حال ایک مسلمان کی پوری زندگی کا ہوتا ہے۔وہ رمضان کے روزے رکھتا ہے، قرآن مجید سے ایک زندہ تعلق رکھتا ہے اور وہ جانتے بوجھتے یا انجانے میں اپنی زندگی کے بہت سے امور سنت کے مطابق انجام دیتا ہے۔مثلاً اگر وہ بچہ ہے تو اس کا ختنہ ہو چکا ہوتا ہے، اگر وہ بالغ مرد وعورت ہے تو وہ اپنے بدن کی صفائی کرتا ہے، جنابت کے وقت نہاتا ہے، نماز سے پہلے وضو کرتا ہے اور رمضان کے موقعے پر تو دوسروں سے اس کا فرق وامتیاز اتنا واضح ہوتا ہے کہ اس کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

Marfat.com

کرنے میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتیں، اس لیے ان تہذیبوں سے باہر کے معاشرے بھی زیادہ متاثر نہیں ہوتے۔ لیکن عالمگیر تہذیبیں جب بھی دوسرے معاشروں کے ساتھ رابطے میں آتی ہیں تو ان کو متاثر کرتی ہیں۔ عموماً ایک فاتح تہذیب کے اندر اثر ونفوذ کا مادہ (Potential) زیادہ ہوتا ہے، تاہم یہ کوئی لازمی قانون نہیں۔ سبھی تہذیبیں ایک خاص دائرے میں ایک دوسرے کو متاثر کرتی ہیں اور ایک دوسرے سے سیکھتی ہیں۔ کوئی تہذیب خلاء میں زندہ نہیں رہ سکتی، اس لیے اس اختلاط وارتباط سے گھبرانا نہیں چاہیے۔ مثلاً اب اگر ایک طرف ہمارے ہاں مغربی کھانوں کا رواج بڑھ گیا ہے تو دوسری طرف یورپ اور امریکہ میں ہمارے کھانے بھی بہت مقبول ہو گئے ہیں۔ یہی حال زندگی کے باقی تمام معاملات کا ہے۔ اگر کسی معاشرے کی اپنی اقدار زندہ رہیں تو کوئی دوسری تہذیب باوجود کوشش کے اس پر ایک خاص حد سے زیادہ اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ ماضی قریب میں ایران اور الجزائر اس کی دو بڑی مثالیں ہیں۔ شہنشاہ کے وقت کا ایران، یوں محسوس ہوتا تھا، جیسے مغرب کے رنگ میں پوری طرح رنگا ہوا ہو۔ لیکن اسی ملک کی اکثریت نے اس کے خلاف بغاوت کر کے ایک ایسی تہذیب کی طرف رجوع کر لیا جس کی بنیاد حیا پر ہے۔ اسی طرح الجزائر کے اندر ہر ٹیلی ویژن سیٹ پر یورپ، خصوصاً فرانس کے ٹیلی ویژن سٹیشنوں کے پروگرام عام انٹینا کے ذریعے دیکھے جا سکتے ہیں۔ وہاں ایک لمبے عرصے تک ایسی حکومتیں رہی تھیں جو اپنے آپ کو سوشلسٹ کہتی تھیں۔ لیکن سبھی لوگ یہ جانتے ہیں کہ اس وقت ملک کے اندر اسلام کی جڑیں کتنی گہری ہیں۔ اس کا اظہار 1991ء کے آزادانہ انتخابات میں سامنے آچکا ہے۔

بعض اوقات یہ سوچا جاتا ہے کہ مختلف قانونی پابندیوں کے ذریعے دوسری تہذیبوں کی یلغار کو روکا جائے۔ ایسی ہر کوشش ناکامی سے دوچار ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قانونی پابندی ایک خاص حد سے زیادہ عائد نہیں کی جا سکتی۔ ہر گھر میں کمپیوٹر آنے کے بعد تو اب یہ مزید مشکل بلکہ ناممکن ہو گیا ہے۔ البتہ اس کا اصل مقابلہ مثبت طور پر کیا جا سکتا ہے۔ وہ یہ کہ اگر معاشرے میں اپنی مثبت اقدار کو دلیل اور ایمان کی قوت کے ساتھ ہر فرد کے دل و دماغ میں جاں گزیں کر دیا

Marfat.com

جائے اور علماء وصالحین مسلسل اپنے حصے کا کام کرتے رہیں تو اباحیت کی ساری رنگینیاں ماند پڑ جاتی ہیں۔اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان چیزوں کے متعلق سرے سے ہی کوئی قانون سازی نہ کی جائے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ قانون سازی پر انحصار نہ کیا جائے اور قانونی پابندیوں کو اس انتہا تک نہ لے جایا جائے جہاں قانون ہر گھر کے بیڈروم پر دستک دینے لگے، حاکموں کو ایسے اختیارات مل جائیں جن سے وہ عوام کو بے جا تنگ کریں اور لوگوں کی زندگی اجیرن ہو جائے۔

تہذیبی انتہا پسندی کا انجام

اس دنیا میں وہی تہذیب دوسرے پر غلبہ پاتی ہے جس کے پیچھے علم کی طاقت موجود ہو۔ایسا بھی ہوا ہے کہ فاتح قوم نے مفتوح قوم کی تہذیب کو قبول کرلیا۔اس کی ایک مثال منگول حکمرانوں کی ہے۔ ہلاکو خان کی سرکردگی میں منگولوں نے چین سے نکل کر بہت سے مسلمان علاقوں پر قبضہ کرلیا،لیکن بہت جلد تاریخ نے ہمیں یہ منظر دکھایا کہ فاتحین نے مفتوحوں کا مذہب اور ان کی تہذیب قبول کرلی۔

آج مغربی تہذیب کی برتری کی اصل وجہ علمی میدان میں اس کی برتری ہے۔گویا اگر کسی تہذیب کے علمبردار یہ چاہتے ہوں کہ دنیا میں ان کی تہذیب کو قبولِ عام حاصل ہو جائے، لوگ اپنے اندر کے جذبے سے ان کی تہذیبی اقدار کو مان لیں اور ان کی تہذیب کا بول بالا ہوجائے،تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو علم کے اسلحے سے مسلح کیا جائے اور دوسروں سے اس میدان میں بڑھ کر کارہائے نمایاں انجام دیے جائیں۔کوئی بھی تہذیب مصنوعی اور جبر کے طریقوں پر زندہ نہیں رہ سکتی۔اپنے آپ کو جبر وتشدد کے طریقے پر زندہ رکھنے والی تہذیبیں انتہا پسند بن جاتی ہیں۔اس انتہا پسندی کی ایک شکل یہ ہے کہ طاقت کے زور پر اپنی تہذیب کو دوسروں پر مسلط کرنے کی کوشش کی جائے۔یہ طریقہ ہمیشہ ناکام ثابت ہوا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ پروردگار نے اس دنیا کو آزمائش کی ایک جگہ بنایا ہے۔اگر یہاں طاقت کے ذریعے سے ایک تہذیب کو فیصلہ کن غلبہ مل جائے تو آزمائش کا مقصد فوت ہو جائے گا۔یہی وجہ ہے کہ اس دنیا میں ہمیشہ سے

Marfat.com

مختلف تہذیبیں پہلو بہ پہلو زندہ رہی ہیں اور قیامت تک ایسا ہی رہے گا۔

انسانی شخصیت اور جبلت اپنی بنیاد میں اعتدال پسند ہے۔ جس طرح ہر انتہا پسندی بدنی اور طبعی طور پر انسان کو نقصان پہنچاتی ہے، بالکل اسی طرح ہر نفسیاتی، روحانی، اور تہذیبی انتہا پسندی بھی انسانوں کے گروہ کو بلحاظ مجموعی نقصان پہنچاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں جہاں تہذیب کے نام پر انتہا پسندانہ رجحانات کو بزور رائج کرنے کی کوشش کی گئی ہے، ایسی ہر کوشش ناکامی سے دوچار ہوئی ہے۔ کسی تہذیب کا اصل کام دوسروں کو جسمانی طور پر مغلوب کرنا نہیں بلکہ ان کے دلوں کو مفتوح کرنا ہے۔ یہ کام صرف اعتدال اور دلیل کے ذریعے ہی کیا جا سکتا ہے۔ ہر تہذیب نے مختلف اوقات میں جبر و تشدد کے ذریعے اپنی اقدار کو دوسروں سے منوانے کی کوشش کی ہے۔ مسلمانوں کے ہاں بھی بارہا ایسی کوششیں ہوئی ہیں، لیکن ایسی ہر کوشش ناکامی سے دوچار ہوئی ہے۔ اس کی مثالیں ماضی میں بھی ملتی ہیں اور زمانہ حال میں بھی اس کی کئی مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں۔ ایسی ہر کوشش یا تو کسی بیرونی جارحیت کا شکار ہو جاتی ہے، یا پھر اس کے اندر ایک بدترین منافقت جنم لے لیتی ہیں کہ باہر سے تو سب کچھ قانون اور قاعدے کے مطابق ہو رہا ہوتا ہے لیکن اندر سے سب کچھ اس کے برعکس ہو رہا ہوتا ہے۔ اگر کسی انتہا پسندانہ تہذیب کے اندر کوئی جمہوری یا نیم جمہوری عمل جاری ہو جائے تو ایسی تہذیب اپنے اندرونی عوامل کے دباؤ کی وجہ سے خود بخود اعتدال کی طرف جھکنے لگتی ہے۔

مغربی تہذیب اور عیسائیت کے درمیان فرق

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ مغربی تہذیب اور عیسائی تہذبب درحقیقت ایک ہیں۔ یہ بات حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ مغربی تہذیب جتنی اسلام سے دور ہے، اُتنی ہی وہ عیسائیت اور یہودیت سے بھی دور ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ دنیا کے دوسرے مذاہب مثلاً ہندومت، بدھ مت اور کنفوسش ازم سے بھی وہ اُتنی ہی دور ہے۔ اسلام کی طرح عیسائیت اور یہودیت بھی خاندان کی حفاظت پر یقین رکھتے ہیں۔ یہ تینوں مذاہب قانونی شادی سے باہر

Marfat.com

جسمانی تعلق کو غلط سمجھتے ہیں۔ ان تینوں مذاہب کے مطابق حیا انسان کی بنیادی قدر ہے۔ ان تینوں مذاہب کے مطابق انسان مادر پدر آزاد نہیں ہے بلکہ وہ کچھ بنیادی اقدار میں جکڑا ہوا ہے۔ یہ تینوں مذاہب شراب، جوئے اور عورتوں اور مردوں کے بے محابا اختلاط کو غلط سمجھتے ہیں۔ اس کے بالکل برعکس مغرب کی سب سے بنیادی قدر لبرلزم یعنی آزادی ہے۔ آزادی کی اس قدر کو مغربی تہذیب اُس مقام تک لے جاتا ہے جہاں حیا یا بے حیائی، شراب نوشی یا اس سے پرہیز، جوابازی یا اس سے احتراز اور میاں بیوی پر مشتمل خاندانی نظام کا رکھنا یا نہ رکھنا کسی فرد کی ذاتی پسند و ناپسند پر مبنی اقدار بن جاتے ہیں۔ گویا مغربی تہذیب کے مطابق یہ کوئی بنیادی اقدار نہیں ہیں بلکہ یہ لبرلزم کے تابع ہیں۔ ہر فرد کو آزادی ہے کہ وہ چاہے تو انہیں اختیار کرے اور چاہے تو نہ کرے۔ سارے مذاہب میں یہ تعلیم بھی مشترک ہے کہ دوسرے مذاہب کے بزرگوں کا احترام کیا جائے اور اُن کے لیے طنز و تشنیع اور گستاخانہ الفاظ استعمال نہ کیے جائیں۔ لیکن مغربی تہذیب کے مطابق یہ بھی ایک اضافی قدر ہے۔ مغربی تہذیب کے مطابق کوئی فرد چاہے تو دوسرے مذاہب کی بزرگ شخصیتوں کا احترام کرے اور چاہے تو نہ کرے۔

جس طرح مغربی تہذیب اور عیسائیت آپس میں لازم و ملزوم نہیں ہیں، بالکل یہی حال اسلامی تہذیب اور موجودہ مسلمان ممالک میں موجود تہذیب کا ہے۔ یہاں بھی ہر جگہ کے کلچر اور رسم و رواج میں ایسی چیزیں موجود ہیں جن کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ تاہم لوگ اُن پر عمل پیرا ہیں۔ مسئلہ اس وقت گھمبیر صورت اختیار کر لیتا ہے جب مذہب اور کلچر کے درمیان میں فرق کو فراموش کر دیا جاتا ہے اور کلچر کی ہر بات کو مذہب کا حصہ سمجھنے پر یقین کر لیا جاتا ہے۔ یہی حال باقی ساری تہذیبوں اور ان کے اختیار کردہ مذاہب کا ہے۔ مثلاً مختلف ممالک کے بدھوں کا اپنا اپنا کلچر اور رسم و رواج ہے، لیکن ضروری نہیں کہ یہ سب کچھ بدھ مت کی تعلیمات کے بھی مطابق ہو۔ وہ مذہب جس میں ایک مچھر کو بھی مارنے کی اجازت نہیں، اس کے پیروکاروں نے دوسروں کے ساتھ لڑائیوں میں اور باہمی لڑائیوں میں بارہا ہزاروں بلکہ لاکھوں افراد کا خون بہایا ہے۔

Marfat.com

اس میں کوئی شک نہیں کہ کسی بھی تہذیب کی اقدار میں مذہب ہمیشہ ایک بہت بڑے عامل کی حیثیت موجود رہا ہے۔ مثلاً مغربی تہذیب میں رنگا ہوا ایک شخص بسا اوقات عیسائیت سے روحانی سکون واطمینان حاصل کرتا ہے اور اس کا مذہب اسے ایک جذبہ اور حوصلہ بخشتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ دوسری اقدار میں اپنے مذہب کی تعلیمات کے بالکل خلاف کر رہا ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ بہت ضروری ہے کہ ہر تہذیب کی امتیازی خصوصیات کو مذہب سے علیحدہ کر کے دیکھا جائے اور پھر اس کا تجزیہ کرتے وقت یہ دیکھا جائے کہ ان لوگوں کے اختیار کردہ مذہب سے اس کا اتفاق کہاں تک ہے اور اختلاف کہاں کہاں پر ہے۔

تہذیبوں کا تصادم یا بقائے باہمی

اس دنیا میں بیک وقت سینکڑوں ثقافتیں پہلو بہ پہلو زندہ رہتی ہیں۔ انہی ثقافتوں یا کلچرز کی توسیع شدہ شکل کو تہذیب کہا جاتا ہے۔ ہر تہذیب کے کچھ مرکزی نمائندے بھی ہو سکتے ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسی ایک تہذیب کے ایک سے زیادہ نمائندے بیک وقت موجود ہوں۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ بلحاظ مجموعی ایک تہذیب تو موجود ہوتی ہے اور اس کی موجودگی کو محسوس بھی کیا جا سکتا ہے، لیکن اس کی کوئی نمائندہ مرکزی حکومت نہیں ہوتی۔ دنیا کی پوری تاریخ شاہد ہے کہ سب تہذیبوں کے درمیان تصادم بھی موجود رہا ہے اور پرامن بقائے باہمی کی بنیاد پر رشتہ بھی رہا ہے۔ تاہم کوئی بھی تہذیب کسی دوسری تہذیب کو مکمل طور پر فنا کرنے میں ناکام رہی ہے۔ درحقیقت ایسا ہو بھی نہیں ہو سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تہذیب کی بنیادیں کچھ ایسے عوامل میں پیوست ہیں جن کو یک رنگ اور یک جان بنا دینا کسی کے بس میں نہیں۔ تہذیب کی ایک بڑی بنیاد مذہب ہے۔ ہم یہ تو کر سکتے ہیں کہ مختلف مذاہب کے پیروکاروں کو پرامن بقائے باہمی کی بنیاد پر اکٹھے رہنے پر قائل کر لیں، لیکن یہ ممکن نہیں کہ ساری دنیا پر ایک ہی مذہب چھا جائے اور باقی مذاہب نیست و نابود ہو جائیں۔ اسی طرح تہذیب کی ایک بڑی بنیاد تاریخ ہے۔ جب تک تاریخ کی کتاب زندہ ہے، اُس وقت تک انسانی تہذیبی اختلاف بھی زندہ رہے گا۔ یہ واضح ہے کہ تاریخ

Marfat.com

سے سبق تو حاصل کیا جا سکتا ہے مگر تاریخ کو فراموش کرنا کسی کے بس میں نہیں۔ تہذیب کے کچھ مزید اہم عوامل رنگ، نسل، زبان اور جغرافیہ ہیں۔ ان سب کو نہ تو یک جان کیا جا سکتا ہے اور نہ یہ ممکن ہے کہ صرف ایک کو زندہ رکھ کر باقی سب کو فنا کر دیا جائے۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک تہذیب کے علمبرداروں نے کسی دوسری تہذیب کے کچھ پیرووں کو ساتھ ملا کر اپنی اپنی تہذیب کے کچھ لوگوں کے خلاف عظیم جنگیں لڑی ہیں۔

تہذیبیں اور ان کے مظاہر بعض اوقات تبدیل بھی ہوتے رہتے ہیں۔ بعض اوقات وہ بہت ٹھوس شکل میں موجود ہوتے ہیں اور بعض اوقات اُن میں دوسری تہذیبوں کی کچھ اقدار کی ملاوٹ اس طرح ہو جاتی ہے کہ وہ اُن میں تحلیل ہو کر کچھ اور ہی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ اس راقم کے خیال میں یہی سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دنیا آزمائش کی جگہ ہے۔ اگر یہاں کسی ایک تہذیب کو کامل غلبہ مل جائے اور یا سب تہذیبیں پرامن بقائے باہمی کے اصول پر زندہ رہ کر آپس میں شیر و شکر ہو جائیں تو آزمائش کا مقصد فیل ہو جائے گا۔ قیامت کی نشانیاں شروع ہونے سے پہلے یہ بھی ممکن نہیں کہ دنیا کے اندر ایک ایسی عظیم نیوکلیائی جنگ شروع ہو جائے جس میں سب کچھ زیر و زبر ہو جائے، کیونکہ یہ بھی پروردگار کے فیصلے کے خلاف ایک عمل ہوگا۔ یہ بھی ممکن نہیں کہ دنیا کے اندر کسی ظالم قوت کو اتنی بڑی طاقت مل جائے کہ خیر کی قوتیں فیصلہ کن طور پر مفتوح ہو جائیں یا ختم ہو جائیں۔ اس کے بارے میں پروردگار کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ دنیا کے اندر مختلف ظالم قوتوں کو ایک دوسرے کے ذریعے دفع کرتا رہتا ہے تاکہ دنیا کے اندر خیر کا چراغ بجھنے نہ پائے۔ اس حقیقت کو قرآن مجید نے سورۃ بقرہ، آیت 251 اور سورہ حج آیت 41 میں وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔

اس بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ دنیا میں مختلف، ثقافتوں اور تہذیبوں کے درمیان میں مسلسل کشمکش بھی جاری رہے گی اور پرامن بقائے باہمی پر بھی عمل ہوگا۔ البتہ وقت کی غالب تہذیب وہی ہوگی جسے اُس وقت دنیوی علم اور صبر حکمت کے لحاظ سے فوقیت حاصل ہوگی۔

Marfat.com

بائیسواں باب

اسلامی نظام کی حقیقت کیا ہے۔

ہم میں سے ہر شخص کی خواہش اور اُس کا مطالبہ ہے کہ ملک میں اسلامی نظام نافذ کیا جائے۔ اسی لیے وطنِ عزیز میں پچھلے ساٹھ برس سے تسلسل کے ساتھ یہ نعرہ لوگوں کے دلوں کو گرما رہا ہے۔ لیکن اسلامی نظام ہے کیا چیز؟ اس کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں؟ اگرچہ اس موضوع پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ لیکن اب بھی ایک ایسی تحریر کی ضرورت ہے جو سادہ اور واضح الفاظ میں ہمیں بتائے کہ اسلامی نظام کیا چیز ہے اور مسلمان ممالک اُس سے کتنے دور ہیں۔

الحمدللہ، اس دنیا کے تقریباً سبھی مسلمان اسلام پر پختہ یقین رکھتے ہیں۔ چنانچہ جس ملک میں بھی مسلمانوں کی اکثریت ہے اور ریاست کا نظام مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے، وہ ایک مسلمان یا بالفاظ دیگر اسلامی ملک ہے۔ ایک مسلمان تین طرح کا ہوسکتا ہے، یعنی بہت اچھا مسلمان، درمیانہ مسلمان یا ایک برا مسلمان۔ بالکل اسی طرح مسلمانوں کی ریاست بھی تین طرح کی ہوسکتی ہے، یعنی بہت اچھی مسلمان ریاست، ایک درمیانی مسلمان ریاست یا ایک بری مسلمان ریاست۔

کچھ عرصہ پہلے ایک بڑے صاحب علم کی طرف سے ایک اصطلاح استعمال کی گئی تھی۔ وہ تھی ''مسلمانوں کی کافرانہ ریاست''۔ اس راقم کے نزدیک ایسی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ ایک گئی گزری مسلمان ریاست کو بری ریاست تو کہا جاسکتا ہے، مگر اسے کافرانہ ریاست نہیں کہنا چاہیے۔

ظاہر ہے کہ دنیا بھر کی سبھی ریاستیں اپنی سرحدات کی حفاظت کرتی ہیں اور اپنے ملک کے اندر امن وامان کو قائم کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ تاہم اس سے آگے بڑھ کر قرآن مجید نے ایک بہت اچھی مسلمان ریاست کے سامنے بطورِ مقصد چند مزید معیارات رکھے ہیں۔ ان معیارات پر حضورؐ نے عمل فرمایا، اور پھر صحابہ کرامؓ نے بھی ان پر عمل کیا۔ ظاہر ہے کہ یہ ہمارے لیے

Marfat.com

ایک منزل اور روشنی کے مینار کی حیثیت رکھتی ہیں۔ آج کے اس دور میں بھی ہمارے لیے وہی معیارات ہیں، تاہم یہ بات واضح ہے کہ اُن پر عمل کے سلسلے میں ہم صحابہ کرامؓ کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے، تاہم اس منزل کی طرف ہم اپنا سفر ضرور جاری رکھیں گے۔ قرآن کریم اور سنت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک معیاری مسلمان ریاست کو درج ذیل چیزوں پر عامل ہونا چاہیے۔

1۔ جمہوری طرزِ حکومت: ایک معیاری مسلمان حکومت خالص جمہوری ریاست ہوتی ہے، جہاں حکمران عوام کی رائے سے منتخب ہوتے ہیں اور عوام کی رائے ہی سے معزول ہوتے ہیں۔ جہاں آزادیٔ رائے اور آزادیٔ تحریر وتقریر ہوتی ہے۔ جہاں حکمرانوں کا احتساب روزمرہ کا معمول ہوتا ہے۔ جہاں حکمران سب سے بڑھ کر خود قانون پر عمل کرنے والے ہوتے ہیں اور جہاں حکمرانوں کا طرزِ عمل عام لوگوں کے لیے ایک بہترین ماڈل کی حیثیت رکھتا ہے۔ جہاں حکمران کے دروازے شب وروز لوگوں کے لیے کھلے رہتے ہیں اور جہاں ایک حکمران اپنا معیارِ زندگی اختیاری طور پر ایک عام انسان کی سطح تک لے آتا ہے۔

2۔ اقامت صلوٰۃ: اس کا مطلب یہ ہے کہ ریاست کے سبھی ذمہ دار لوگ نماز کا اہتمام کریں۔ جمعہ اور عیدین کا خطبہ ریاست کے ذمہ دار افراد دیں۔ اور مملکت کے اندر ایک ایسا ماحول بنایا جائے جس میں نماز کی پابندی ایک معمول بن جائے۔

حضورؐ کی سنت سے یہ امر بھی واضح ہے کہ یہ سارا کام ترغیب اور تلقین سے کیا جائے گا، اور اس کے نفاذ میں طاقت کا استعمال نہیں کیا جائے گا۔

3۔ زکوٰۃ کی ادائیگی: اس کا مطلب یہ ہے کہ حکومتی سطح پر زکوٰۃ کو جمع کرنے اور اس کی تقسیم کا پورا انتظام بنایا جائے۔ اس راقم کو اُن اہلِ علم کی رائے سے اتفاق ہے جن کے خیال میں زکوٰۃ وہ واحد ٹیکس ہے جو ایک مسلمان ریاست اپنے باشندوں سے لے سکتی ہے۔

حضورؐ کی سنت سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ زکوٰۃ کے جمع کرنے میں پہلے ترغیب اور تلقین سے کام لیا جائے گا، تاہم اس کے نفاذ میں طاقت بھی استعمال کی جا سکتی ہے۔

Marfat.com

4۔ ہر اچھی، مثبت اور مفید بات کی ترویج: ایک اچھی مسلمان ریاست مسلسل یہ کوشش کرے گی کہ اپنے ملک میں ہر اُس اچھی اور مثبت بات کو ترغیب و تلقین کے ذریعے ترویج دے جو انسانی ضمیر کے متفقہ فیصلے کے مطابق اچھی ہے اور جو تجربے سے بھی ایک مفید چیز ثابت ہو چکی ہے۔ مثلاً تجربے سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ہر بچے کی پہلی بارہ برس کی تعلیم ریاست کی طرف سے مفت اور لازم ہونی چاہیے۔ چنانچہ ایک اچھی مسلمان ریاست کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ اس پر عمل درآمد کرے۔ اسی طرح معاشرے کے اندر کمزور اور نادار افراد کو ضروریات زندگی مہیا کرنا ایک اچھی ریاست اور اچھی سوسائٹی کا فرض ہے۔ ایسی سب چیزوں کو "معروف" کہا جاتا ہے۔ ان میں سے بہت سے امور کی طرف قرآن وحدیث نے بھی توجہ دلائی گئی ہے۔

ایک اسلامی سوسائٹی کی اپنی تہذیب اور آداب ہوتے ہیں۔ یہ سارے آداب حضورؐ کی سنت کے ذریعے امت کو منتقل ہوئے ہیں، اور ان کو امت مسلمہ ہمیشہ سے جانتی اور پہچانتی ہے۔ ان میں ایک دوسرے سے ملاقات کے آداب، ذاتی صفائی کے آداب اور پیدائش سے لے کر جنازے اور تجہیز و تکفین تک کے آداب شامل ہیں۔ ان میں دو انتہائی اہم آداب حیا اور حفظِ مراتب بھی ہیں۔ مسلمان حکمرانوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ان تمام آداب پر بھرپور عمل کریں تاکہ پوری قوم ان کی پیروی کرے۔ ان تمام آداب پر بھی عمل درآمد ترغیب و تلقین کے ذریعے ہوگا۔

5۔ ہر بُری چیز کی حوصلہ شکنی: ایک اچھی مسلمان ریاست کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ہر اُس بری چیز سے معاشرے کو پاک صاف رکھنے کی کوشش کرے جس کے متعلق انسانی ضمیر کا یہ اتفاق ہے کہ یہ بری چیز ہے۔ اور تجربے سے بھی یہ بات ثابت ہو چکی ہو۔ قرآن وحدیث نے بھی ایسی بہت سی چیزوں کی طرف توجہ دلائی ہے، مثلاً رشوت، بدعنوانی، ملاوٹ، بددیانتی وغیرہ۔ موجودہ زمانے میں ایسی مزید بہت سی چیزیں اس فہرست میں شامل ہوگئی ہیں جن کی طرف پہلے لوگوں کی توجہ نہیں گئی تھی مثلاً ہوا اور پانی کی آلودگی یا مختلف بیماریوں کے پھیلاؤ کے طریقے۔ چنانچہ ان چیزوں کی روک تھام ہونی چاہیے۔ ایسی سب بُری چیزوں کو "منکر" کہا جاتا ہے۔ اگرچہ منکر کو

Marfat.com

روکنے کے لیے بھی پہلے ترغیب وتلقین ہی کا ذریعہ استعمال ہوگا، تاہم اس ضمن میں ریاست طاقت بھی استعمال کرسکتی ہے۔

6۔ انصاف اور جرائم کی سزائیں: ایک مسلمان ریاست کی بہت بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ ملک میں انصاف کا ایک ہمہ گیر نظام نافذ کرے جس میں مظلوموں کو انصاف ملے اور ظالموں کو سزا ملے۔

اصل جرائم کسی انسان کے جان، مال اور آبرو کے خلاف جرائم ہیں۔ جرائم کی اس فہرست میں وہ سب جرائم شامل ہیں جن کو سارے انسانی معاشرے جرم سمجھتے ہیں۔ البتہ چار جرائم ایسے ہیں جن کو بعض انسانی معاشرے جرم نہیں سمجھتے، لیکن اسلام کے نزدیک وہ بھی جرائم ہیں۔ وہ ہیں زنا اور اس کے متعلقات، شراب نوشی، جوا، اور سود۔

قتل، کسی پر حملہ، ڈاکہ اور چوری وغیرہ سارے انسانی معاشروں کے مطابق جرائم ہیں۔ اسلام بھی ان سب کو جرائم قرار دیتا ہے۔ تاہم اسلام نے ان میں سے بعض جرائم کی سزائیں بھی بیان کردی ہیں۔ یہ سزائیں اُس وقت نافذ کی جاتی ہیں جب سوسائٹی کے اندر اُن جرائم کی طرف جانے والے راستوں کا سدباب کیا جاچکا ہو، عوام کی اخلاقی تربیت معیاری سطح تک کی جاچکی ہو اور مجرم سے جرم اپنی آخری انتہا میں سرزد ہوچکا ہو۔ یہ سزائیں غیرمسلموں کے لیے نہیں ہیں۔ غیرمسلم مجرموں کے لیے غیرمسلم عوام سے مشورے کے مطابق قانون سازی کی جاسکتی ہے۔

درج بالا تفصیل سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اسلام ہمیں حکومت وریاست کے متعلق کچھ اصول تو ضرور دیتا ہے، مگر اُن معنوں میں ایک پورا نظام نہیں دیتا جن معنوں میں آج کل نظام کا لفظ بولا جاتا ہے ریاست وحکومت کے متعلق اسلام کی یہی ہدایات ہیں۔ ہمارے حکمران ان میں سے کچھ چیزوں پر کسی حد تک عمل پیرا ہیں اور کچھ چیزوں پر کوئی عمل نہیں ہورہا۔ بلکہ ایک عجیب سی بات تو یہ ہے کہ ان میں سے چند نکات پر عمل درآمد میں باقی دنیا ہم سے

Marfat.com

آگے بڑھ گئی ہے۔

بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارے قول وفعل میں بہت زیادہ تضاد آگیا ہے۔ فی الوقت مسلمان ممالک میں سب سے بہتر آئین افغانستان اور پاکستان کے ہیں۔ قانون کی کتاب کی حد تک پاکستان میں حدود بھی نافذ ہیں، لیکن عملاً جو صورت حال ہے وہ ہم سب جانتے ہیں۔

موجودہ مسلمان ممالک میں اسلامی نظام کا پہلا قدم جمہوریت ہے۔ اس کے بعد عمومی انصاف، معروف کی ترویج، منکر کا استیصال اور کچھ جرائم کی خصوصی سزاؤں کا نفاذ ہے۔ اگر ایک دفعہ کسی مسلمان ملک میں حقیقی جمہوری کلچر وجود میں آجائے تو وہاں کے مسلمانوں کا اجتماعی ضمیر خود بخود ایک دباؤ میں ڈھل کر حکمرانوں کو باقی اقدامات پر مجبور کر دے گا۔

Marfat.com

تیئسواں باب

جمہوری کلچر کیا ہے۔

پاکستان میں عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ محض انتخابات ہونے اور اس کے نتیجے میں ایک نمائندہ حکومت کے قیام کو جمہوریت کہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب ایک ایسی حکومت غلط کام کرتی ہے، تو کہا جاتا ہے کہ جمہوریت تو بالکل بے کار چیز ہے اور ہمارے ماحول کے لیے فٹ نہیں ہے۔ اسی لیے پاکستان کے اندر ایک بڑا طبقہ یہ سمجھتا ہے کہ ہمیں ایک دیانت دار اور مخلص ڈکٹیٹر کی ضرورت ہے۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جمہوری کلچر، انتخابات سے کہیں آگے ایک منزل کا نام ہے۔ جمہوری کلچر میں بروقت انتخابات ہوتے ہیں۔ اُس کے نتیجے میں ایک نمائندہ حکومت وجود میں آتی ہے۔ اس حکومت کے تحت سب کچھ پارلیمنٹ سے پوچھ کر ہوتا ہے۔ قانون سازی کے بغیر کوئی اقدام نہیں اٹھایا جاتا۔ عدلیہ اور صحافت مکمل طور پر آزاد ہوتی ہے۔ کسی کو اپنی بات کہنے سے نہیں روکا جاتا۔ مملکت کا ہر ادارہ مثلاً پولیس سیاسی اثر سے آزاد ہوتا ہے۔ احتساب کا ایسا غیر جانبدارانہ نظام قائم ہوتا ہے، جس کے تحت ہر وقت اور ہر لمحے اقتدار پر فائز لوگوں کے ہر کام کی نگرانی کی جاتی ہے۔ ارباب اقتدار سب سے بڑھ کر خود قانون کی پابندی کرتے ہیں، اور اپنے فرائض منصبی کی بجا آوری کے علاوہ ان کو کوئی اضافی مراعات حاصل نہیں ہوتیں۔ اگر وہ محسوس کریں کہ رائے عامہ ان کے خلاف ہو چکی ہے، تو نئے انتخابات کا اعلان کرتے ہیں اور کسی بھی مخالفانہ نتیجے کو قبول کرنے میں پس و پیش سے کام نہیں لیتے۔

جن قوموں میں جمہوری کلچر موجود ہوتا ہے تو دن بدن ترقی کرتی چلی جاتی ہیں۔ دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ترقی یافتہ قومیں اپنی عقل و دانش کے نتیجے میں یہ جان لیتی ہیں کہ ان کے لیے صحیح طرز حکومت، صرف جمہوریت ہے۔ چنانچہ فی الوقت، سوائے چین کے، سارے

Marfat.com

ترقی یافتہ ممالک میں جمہوری کلچر موجود ہے۔ یہ بات جان لینی چاہیے کہ چین، عوام کے معیار زندگی کے اعتبار سے ترقی یافتہ نہیں ہے۔ اس کے برعکس وہ اوسط سے کچھ کم آمدنی رکھنے والے ممالک میں شمار ہوتا ہے۔ اگرچہ چین ترقی کے راستے پر گامزن ہے، مگر کچھ مدت بعد اس کو دو راستوں میں سے ایک راستہ منتخب کرنا ہوگا۔ یا تو وہ جمہوری کلچر کی طرف بڑھے گا جس کے نتیجے میں وہ مزید ترقی کر سکے گا۔ اور یا وہ موجودہ طرزِ حکومت ہی کو ترجیح دے گا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کی ترقی رک جائے گی۔

کہا جاتا ہے کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد دو جمہوری ممالک کے درمیان کبھی لڑائی نہیں ہوئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جمہوری کلچر مکالمے کو فروغ دیتا ہے۔ مکالمے اور بات چیت کے نتیجے میں افہام و تفہیم پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ دونوں ممالک کسی متنازعہ ایشو کے بارے میں سمجھوتے تک پہنچ جاتے ہیں۔ اور اگر سمجھوتے تک نہیں پہنچتے، تو کم از کم یہ تو ہوتا ہے کہ لڑائی کے برعکس گفتگو یا مذاکرات جاری رکھنے پر اتفاق کر لیتے ہیں۔

جمہوریت کیوں ضروری ہے، اس کی تین بنیادی وجوہات ہیں۔ ایک یہ کہ جس معاملے کا تعلق پوری قوم سے ہو، اس میں کسی ایک شخص کا اپنی رائے سے فیصلہ کرنا اور دوسروں کو نظر انداز کرنا غلط ہے۔ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ ایک معاملہ جن لوگوں کے مفاد سے تعلق رکھتا ہو، اس میں اُن کی یا اُن کے نمائندوں کی رائے لی جائے۔ مشترک معاملات میں کسی کو اپنی من مانی کرنے کا حق نہیں ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ جب ایک انسان اجتماعی معاملے میں اپنی رائے سے فیصلہ کرتا ہے، تو یا تو وہ متکبر ہوتا ہے اور اپنے آپ کو بڑی چیز اور دوسروں کو حقیر سمجھتا ہے۔ اور یا پھر وہ اپنی ذاتی اغراض کے لیے دوسروں کا حق مارنا چاہتا ہے۔ تکبر، خود پسندی اور دوسروں کا حق مارنا اجتماعی انسانی ضمیر کے خلاف ہے اور ان کو ہمیشہ بہت بڑی خامیاں سمجھا گیا ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ جن معاملات کا تعلق اجتماعی حقوق اور مفادات سے ہو، ان میں

Marfat.com

فیصلہ کرنا ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ کوئی بھی انسان اس بھاری بوجھ کو تنہا اپنے سر لینے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ ہر انسان جانتا ہے کہ وہ عقلِ کُل نہیں ہے۔ چنانچہ یہ ضروری ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو شریک مشورہ کیا جائے تاکہ مبنی بر انصاف فیصلہ کیا جاسکے، اور اگر کوئی غلطی ہو بھی جائے تو تنہا کسی ایک ہی شخص پر اُس کی ذمہ داری نہ آئے۔

جمہوری کلچر اپنے وجود سے ہی یہ تقاضا کرتا ہے کہ اجتماعی معاملات جن لوگوں کے حقوق اور مفادات سے تعلق رکھتے ہیں، انہیں اظہار رائے کی پوری آزادی حاصل ہو۔ وہ اس بات سے مستقلاً باخبر ہوں کہ ان کے معاملات حقیقت میں کس طرح چلائے جارہے ہیں۔ انہیں اس بات کا بھی پورا حق حاصل ہو کہ اگر وہ اپنے معاملات کی بجا آوری میں کوئی غلطی دیکھیں تو اس پر باز پرس کرسکیں۔ لوگوں کی زبانیں بند کرکے اور ان کو بے خبر رکھ کر اجتماعی معاملات چلانا خیانت اور بددیانتی ہے۔

جمہوری کلچر کا یہ بھی تقاضا ہے کہ جس شخص کو بھی ذمہ داری کے منصب پر فائز کرنا ہو، اسے لوگوں کی آزادانہ رضامندی سے مقرر کیا جائے۔ اگر یہ رضامندی جبر، لالچ، دھوکے، فریب اور مکاری سے لی گئی ہو تو یہ کوئی رضامندی نہیں بلکہ بددیانتی ہے۔

جمہوری کلچر کا یہ بھی تقاضا ہے کہ ریاست کا سربراہ صرف وہی لوگ اپنے وزیر اور مشیر مقرر کرے جن کو بذاتِ خود بھی قوم کا اعتماد حاصل ہو۔

جمہوری کلچر کا یہ بھی تقاضا ہے کہ ووٹر اپنے علم اور ایمان وضمیر کے مطابق ووٹ دیں۔ اگر وہ کسی لالچ، خوف یا محض سیاسی گروہ بندی کی بنیاد پر اپنے علم اور ضمیر کے خلاف رائے دیں تو یہ درحقیقت خیانت ہے۔

جمہوری کلچر کا یہ بھی تقاضا ہے کہ ملک کے اندر جس بات کو پارلیمنٹ کی اکثریت کی تائید حاصل ہو، اسے تسلیم کیا جائے۔ اسی طرح ایک سیاسی گروہ کے اندر بھی کسی فردِ واحد کو من مانی کا اختیار نہیں ہونا چاہیے، بلکہ ہر فیصلے کو اکثریت کی تائید حاصل ہونی چاہیے۔ ملک ہو یا کوئی گروہ،

Marfat.com

اگر کسی ایک شخص کو من مانی کا اختیار دیا جائے تو پھر جمہوریت کے کوئی معنی ہی نہیں رہتے۔

مسلمان ملکوں کے اندر عموماً یہ بات کہی جاتی ہے کہ ہمیں مادر پدر آزاد جمہوریت نہیں چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ جمہوریت کبھی بھی مادر پدر آزاد نہیں ہوتی۔ جمہوریت تو لوگوں کی اجتماعی سوچ کی عکاس ہوتی ہے۔ عام لوگ جس طرح سوچتے ہیں، اور ان کے جو بھی عقائد اور خیالات ہوتے ہیں، وہ جمہوریت کے ذریعے امورِ مملکت میں ظاہر ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ یہ بات بالکل واضح ہے کہ ایک مسلمان ملک میں، جہاں کے باشندے باشعور ہوں اور اپنے دین سے محبت کرتے ہوں، پارلیمنٹ کی قانون سازی کے وقت یہ سب شعور و آگہی ایک عکس کی صورت میں سامنے آئے گا۔ آخر پارلیمنٹ کے ممبران مسلمان ہی ہوں گے، اور انہیں مسلمانوں نے ہی منتخب کیا ہوگا۔ گویا اصل مسئلہ یہ نہیں کہ جمہوریت پر قانونی اور آئینی قدغنیں لگادی جائیں، بلکہ اصل ایشو یہ ہے کہ عوام کو باشعور بنایا جائے۔ علماء اور دانش وروں کا اصل کام یہی ہے کہ وہ پارٹی پالیٹکس سے بالاتر رہتے ہوئے عوام کے اندر شعور بیدار کریں اور سیاسی پارٹیوں کے لیے خیر خواہ ناقد اور محتسب کا کردار ادا کریں۔ پھر سیاسی پارٹیوں کے ذریعے قوم کا اجتماعی شعور اقتدار میں منعکس ہو جاتا ہے۔

ایک مسلمان ملک کے اندر اسلام کی تعبیر کے اختلاف میں بھی پارلیمنٹ کی رائے ہی حال کے اعتبار سے موثر ہوتی ہے۔ اس کا قطعاً یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ تعبیر لازماً صحیح بھی ہوگی۔ نہیں، بلکہ وہ تعبیر غلط بھی ہو سکتی ہے۔ تاہم اس غلط تعبیر کو صحیح کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ عوام کو مزید ایجوکیٹ کیا جائے۔ اس کے نتیجے میں ایک وقت آسکتا ہے جب پارلیمنٹ پہلے قانون کے برعکس نئی قانون سازی کرلے۔

کیا جمہوری کلچر کا یہ مطلب ہے کہ حکمرانوں سے کوئی غلطی ہوگی ہی نہیں؟ یقیناً ایک جمہوری ملک کے اندر حکمرانوں میں غلطیاں، خامیاں اور کمزوریاں ہوتی ہیں۔ وہ خلافِ قانون کاموں میں بھی ملوث ہو سکتے ہیں۔ وہ انتہائی غلط فیصلے بھی کر سکتے ہیں۔ لیکن جمہوریت کی خوبی یہ

Marfat.com

ہے کہ کچھ عرصے بعد ان غلط فیصلوں سے رجوع بھی کر لیا جاتا ہے، ان پر نظر ثانی بھی کر لی جاتی ہے اور یہ اعتراف بھی کر لیا جاتا ہے کہ ہم سے غلطی ہوئی تھی۔

اگر جمہوری کلچر کے اعتبار سے پاکستانی معاشرے کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے بالادست طبقات اور ہماری سیاسی پارٹیوں کے ذہن ابھی اس کلچر سے بہت دور ہیں۔

ہمارے بالادست طبقات کے اندر تکبر، دکھاوا، اختیارات کو اپنی ذات میں مرتکز کرنے کا رجحان، مال و دولت اور عہدے کی نمائش اور شاہی مزاج پر مبنی جاگیردارانہ ذہنیت اپنی انتہائی حدوں میں موجود ہے۔ تقریباً سبھی سیاسی پارٹیوں میں لیڈرشپ ایک میراث بن چکی ہے۔ خوشامد کو پسند کیا جاتا ہے اور خوشامد کے کلچر کے ذریعے لوگ آگے بڑھتے ہیں۔ ہر پارٹی کے اندر لابینگ (lobbying)، سازشوں اور دھڑے بندیوں کی بنیاد پر سیاست ہوتی ہے۔ نظریاتی، فکری اور ملکی ایشوز کی بنیاد پر سیاست بہت کم ہے۔

لیکن کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ پاکستان میں جمہوری کلچر نہیں چل سکتا اور یہ زمین جمہوریت کے بیج کے لیے غیر موزوں ہے؟ یوں نہیں ہے۔ درحقیقت جمہوری کلچر ہی ملکی مسائل کے حل کی طرف پہلا قدم ہے۔ اگر ہمارے ہاں جمہوری کلچر کا خیال نہیں رکھا جاتا تو اس کا حل یہ ہے کہ اس ملک کو جمہوری عمل کے دوا کی مزید خوراکیں پلائی جائیں۔ گویا جمہوریت کی خامیوں پر قابو پانے کا علاج یہ ہے کہ سوسائٹی میں مزید جمہوریت لائی جائے۔ جمہوریت کی طرف مسلسل پیش قدمی ہی ترقی کا پہلا زینہ ہے۔ اس کے بغیر اور کوئی راستہ نہیں۔

Marfat.com

چوبیسواں باب

مذہبی اور دُنیاوی نظام تعلیم کی بحث

جمہوری کلچر کے بعد کسی بھی ملک کے حال، مستقبل اور ترقی کا دارومدار تعلیم پر ہے۔ ہمارے لیے دنیوی تعلیم ضروری ہے، اس لیے کہ اسی کے ذریعے ہم دوسری اقوام کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اسی طرح ہمارے لیے مذہبی تعلیم بھی ضروری ہے، اس لیے کہ یہ ہماری سوچ اور تہذیب کا مرکز ومحور ہے۔ قرآن مجید میں علم اور تعلیم کے الفاظ چار سو پچیس سے زیادہ مرتبہ آئے ہیں۔ چند ہی ایسے الفاظ ہوں گے جو اس سے زیادہ تعداد میں آئے ہوں گے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا دین تعلیم پر کتنا زیادہ زور دیتا ہے۔

اس وقت ترقی یافتہ صنعتی جمہوری ممالک میں تعلیم کی شرح سو فیصد ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سو فیصد لوگوں نے کم ازکم پہلے بارہ برس کی تعلیم حاصل کی ہے۔ اس کے مقابلے میں مسلمان ممالک میں تعلیم کی شرح بلحاظ مجموعی چالیس فیصد سے بھی کم ہے۔ پاکستان کے اندر بھی یہ شرح افسوس ناک حد تک کم ہے۔ واضح رہے کہ یہ جو چالیس فیصد کی شرح بتائی جاتی ہے، اس کا معیار یہ نہیں ہے کہ بارہ برس کی تعلیم مکمل کی گئی ہے، بلکہ اس کا معیار یہ ہے کہ جو انسان بھی دستخط کر سکتا ہے اور اردو کے دو چار الفاظ پڑھ سکتا ہے، اسے تعلیم یافتہ مان لیا جاتا ہے۔ اگر ترقی یافتہ ممالک کے معیار کو سامنے رکھا جائے تو پاکستان کے اندر تعلیم کی شرح دس فیصد سے زیادہ نہیں بنتی۔ اس صورت حال میں بھلا یہ کیسے تصور کیا جا سکتا ہے کہ ہم ترقی یافتہ ممالک کا مقابلہ کر سکیں گے۔

مغربی ممالک اور مسلمان ممالک کے درمیان تعلیم کا یہ فرق 1440ء سے شروع ہوا جب جرمنی میں گٹن برگ نے چھاپہ خانہ ایجاد کیا۔ اس ایجاد کے ساتھ ہی یورپ میں لاکھوں کی تعداد میں کتابیں شائع ہونے لگیں اور اگلی دو تین صدیوں میں اسی فیصد سے زیادہ لوگ خواندہ

Marfat.com

ہو گئے۔ یہ چھاپہ خانہ ساڑھے تین سو برس کے بعد کہیں جا کر مسلمان دنیا میں اس وقت پہنچا جب 1780ء میں ترکی میں پہلا پریس لگا۔ تاہم اُس وقت بھی پریس کو ایک شیطانی آلہ سمجھا جاتا تھا اور ترکی کے شیخ الاسلام نے یہ پابندی لگائی کہ پریس میں مذہبی کتابیں نہیں چھاپی جائیں گی۔

برصغیر ہندوپاک میں کسی مسلم حکمران نے تعلیم کو اپنی ترجیح نہیں بنایا۔ کچھ علماء نے اپنے بل بوتے پر مدارس قائم کیے، مگر ان کی تعداد اتنی کم تھی کہ اُن میں سے کسی کا ذکر نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ مغل حکمرانوں کے دور میں محلات، مقبروں، یادگاروں، قلعوں اور باغات کی طرف تو بہت توجہ دی گئی اور یہ سب کارنامے تاریخی ریکارڈ میں محفوظ بھی ہیں، لیکن اس پورے دور میں کسی ایک تعلیمی ادارے کا نام بھی پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اُس زمانے کی تمام تر تعلیم افراد کی مرہونِ منت تھی۔ اُس کا طریقہ یہ تھا کہ ایک عالم نجی طور پر کچھ شاگردوں کو پڑھاتا تھا اور پھر یہی شاگرد دوسرے لوگوں کو پڑھاتے تھے۔ اس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اُس زمانے میں تعلیم کی عمومی شرح کیا ہوتی ہوگی۔ اس پورے زمانے میں صرف اورنگزیب عالمگیر کے وقت میں لکھنو میں ''فرنگی محل'' نامی ایک مدرسے کا تذکرہ ملتا ہے جس کے ساتھ اورنگزیب نے اپنے عہدِ اقتدار کے اکتالیسویں برس میں کچھ مدد کی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب یورپ میں سکول، کالج اور یونیورسٹیاں ہزاروں کی تعداد میں بن رہی تھیں اور لاکھوں طلبہ اُس میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ اسی تعلیم کی بدولت یورپ کو اُس زمانے میں پوری دنیا پر غلبہ ملا۔

مغلوں کے زمانے میں برصغیر کے اندر ساری تعلیم پرائیویٹ تھی اور عام طور پر فارسی میں دی جاتی تھی۔ جب انگریز یہاں آئے تو ان کے لیے یہ ترجیح بن گئی کہ انگریزی کو بذریعہ تعلیم بنا دیا جائے، کیونکہ فارسی ان کی کچھ کام کی نہ تھی۔ اس وقت مسلمانوں کے ہاں دو متوازی رویوں نے جنم دیا۔ ایک روئیے کے بانی سرسید احمد خان تھے جنھوں نے یہ سوچا کہ مسلمانوں کے لیے انگریزی تعلیم حاصل کرنا نہایت ضروری ہے۔ دوسرے روئیے کے بانی مولانا محمد قاسم نانوتوی تھے جنھوں نے یہ سوچا کہ مسلمانوں کے دین وایمان کو بچانے کے لیے مذہبی تعلیم انتہائی ضروری

Marfat.com

ہے۔ چنانچہ 1857ء میں جنگ آزادی کی ناکامی کے تقریباً بیس برس بعد ان دونوں بزرگوں نے اپنے اپنے خیال کو عملی جامہ پہنایا۔ سرسید نے علی گڑھ میں کالج قائم کیا اور مولانا محمد قاسم نے دیوبند میں دارالعلوم قائم کیا۔ ان دونوں اداروں کی دیکھا دیکھی مزید بہت سے ادارے وجود میں آ گئے۔ آج کے سارے عام تعلیمی ادارے دراصل سرسید ہی کے نقش قدم کی پیروی میں بنائے گئے ہیں۔ اسی طرح آج پاکستان میں موجود اٹھارہ ہزار کے لگ بھگ دینی ادارے دیوبند تحریک ہی کے زیر اثر وجود میں آئے ہیں۔ چنانچہ ہمارے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم تعلیم کے ان دونوں نظاموں کا تنقیدی جائزہ لیں اور یہ دیکھیں کہ ان دونوں کے مثبت اور منفی نکات کیا ہیں۔

پاکستان کے اندر موجود تعلیمی ادارے تین واضح گروپوں میں تقسیم ہیں۔ پہلے گروپ میں سرکاری انتظام کے تحت چلنے والے سکول اور کالج شامل ہیں جن میں ذریعہ تعلیم اردو ہے۔ دوسرے گروپ میں کم فیسوں والے پرائیویٹ تعلیمی ادارے ہیں جہاں ذریعہ تعلیم انگریزی ہے لیکن اساتذہ کی قابلیت محض واجبی ہے۔ تیسرے گروپ میں زیادہ فیسوں والے تعلیمی ادارے آ جاتے ہیں جہاں ذریعہ تعلیم انگریزی ہے اور جہاں پڑھائی کا معیار اچھا ہے۔ یہ تینوں گروپ پاکستان کی سوسائٹی کو تین معاشرتی اور کلچرل رویوں میں تقسیم کر رہے ہیں۔ یہ تقسیم تقریباً ہر جگہ دیکھی جا سکتی ہے۔ یہ تقسیم طبقاتی بنیادوں پر بھی اور تہذیبی بنیادوں پر بھی ہے۔ کسی بھی قوم کے یک جان اور یک رنگ ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کا ایک ہی نظام تعلیم ہو، لیکن ہمارے ہاں ایسا نہیں ہے چنانچہ یہ خلیج روز بروز گہری ہوتی چلی جا رہی ہے اور بسا اوقات یہ ایک طرف احساس محرومی اور نفرت میں ڈھل جاتی ہے اور دوسری طرف اس کا ظہور احساس برتری اور غرور کی شکل نکلتا ہے۔ اس نظام تعلیم کی دوسری خامی یہ ہے کہ اس میں سارا زور رٹے پر دیا جاتا ہے اور طالب علم کی صلاحیتوں کو بیدار کرنے کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ اس سے طلبہ کی تخلیقی صلاحتیں دب کر رہ جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں شاذ و نادر ہی کوئی اعلیٰ پائے کا سائنس دان وجود میں آیا ہے۔ اس نظام تعلیم کی تیسری خامی یہ ہے کہ اس میں ایک طالب علم کی بحیثیت مسلمان دینی

Marfat.com

ضروریات کی فراہمی کا انتظام انتہائی ناقص ہے۔ پہلی جماعت سے لے کر بارہویں جماعت تک گھسے پٹے انداز میں اسلامیات کا مضمون اس طریقے سے پڑھایا جاتا ہے کہ بس ایک رسم پوری ہو جائے۔ اس سے ایک طالب علم کو نہ تو قرآن وسنت سے صحیح واقفیت حاصل ہوتی ہے اور نہ اس کو ان سوالات کا جواب ملتا ہے جو اس کے گردوپیش میں ہر طرف پھیلے ہوئے ہوتے ہیں۔ درج بالا تینوں خامیوں کی وجہ سے ہمارا دنیوی نظام تعلیم طلبہ اور طالبات کو اعلیٰ پائے کے انسان اور مسلمان نہیں بنا سکا۔

یہی حال ہمارے مذہبی نظام تعلیم کا ہے۔ اس کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ یہ نظام فرقہ بندی اور مسلکی بنیاد پر قائم ہے۔ دیوبندی، بریلوی۔ اہل حدیث، جماعت اسلامی اور اہل تشیع کے سارے ادارے خالصتاً مسلکی بنیادوں پر قائم ہیں۔ ان میں سے ہر مسلک کے علیحدہ امتیازی نشانات، لباس، نماز پڑھنے کا طریقہ اور معاشرتی روئے ہیں۔ کسی بھی دینی طالب علم یا اساتذہ کے لباس کو دیکھ کر با آسانی یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس کا تعلق کس فرقے سے ہے۔ ہر ادارے کے اندر سارے اساتذہ کا تعلق اسی خاص مسلک سے ہوتا ہے۔ چنانچہ جب ایک طالب علم آٹھ برس کسی ایک دینی درس گاہ میں گزار دیتا ہے تو مسلک پرستی پر مبنی سوچ اور روئے اس کے ذہن میں پوری طرح راسخ ہو چکے ہوتے ہیں۔ پھر وہ اپنے مسلک والوں کو ایک عینک سے دیکھتا ہے اور دوسرے مسالک کو کسی اور عینک سے دیکھتا ہے۔ گویا یہ مدارس ہمارے ملک کے دینی طلبہ کو پانچ ناقابل عبور حصوں میں تقسیم کر رہے ہیں۔ ان مدارس کی دوسری خامی یہ ہے کہ ان میں داخل ہونے والے طالب علموں کو عام طور پر اپنے پورے ماحول سے کاٹ دیا جاتا ہے۔ کئی مدارس میں بچوں کو بالکل ابتدائی عمر سے ہی لے لیا جاتا ہے۔ ایسے اداروں میں عام دنیوی تعلیم یا تو سرے سے دی ہی نہیں جاتی۔ اور اگر دی بھی جاتی ہے تو طالب علم کو اپنے پورے ماحول میں کاٹ دیا جاتا ہے۔ بعض اداروں میں آٹھویں جماعت یا میٹرک تک تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کو لے لیا جاتا ہے، چونکہ وہاں بھی ان کو اپنے ماحول سے مکمل طور پر کاٹ دیا جاتا ہے، اس لیے یہ لوگ سوسائٹی

Marfat.com

کے اندر ایک بالکل علیحدہ طبقہ بن جاتے ہیں۔اس نظام تعلیم کی تیسری خامی یہ ہے کہ اس میں حقیقی دینی تعلیم بہت کم دی جاتی ہے۔آٹھ برس کے پورے دور میں قرآن مجید کی تعلیم کو پانچ فیصد وقت بھی نہیں دیا جاتا۔اس وقت مدارس میں قرآن مجید کی دینی تفاسیر میں صرف ایک تفسیر ''جلالین'' پڑھائی جاتی ہے جو انتہائی مختصر تفسیر ہے۔اس کے تفسیری فقرے خود قرآن کریم کے فقروں سے بھی کم ہیں۔اس کے علاوہ بعض اداروں میں بیضاوی کا پارہ اول کا بھی پڑھا دیا جاتا ہے۔حالانکہ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ دینی مدرسے کی ابتدا بھی قرآن مجید ہی پر ہوتی۔اس کے سارے نصاب کو قرآن مجید کے گرد گھومنا چاہیے تھا۔کسی دینی مدرسے میں آٹھ برس تعلیم حاصل کرنے والے طالب علم کو قرآن مجید کے چند فقہی احکام کی تفصیل کے علاوہ مزید کسی مضمون سے کوئی آگہی نہیں ہوتی۔نہ اُسے تقابلِ ادیان پڑھایا جاتا ہے، نہ اسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کا فکر وفلسفہ کیا ہے، اسلامی دعوت کیا ہے، اس دعوت کے پھیلانے کے اصول کیا ہیں۔اسی طرح اس میں غیر مسلموں سے تعلق اور قتال وغیرہ کے قوانین بھی کبھی زیر بحث نہیں آتے۔قرآن مجید کے بعد سب سے زیادہ اہمیت حدیث کو ملنی چاہیے، تاکہ طالب علم میں یہ صلاحیت بیدار ہو جائے کہ وہ حدیث کے سارے ذخیرے کو قرآن کی روشنی میں تحقیقی نظر کے ساتھ دیکھ سکے۔لیکن اس کے برعکس دینی مدارس میں صرف ان احادیث پر زیادہ وقت صرف کیا جاتا ہے جن کا تعلق اختلافات سے ہوتا ہے اور اس ساری بحث میں مقصد یہی ہوتا ہے کہ اپنے مسلک کو برحق ثابت کیا جائے۔ظاہر ہے کہ اس طرح حدیث کی تعلیم قطعاً تسلی بخش نہیں ہوسکتی۔دینی اداروں کے طلبہ کا آدھے سے زیادہ وقت ان مضامین کے مطالعے میں صرف ہوتا ہے جن کا دین سے کوئی کوئی براہ راست تعلق نہیں ہے اور جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں وہ بھی آج سے کئی سو برس پہلے کی تحریر کردہ ہیں، جن میں دی گئی مثالوں کا آج کے دور سے کوئی تعلق ہی نہیں بنتا۔مثلاً فقہ کی اکثر کتابوں میں ہر دوسری مثال غلاموں اور لونڈیوں سے متعلق ہے، کیونکہ یہ کتابیں ایسے دور میں لکھی گئی تھی جس دور میں سب سے بڑی تجارت غلاموں اور لونڈیوں کی ہوتی تھی۔درج بالا تین بڑی خامیوں کی وجہ سے پاکستان کے

Marfat.com

مذہبی اداروں کو درحقیقت مسلکی ادارے کہنا چاہیے جن کا سارا زور دراصل اپنے مسلک کو برحق ثابت کرنے پر ہوتا ہے۔

گویا پاکستان کے اندر تعلیم کے ضمن میں دو بڑی تقسیمیں تو ایسی ہیں جو سوسائٹی کے اندر ناقابل عبور فاصلے پیدا کر رہی ہیں اور سوسائٹی کو Water tight Compartents میں تقسیم کر رہی ہیں۔ اور اگر ساری تقسیموں کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ پاکستانی سوسائٹی اپنے نظام ہائے تعلیم کی وجہ سے کم از کم آٹھ طبقات میں تقسیم ہو رہی ہے۔ ایسے طبقات جن کے ہاں ایک دوسرے کے لیے محبت و اتفاق کم ہے اور نفرت و تفریق زیادہ۔ اس نظام تعلیم کی وجہ سے نہ تو ہم ترقی یافتہ دنیا کے ہم پلہ بن سکتے ہیں اور نہ ہم اچھے انسان اور اچھے مسلمان بن سکتے ہیں۔ چنانچہ یہ ضروری ہے کہ پاکستان کے اندر ایک ہی نظام تعلیم ہو جو طلبہ و طالبات کی صلاحیت کو بیدار کرے اور ان کو اپنے اپنے شعبوں میں مہارت حاصل ہونے کے علاوہ وہ اچھے انسان اور مسلمان بھی بن سکیں۔

چنانچہ اس تجزیے کے بعد ہمارے سامنے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے نظام تعلیم کی بہتری کے لیے کون سے بنیادی نکات ہونے چاہئیں۔ اس راقم کے نزدیک سب سے پہلا نکتہ یہ ہے کہ دینی و دنیوی نظام ہائے تعلیم کی تفریق اور اسی طرح دنیوی تعلیمی اداروں کے اندر تعلیمی نصاب کے فرق کو ختم کر دیا جائے۔ پہلی جماعت سے لے کر بارہویں جماعت تک کی تعلیم کا نصاب سب کے لیے یکساں ہو۔ یہ تعلیم مفت اور لازمی ہو۔ اگر کوئی ادارہ اس نصاب تعیم کے ساتھ ساتھ کچھ اور بھی پڑھانا چاہے تو اس پر کوئی پابندی نہ ہو، تاہم یکساں نصاب تعلیم سب کے لیے لازم ہونا چاہیے۔ اگرچہ یہ بہت بڑا قدم ہے، لیکن صرف اسی طریقے سے ہم اپنے ملک کے باشندوں کو مختلف طبقات اور گروہوں میں تقسیم ہونے سے بچا سکتے ہیں۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ بارہویں جماعت کے بعد جس طرح ایک طالب علم میڈیکل یا انجینئرنگ کی تعلیم کے لیے کسی درس گاہ میں جاتا ہے، بالکل اسی طرح ایک طالب علم دینی علوم کی

Marfat.com

درس گاہ میں جائے۔ وہاں پانچ برس کی تعلیم کے بعد اسے بیچلرز کی ڈگری دی جائے، اور پھر اگر وہ چاہے تو کسی بھی دینی شعبے میں تخصیص حاصل کرنے کے لیے پی ایچ ڈی میں داخلہ لے سکتا ہے۔ اس طرح ہمارے ملک میں دین کے ایسے جید علماء پیدا ہوں گے جو دین و دنیا دونوں پر عبور رکھتے ہوں گے اور یوں عوام و خواص کی بہتر رہنمائی کر سکیں گے۔ اس راقم کی یہ بھی تجویز ہے کہ باقی سب مضامین مثلاً اردو، تاریخ اور کیمسٹری وغیرہ کے لیے بھی ایف۔اے، ایف۔ایس۔سی کے فوراً بعد اختصاصی تعلیم شروع کر دی جائے تا کہ ایک طالب علم اپنے میدان میں چار برس گزارنے کے بعد اس حقیقی عالم بن سکے۔ اس طرح موجودہ بی۔اے اور بی۔ایس۔سی لیول کا خاتمہ ہو جائے گا۔

تیسرا نکتہ یہ ہے کہ بالکل ابتدا ہی سے سب معاشرتی مضامین کی تعلیم اردو میں ہو، سائنسی مضامین کی تعلیم انگریزی میں ہو اور پہلے دن سے ہی قرآن مجید کے عربی الفاظ طالب علم کو ذہن نشین کروانے شروع کر دیے جائیں۔ اس طرح ایک طالب علم پہلے دن سے ہی اردو، انگریزی اور قرآنی عربی کو ایک ساتھ پڑھ سکے گا۔ جو صوبے ضرورت محسوس کریں وہ اپنے حالات کے مطابق پہلی چھ جماعتوں تک صوبائی یا کسی مقامی زبان کی تدریس بھی لازمی قرار دے سکتے ہیں۔

چوتھا نکتہ یہ ہے کہ سائنسی تعلیم کا نصاب بالکل وہی ہونا چاہیے جو اس وقت سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملکوں میں رائج ہے۔ اگرچہ یہ ایک مشکل کام ہے، لیکن صرف اسی طریقے سے ہم ترقی یافتہ اقوام کے ہم پلہ بن سکتے ہیں۔

پانچواں نکتہ یہ ہے کہ صرف ایف اے اور ایف ایس سی کے لیول پر وفاقی امتحان لیا جائے۔ یہ امتحان ترقی یافتہ ملکوں کے امتحان کی طرز پر ہو اور اس کے لیے پرائیویٹ اداروں کی خدمات حاصل کی جائیں تا کہ بدعنوانی کم سے کم ہو سکے۔

چھٹا نکتہ یہ ہے کہ ہماری پوری تعلیم کی اسلامی تشکیل ہونی چاہیے۔ یہ نکتہ تفصیل طلب

Marfat.com

ہے۔اس ضمن میں اس راقم نے 1998ء میں ایک مضمون لکھا تھا۔ یہاں وہی مضمون نقل کیا جا رہا ہے۔

"تعلیم کی اسلامی تشکیل ابتدائی سے اعلیٰ ثانوی تک"

تعلیم حکمت عملی_____ پرائمری، ثانوی اور اعلیٰ سطح پر۔

تعلیم کی اسلامائزیشن میں ہمارا بنیادی مطمح نظر یہ ہونا چاہیے کہ ایک طالب علم باعمل اور باکردار مسلمان بن جائے۔ وہ دین کی بنیادی باتوں سے واقف ہو۔ وہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی بجا آوری کو اپنا فرض اولین سمجھے اور یہ سب سبق اسے ساری زندگی یاد ہو۔

اگر یہ کہا جائے کہ ہمارا اب تک کا نصاب تعلیم اور طریقہ تعلیم اس ضمن میں ناکام رہا ہے تو یہ چنداں غلط نہیں ہوگا۔ آج ایک عام تعلیم یافتہ انسان اسلامی علم اور عمل دونوں میں کسی مثالی کارکردگی کا حامل نہیں۔ وہ کسی کے سامنے دین کی دعوت پیش نہیں کرسکتا۔ آج کے سلگتے مسائل میں وہ دین کا نقطہ نظر دلیل کے ساتھ پیش نہیں کرسکتا۔ حقوق العباد اس کی نظر میں چنداں اہمیت نہیں رکھتے۔ وہ ایک ہوش مند اور باشعور شہری کا کردار ادا نہیں کر رہا۔ یہی وجہ ہے کہ اجتماعی اخلاقیات کے ضمن میں آج ہمارا معاشرہ نہ صرف معیارِ مطلوب سے نیچے ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ دنیا کے کمزور ترین معاشروں میں شامل ہے تو یہ چنداں غلط نہ ہوگا۔

میرے نزدیک اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم نے اپنے نصابِ تعلیم میں قرآن مجید کو بنیادی حیثیت نہیں دی۔ حالانکہ یہی کتاب معیارِ حق و باطل ہے۔ یہی کتابِ ہدایت ہے۔ یہ فرقان، میزان اور مہیمن ہے۔ یہی ہمارے عقیدہ اور عمل کا محافظ ہے۔ یہی راہ راست کی طرف ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ یہ احسن الحدیث یعنی بہترین کلام اور عمدہ ترین بات ہے۔ یہ امر و حکم ہے۔ یہ بصائر ہے، یہ بلاغ ہے، یہ بیان ہے، یہ بینہ ہے، یہ حکمت ہے، صدق ہے، مبارک ہے اور مبین ہے۔ اسی کتاب میں ہمیں تفکر، تدبر اور تعقل سے کام لینا ہے۔ ہمیں اسی کتاب کی پیروی کرنی ہے۔ اسی کتاب کے ذریعے ہمیں سب لوگوں تک دین کی دعوت پہنچانی ہے اور اسی کتاب

Marfat.com

کے ذریعے ایک دوسرے کو یاددہانی کرانی ہے۔

آج کے حالات کے حوالے سے یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ اسی کتاب کا فہم وسیع النظری پیدا کرتا ہے، اتحادواتفاق پیدا کرتا ہے، فرقہ بندی سے بچاتا ہے، اچھائیوں کو ابھارتا ہے، برائیوں کے خلاف قوت مدافعت بڑھاتا ہے، ہر میدان میں آگے بڑھنے پر انسان کو آمادہ کرتا ہے اور جذباتیت کی راہ پر چلنے کی بجائے عقل وحکمت اور گفتگو ومباحثہ کی ذہنیت کو ابھارتا ہے۔ اسی کتاب کا صحیح شعور ہمیں اعلیٰ ترین انسانی قدریں سکھاتا ہے۔ لاریب یہی آج کی اہم ترین ضرورت ہے۔ اور اسی پر ہمارے قومی کردار کے ارتقاء کا دارومدار ہے۔

چنانچہ میری بنیادی تجویز یہ ہے کہ پرائمری سے لے کر ثانوی اور اعلیٰ ترین سطح تک، گویا ہر لیول پر اسی کتاب کے سیکھنے اور سمجھنے کو تعلیم کا مرکز ومحور بنایا جائے۔ ہمارے نظام کا اصل الاصول یہی ہونا چاہیے۔ ''العلم'' تو قرآن مجید ہی ہے۔ باقی سب علوم ''القوۃ'' ہیں۔ جن کا سیکھنا بھی قرآن مجید ہی کی رو سے لازم ہے۔ اسلامی علوم کا نصاب قرآن مجید سے شروع ہو اور اسی پر اس کا اختتام ہو۔ رسول اللہؐ کے جو فرامین، اسی قرآن مجید کے اتباع میں صحیح احادیث کی شکل میں موجود ہیں انہیں بھی اس نصاب میں اس طرح سمویا جائے جس طرح ہار میں نگینے جڑے ہوتے ہیں۔

یہ ضروری ہے کہ قرآن مجید کی تعلیم اس طریقہ پر دی جائے جس سے طالب علم بوجھ محسوس نہ کرے۔ وہ کنفیوز نہ ہو۔ بلکہ یہ اس کے لیے نہایت آسان اور خوشگوار ہو۔ یہ تعلیم اس کے لیے خوشی کا باعث ہو اور یہ اسے ہمیشہ یادرہے۔ چنانچہ اس ضمن میں دو اُمور نہایت اہم ہیں۔ ایک یہ کہ اصل زور قرآن مجید کے لفظی ترجمے اور رواں ترجمے پر دیا جائے۔ ہمارا مطمح نظر یہ ہونا چاہیے کہ ایف۔اے (F.A) تک پہنچتے پہنچتے ایک طالب علم کو تمام دو ہزار الفاظ کا لفظی اور رواں ترجمہ آنا چاہیے۔ اور اعلیٰ ثانوی سطح کے اختتام تک اسے اس قابل ہونا چاہیے کہ جب وہ قرآن مجید کی تلاوت کرے تو وہ اس کے لفظی ورواں ترجمے کو بخوبی جانتا ہو۔ ہر موضوع کی ابتدا وانتہا قرآن مجید کی آیات بینات ہی کے ذریعے ہو۔ دوسرا یہ کہ ایف۔اے کی سطح تک طالب علم کو عربی زبان اور

Marfat.com

عربی گرائمر پڑھانے کی کوئی ضرورت نہیں۔قرآن مجید کے لفظی اور رواں ترجمے کے دوران میں ہی طالب علم خود بخود قرآنی فقروں کی ساخت اور اس کی گرائمر سے واقف ہو جاتا ہے۔قرآنی عربی نہایت آسان اور قرآنی عربی کا گرائمر نہایت مختصر ہے۔ جب کہ عربی بحثیت زبان بہر حال ایک مشکل اور اس کا گرائمر کافی پیچیدہ ہے۔عربی زبان کا علیحدہ مضمون اور اس کے گرائمر کو ذہن نشین کراتے کراتے توجہ قرآن مجید سے ہٹ کر ان فنی امور کی طرف ہو جاتی ہے۔ جب کہ ہمارا مقصد تو یہ ہے کہ طالب علم کی توجہ قرآن مجید سے ہٹنے نہ پائے۔

درج بالا امور کو مدنظر رکھتے ہوئے عملی نصاب کا خاکہ کچھ اس طرح بنے گا۔

پہلی جماعت: قرآن مجید کی دس منتخب آسان ترین آیات یا ان کے ٹکڑے اور ان کا لفظی و رواں ترجمہ مثلاً

''رب زدنی علما''

دوسری جماعت: قرآن مجید کی پندرہ آسان آیات یا ٹکڑے اور ان کا لفظی و رواں ترجمہ

تیسری جماعت: قرآن مجید کی منتخب بیس آیات یا ٹکڑے اور ان کا لفظی و رواں ترجمہ

چوتھی جماعت سے ساتویں جماعت تک: قرآن مجید کی منتخب بیس آیات یا ٹکڑے اور ان کا لفظی و رواں ترجمہ

آٹھویں جماعت: پچاس آیات اور ان کا لفظی ترجمہ

نویں جماعت سے بارہویں جماعت تک: قرآن مجید کی منتخب سو آیات یا ٹکڑے اور ان کا لفظی و رواں ترجمہ

ہر کلاس میں پچھلی تمام کلاسوں کی آیات دہرائی جائیں۔امتحان میں موجودہ کلاس اور پچھلی کلاسوں کا لفظی ترجمہ اور رواں ترجمہ پوچھا جائے۔ان تمام آیات کو موضوعات کے تحت رکھا جائے اور موضوع کے تحت کوئی مضمون نگاری نہ ہو بلکہ صرف آیات قرآنی ہو۔ مثلاً جھوٹ کے

Marfat.com

موضوع پر کوئی مضمون نہ ہو بلکہ اس موضوع کے تحت صرف متعلقہ آیات قرآنی درج ہوں۔ امتحان میں بھی کوئی مضمون لکھنے کو نہ کہا جائے۔

اس طرح ایف۔اے، ایف۔ایس۔سی کے لیول تک پہنچتے پہنچتے ایک طالب علم کم از کم سو آیات کا لفظی و رواں ترجمہ سیکھ چکا ہوگا۔

آٹھویں جماعت اور اس کے بعد ہر کلاس میں دس صحیح احادیث بھی نصاب میں شامل کی جائیں۔

یہاں بجا طور پر یہ سوال ہو سکتا ہے کہ ایک طالب علم کو تو اس کے علاوہ بھی دین کی بہت سی باتیں سیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً وضو اور نماز کا طریقہ، مختلف آداب اور حضورؐ کی زندگی کے چیدہ چیدہ واقعات۔ یہ بات صحیح ہے۔ جہاں تک عملی امور کا تعلق ہے۔ ان کو تحریری کورس میں شامل کرنے کی ضرورت نہیں۔ وضو اور نماز کا طریقہ ایک طالب علم گھر میں سیکھتا ہے۔ اور استاد بھی اس کی یاددہانی کرا سکتا ہے۔ یہی صورت مختلف آداب و شعائر کی ہے۔ البتہ سیرت النبیؐ کے عنوان کے تحت ہر کلاس میں منتخب اور ایک دوسرے سے مربوط مواد کا رکھا جانا لازم ہے۔ میری ایک تجویز یہ بھی ہے کہ اسلامیات کی پیریڈ میں ایک حصہ زبانی بھی ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ استاد کلاس کے اندر انبیاء و صلحاء کے قصے، صحابہ کرامؓ کے واقعات، امت مسلمہ کے پچھلے چودہ سو برس کی تاریخ کے منتخب حصے، امت کے اہم ترین علماء، فقہاء، محدثین، فلسفیوں، سائنس دانوں، جرنیلوں اور حکماء کے حالات زندگی طلبہ کو سنائے۔ طلبہ کے لیے اس کی کتاب بھی موجود ہو۔ مگر اس کا کوئی امتحان نہ لیا جائے تاکہ یہ طلبہ پر بوجھ نہ بنیں۔ البتہ ان کی یاددہانی کے لیے کوئز کمپی ٹیشن کلاس کے اندر بکثرت کروائے جائیں۔ اور کامیاب طلبہ کو انعامات دیے جائیں۔ اس طرح کی چیزوں میں طلبہ زیادہ دلچسپی لیتے ہیں اور یہ بچوں کو اپنے کورس کی چیزوں سے زیادہ اچھی طرح یاد رہتی ہیں۔ اس زبانی نصاب کے نتیجے میں ایف۔اے ایف، ایس۔سی تک پہنچتے پہنچتے ایک

Marfat.com

طالب علم اسلامی تہذیب وتاریخ کے بہت سے عملی ونظریاتی پہلوؤں سے واقفیت حاصل کر چکا ہوگا۔

مختصراً یہ بتانا بھی مناسب ہے کہ فی الوقت اسلامیات وعربی کے نصاب میں کیا کمزوری ہے۔ اس کی بنیادی کمزوری تو یہ ہے کہ اس میں ابتدا سے مرکز ومحور قرآن مجید کو نہیں بنایا گیا۔ اس کی دوسری کمزوری یہ ہے کہ نیا نصاب طلبہ کی استعداد سے بہت اونچا ہے اس میں طلبہ کو وہ عربی سکھانے کی کوشش کی گئی ہے جو نہ تو قرآنی عربی کے سیکھنے میں ممد ومعاون ثابت ہوتی ہے نہ ہی وہ آئندہ کبھی طلبہ کے کام آنے کی توقع ہے۔ پھر اس میں جماعت ششم سے سورۃ بقرہ کا رواں ترجمہ رکھا گیا ہے اور جماعت ہفتم میں سورۃ آل عمران کا رواں ترجمہ شامل کیا گیا ہے۔ دوراں حال یہ کہ یہ طلبہ کی عمر اور استعداد سے کہیں اونچا ہے۔ اس عمر میں تو طلبہ کو وہ منتخب آیات سکھانے کی ضرورت ہے جن کا تعلق عقیدہ وعمل کی سادہ شکل سے ہو۔ یہی صورت حال جماعت نہم ودہم کے نصاب کی ہے۔ جن میں سورۃ انفال، توبہ، احزاب اور ممتحنہ کو شامل نصاب کیا گیا ہے جو مشکل ترین سورتیں ہیں۔ البتہ اس کتاب کا حصہ' حدیث وحصہ' موضوعاتی مطالعہ قابل تعریف ہے۔

چنانچہ راقم الحروف کی پیش کردہ تجویز سے ثانوی سطح تک اسلامیات وعربی کا نصاب مختصر مگر جامع ہوجائے گا اور طالب علم پر بوجھ بنے بغیر اس کی ذہنی وعملی تربیت میں ممد وثابت ہوگا۔ اس کو قرآن مجید کے وہ تمام حصے زبانی یاد ہوں گے اور لفظی ورواں ترجمے کے ساتھ یاد ہوں گے جن کا تعلق اس کی عملی زندگی سے ہے۔

اب اس کے بعد اعلیٰ ثانوی سطح کی باری آجاتی ہے۔ یعنی ایم۔ اے لیول اور پیشہ ورانہ کالج مثلاً میڈیکل، انجینئر نگ اور کامرس کالج وغیرہ۔ راقم کے خیال میں یہی وہ حج اور عمر ہے جس میں طالب علم کو چار سال کے اندر پورا قرآن مجید، لفظی اور رواں ترجمے کے ساتھ الحمد سے الناس تک پڑھایا جانا چاہیے۔ اس کے لیے کسی خصوصی کتاب کا اہتمام کیا جاسکتا ہے۔ (اس راقم نے اس مقصد کے لیے "آسان ترین ترجمہ وتفسیر قرآن" تحریر کی ہے)۔ پورے قرآن مجید کی تفہیم اس

Marfat.com

طرح کی جائے کہ چار سالوں میں اس کا مطالعہ پایۂ تکمیل کو پہنچ سکے۔اعلیٰ ثانوی سطح پر قرآن مجید کا مکمل مطالعہ ہر کلاس میں اور ہر کالج میں لازم ہو۔ طالب علم کوئی بھی مضمون پڑھ رہا ہو مثلاً انگریزی، فلسفہ، تاریخ یا کیمسٹری، خواہ وہ میڈیکل کا طالب علم ہو یا کامرس کالج کا، یہ مطالعہ اس کے لیے لازم ہے۔اس کی کلاس میں حاضری دوسری کلاسوں جتنی لازم ہو اور پرچے میں پاس ہونا ڈگری لینے کے لیے لازم ہو۔راقم یہ تجویز پیش کرتا ہے کہ یہ کام فوری طور پر شروع کیا جائے۔ اس کے لیے کسی خاص تیاری کی ضرورت نہیں۔اس کے لیے اساتذہ کی بھی کوئی کمی نہیں۔یوں تو عربی و اسلامیات کے ماسٹر ڈگری رکھنے والے افراد بھی بڑی تعداد میں موجود ہیں، مگر ان کے علاوہ بھی ملک میں ایسے بے شمار لوگ موجود ہیں جو قرآن کو لفظی ترجمہ کے ساتھ بخوبی پڑھا سکتے ہیں۔اگر اساتذہ کی کمی ہو تو ایسے افراد کو نٹسٹ سے بھی گزارا جا سکتا ہے۔ہر کالج میں ایسی لائبریری کا قیام عمل میں لانا چاہیے جہاں اسلامی موضوعات پر کتابیں اور قرآن مجید کی تفاسیر موجود ہوں تاکہ جس طالب علم کے ذہن میں مطالعہ قرآن کے وقت کوئی سوال آئے وہ اپنے استاد کی رہنمائی میں اس لائبریری میں اپنے سوال کا جواب تلاش کر سکے۔اس طرح طلبہ میں دین کے مطالعے کا رجحان پیدا ہوگا۔

اعلیٰ ثانوی سطح ہی کا ایک حصہ یہ ہے کہ اس سطح پر عربی و اسلامیات کی پروفیشنل تعلیم کیسے دی جائے؟ حقیقت یہ ہے کہ اس ضمن میں موجودہ تعلیم غیر تسلی بخش ہے۔ایم۔اے اسلامیات کو اسلام پر کوئی عبور حاصل نہیں ہوتا اور ایم۔اے عربی اس زبان میں نہ گفتگو کر سکتا ہے نہ لکھ سکتا ہے۔راقم کی تجویز یہ ہے کہ میڈیکل اور انجینئرنگ کالج کی طرز پر خالص پروفیشنل انداز میں ایف۔اے، ایف ایس سی کے بعد ہر صوبہ میں ایک ایک انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک سائنسز ہو۔اس میں داخلہ مقابلہ کے امتحان کی بنیاد پر ہو۔اس انسٹی ٹیوٹ کا مطمح نظر یہ ہو کہ اس میں چار سالہ تعلیم کے بعد جو فرد فارغ التحصیل ہو وہ اسلام پر پورا عبور رکھتا ہو۔عربی اور انگریزی میں دین کو

Marfat.com

سمجھنے اور سمجھانے پر قادر ہو۔ اس میں اجتہادی بصیرت آ جائے۔ مقابلہ کے اعلیٰ امتحان میں بیٹھ کر زندگی کے ہر شعبے میں جا سکے۔ وہ دین کے مختلف شعبوں میں تحقیق و مہارت حاصل کرنے کے لیے تیار ہو۔ غرض یہ کہ یہی ڈگری سب سے بڑھ کر قابل عزت اور قابل فخر ہو۔ اس درس گاہ میں چالیس فیصد وقت براہ راست قرآن مجید کے عمیق مطالعے کو دیا جائے۔ تیس فیصد وقت حدیث، فقہ، صرف و نحو، عربی ادب اور اُن مروجہ علوم کو دیا جائے جو کہ آج کل دینی مدارس میں پڑھائے جاتے ہیں۔ واضح رہے کہ ان علوم کی تدریس بلواسطہ طور پر قرآن مجید کے تحقیقی مطالعہ کے دوران میں بھی ہوتی رہے گی۔ تیس فیصد وقت انگریزی اور دوسرے عصری علوم، جن سے دین کے ایک طالب علم کا آشنا ہونا ضروری ہے مثلاً معیشت، سیاست، جدید فلسفہ، نفسیات، تاریخ مسلمین، تاریخ افکار و علومِ اسلامی کو دیا جائے۔ یہی دینی علوم کی تحقیقی درس گاہ ہوگی۔ اس درس گاہ سے جو لوگ تیار ہو کر نکلیں گے وہ معاشرے کے ہر فرد و ہر ادارے کی دینی رہنمائی کا کام انجام دے سکیں گے۔ آج کی طرح نہیں کہ علماء کی دنیا الگ ہے اور عام انسان کی الگ۔ یہی ادارے فرقہ بندی کا خاتمہ کریں گے اور وسیع النظری پیدا کریں گے۔ ان اداروں کے قیام کے بعد موجودہ دینی مدارس خود بخود ان کی تقلید کریں گے۔ اس طرح ایک حقیقی تبدیلی عمل میں آ سکے گی۔

اعلیٰ ثانوی سطح پر راقم کی یہ بھی تجویز ہے کہ مقابلے کے تمام امتحانات میں ایک لازمی پرچے کا اضافہ کر دیا جائے جو قرآن مجید کے لفظی اور رواں ترجمے پر مشتمل ہو۔ راقم الحروف توقع رکھتا ہے کہ ان تجاویز پر مشتمل نصاب اور طریقہ تعلیم ایک طالب علم کو باعمل و با کردار مسلمان بنانے میں ممد و معاون ثابت ہوگا۔

Marfat.com

پچیسواں باب

مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تعلقات

آج دنیا میں ایک گلوبل ولیج کی حیثیت کر چکی ہے۔ ہر مسلمان ملک میں لاکھوں یا کروڑوں کی تعداد میں غیر مسلم رہتے ہیں۔ اسی طرح ہر غیر مسلم ملک میں بھی لاکھوں یا کروڑوں مسلمان بستے ہیں۔ تقریباً ہر مسلمان ملک کا کوئی نہ کوئی غیر مسلم بھی ہمسایہ موجود ہوتا ہے۔ چنانچہ سوال یہ ہے کہ غیر مسلموں سے درج بالا تینوں حیثیتوں میں تعلق کار (Working Relationship) کیا ہونا چاہیے؟ کیا سارے غیر مسلم ہمارے بالفعل (Potential) دشمن ہیں؟ کیا ان میں سے کسی سے دوستی کا تعلق نہیں رکھا جاسکتا؟ کیا ہر غیر مسلم ملک بھی ہمارا دشمن ہے، یا اس سے پر امن بقائے باہمی کا تعلق رکھا جاسکتا ہے۔

ایک مسلمان ملک میں غیر مسلموں کے حوالے سے چند اور سوالات بھی پیدا ہوتے ہیں۔ وہ یہ کہ قرآن مجید میں بعض جرائم کی سزائیں بیان کی گئی ہیں۔ کیا یہ سزائیں غیر مسلموں پر بھی نافذ کی جائیں گی؟ اگر ایسا کیا گیا تو کیا یہ غیر مسلموں پر ایک دوسرے دین کو زبردستی نافذ کرنے کی مترادف نہیں ہوگا؟ اور اگر ایسا نہیں کیا گیا تو غیر مسلموں کے ہاں وقوع پذیر ہونے والے جرائم کے ضمن میں کیا رویہ اختیار کیا جائے؟

ہمارا دین ہمیں یہ بتاتا ہے کہ یہ دنیا آزمائش کی جگہ ہے۔ اگر اس دنیا میں اس دینِ حق کو اس کے نہ ماننے والوں پر بزور نافذ کرنے کی کوشش کی جائے تو یہ آزمائش کو ختم کرنے کے مترادف ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں بار بار یہ اصولی بات فرمائی گئی ہے کہ دین کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں ہو۔

مسلمانوں کے حوالے سے غیر مسلم دو گروہوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ ایک وہ گروہ جو مسلمانوں کے معاملے میں ہمدردانہ اور مبنی بر انصاف رویہ رکھتا ہے یا کم از کم غیر جانبدار ہے۔

Marfat.com

دوسرا وہ گروہ ہے جو کھلم کھلا مسلمانوں کا دشمن ہے، اسلام کا مذاق اڑاتا ہے اور مسلمانوں سے عناد رکھتا ہے۔ غیر مسلم افراد بھی ان دو گروہوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں اور غیر مسلم حکومتیں بھی ان دو گروہوں میں تقسیم ہو جاتی ہیں۔ پہلے گروہ کے متعلق مسلمانوں کو یہ عمومی ہدایت دی گئی ہے کہ ان سے اچھا تعلق رکھا جا سکتا ہے۔ اس اچھے تعلق کی وجہ سے مسلمان افراد اور حکومتیں بے جا مشکلات میں مبتلا نہیں ہوتیں اور مسلمانوں کو یہ موقع بھی مل جاتا ہے کہ وہ غیر مسلموں تک دین کی دعوت پہنچا ئیں۔ دوسرے گروہ کے متعلق ہمیں یہ ہدایت دی گئی ہے کہ ان سے دوستی کا تعلق نہیں رکھا جا سکتا۔ البتہ ان سے تعلق کار رکھا جا سکتا ہے۔ ان کی دشمنی اور اقدامات سے مسلمانوں کو ہمیشہ ہوشیار رہنا چاہیے تا کہ مسلمان کسی نقصان میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ مناسب موقعوں پر ان کو بھی دین کی دعوت پہنچانی چاہیے، لیکن اگر یہ لوگ دین کا مذاق اڑانے لگیں تو پھر اُس وقت اُن سے ہٹ جانا چاہیے۔

درج بالا دونوں باتوں کی طرف قرآن مجید نے بار بار توجہ دلائی ہے۔ عقل عام (Common sense) سے بھی بالکل اسی نتیجے تک ایک انسان پہنچتا ہے۔ البتہ قرآن مجید کی سورہ مائدہ، آیت نمبر 51 میں یہ فرمایا گیا ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا دوست نہ بنایا جائے۔ چنانچہ سوال یہ ہے کہ کیا سب یہودیوں اور عیسائیوں سے ہمیشہ کے لیے اچھا تعلق رکھنا منع ہے، یا پھر یہاں بھی صرف اُنہی یہودیوں اور عیسائیوں کی بات کی گئی ہے جو مسلمانوں سے دشمنی رکھتے ہیں؟ اس راقم کے نزدیک اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں بھی انہی یہودیوں اور مسیحیوں کی طرف اشارہ ہے جن کی اسلام دشمنی بالکل واضح ہو چکی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس آیت کے بعد آگے آیت نمبر 57 میں یہ بتایا گیا ہے کہ اُن اہل کتاب اور دوسرے منکرین حق کو اپنا دوست اور رفیق نہ بنایا جائے جو اسلام کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اس کے بعد مزید آگے آیت نمبر 82 میں بہت واضح طریقے سے یہ بات کہی گئی ہے کہ مسلمانوں سے دشمنی رکھنے میں یہودی اور مشرکین بہت سخت ہوں گے، تاہم مسیحی ہم سے دوستی میں قریب تر ہوں گے۔ اس کی وجہ بھی قرآن مجید نے یہ

Marfat.com

بیان کر دی ہے کہ اُن میں عبادت گزار عالم موجود ہیں، نیز ایسے لوگ موجود ہیں جنھوں نے دنیا کو ترک کر کے فقر اور انسانی خدمت کی زندگی اختیار کر لی ہے، اور یہودیوں کے برعکس ان میں غرور نہیں ہے۔

جہاں تک ملکوں کا تعلق ہے، تو یہ بات بالکل واضح ہے کہ اب تو ان کے درمیان عام طور پر دوستی کا تعلق نہیں ہوتا، بلکہ ڈپلومیسی کی زبان میں جس چیز کو دوستی کہا جاتا ہے، وہ درحقیقت صرف تعلق کار ہی ہوتی ہے۔ البتہ افراد کے حوالے سے یہ مناسب ہے کہ اہل کتاب کے نیک افراد سے اچھا تعلق رکھا جائے۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ دین کی دعوت کے لیے ان کے دلوں کو کھولا جا سکے گا۔ قرآن مجید میں کئی ایسی آیات موجود ہیں جن میں اچھے اہل کتاب کی تعریف کی گئی ہے، اُن کے ذبیحے کو ہمارے لیے حلال قرار دیا ہے، اور مسلمانوں کو یہ اجازت بھی دی گئی ہے کہ وہ اہل کتاب عورتوں سے شادی کر سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ میاں بیوی اور والدہ اور بچوں کا تعلق محبت کے بغیر ممکن نہیں ہوتا۔ دراصل سورۃ مائدہ کی آیت نمبر 51 میں یہود و نصاریٰ کے نام سے پہلے ''الف لام'' کا لاحقہ آیا ہے، جس سے یہ اسم معرفہ (Proper Noun) بن گیا ہے۔ چنانچہ اس سے مراد یہود و نصاریٰ کا ایک مخصوص گروہ ہے۔ سورۃ مائدہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہ اہلِ کتاب ہیں جو مسلمانوں سے برسر جنگ تھے، مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرتے تھے اور اسلام کا مذاق اڑاتے تھے۔ یقیناً ایسے اہل کتاب سے دوستی ایک بڑا جرم ہے۔

جہاں تک غیر مسلم ممالک کا تعلق ہے، ہمیں ہمارے دین نے قرآن مجید میں کئی مرتبہ یہ ہدایت کی ہے کہ ہم سب ممالک کے ساتھ تعلقِ کار رکھ سکتے ہیں۔ حتیٰ کہ ہمیں یہ ہدایت دی گئی ہے کہ کسی دشمن قوم کے معاملے میں بھی ہمیں ہمیشہ عدل و انصاف سے کام لینا چاہیے۔ خود حضورؐ نے کئی غیر مسلم قبیلوں سے امن اور اچھے تعلقِ کار کے معاہدے کیے تھے۔

اب سوال رہ جاتا ہے ایک مسلمان ملک کے اندر غیر مسلموں پر اسلام کے فوجداری قوانین نافذ کرنے کا۔ چونکہ یہ قوانین اسلام کا ایک جزو ہیں، اس لیے کسی مسلمان ملک کے غیر

Marfat.com

مسلم باشندے چاہیں تو انہی قوانین کو اختیار کر سکتے ہیں اور اگر چاہیں تو اپنے لیے اپنے منتخب نمائندوں کے ذریعے کچھ دوسرے قوانین بھی اختیار کر سکتے ہیں۔ ہمارے دین نے غیر مسلموں کو یہ اجازت بھی دی ہے کہ وہ کسی مسلمان ملک کے اندر اپنی عدالتیں بھی قائم کر سکتے ہیں۔ حضورؐ کے زمانے میں بھی غیر مسلموں کی عدالتیں قائم تھیں، جس کی طرف سورۃ مائدہ آیت نمبر 42 میں اشارہ کیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ اسلام کے فوجداری قوانین اتنے اچھے ہیں کہ یہ عین ممکن ہے کہ کسی مسلمان ملک کے غیر مسلم باشندے انہی قوانین کو من و عن اختیار کر لیں، تاہم اگر وہ ایسا نہ کرنا چاہیں تو یہ اختیار بھی ان کو حاصل ہے۔

Marfat.com

چھبیس واں باب

جنگ اور ریاست کا باہمی تعلق

یہ دنیا آزمائش کی جگہ ہے۔ چنانچہ دنیا میں قیامت تک جنگوں کا سلسلہ جاری رہے گا۔ یہ انسانی زندگی کا ایک ناگزیر اور اہم ترین شعبہ ہے۔ چونکہ جنگ کے ذریعے انسانوں کی جان، مال اور آبرو کو بڑا نقصان پہنچتا ہے، اس لیے ہمارے دین نے اس کے بارے میں ہمیں چند نہایت اہم اصولوں کا پابند بنا دیا ہے، تاکہ جنگ کی وجہ سے ہونے والے نقصان کو کم سے کم کیا جا سکے اور جنگ کے نتیجے میں دنیا میں مزید فساد برپا نہ ہو بلکہ امن کا قیام عمل میں آئے۔

جنگ کے ضمن میں دین کا پہلا اصول یہ ہے کہ اس کارروائی کا حق صرف حکومت کو ہے۔ حکومت کے بغیر قتال کا کوئی تصور نہیں۔ یہ لازم ہے کہ قتال کا اعلان حکومت کرے، اس کا مکمل انتظام حکومت کے ذمے ہو اور وہی اس کی ہر حرکت کو کنٹرول کرے۔ حضورؐ کو بھی جنگ کی اجازت صرف مدنی دور میں اُس وقت دی گئی جب آپؐ کو اقتدار مل گیا۔ مکی دور کے تیرہ برسوں میں جب آپؐ کے پاس اقتدار نہیں تھا، آپؐ کے لیے جنگ ممنوع رہی۔ یہی اصول اس سے پہلے کے سب پیغمبروں کے لیے بھی رہا۔

دین کی دوسری شرط یہ ہے کہ جنگ صرف کسی ظلم کے خاتمے کے لیے ہو سکتی ہے۔ اس ضمن میں قرآن مجید نے تین چیزوں کو اللہ کے راستے میں جنگ قرار دیا ہے۔ مثلاً اگر کسی مسلمان ریاست پر حملہ ہو تو اسے اپنی مدافعت کا حق حاصل ہے۔ اگر کسی ملک میں مسلمانوں پر ظلم و ستم ہو رہا ہو تو ان کی حمایت کے لیے جنگ کرنا جائز ہے۔ اور اگر کسی ملک میں اسلام کی دعوت پھیلانے پر پابندی ہو تو ایسی حکومت کے خلاف بھی اعلان جنگ کیا جا سکتا ہے۔

دین کی تیسری شرط یہ ہے کہ اگر کسی ملک کے ساتھ معاہدۂ امن موجود ہے، تو اُس ملک کے خلاف جنگ چھیڑنا جائز نہیں۔ حتیٰ کہ اگر کوئی ملک اپنے ہاں کے مسلمانوں پر ظلم کر رہا ہو لیکن

Marfat.com

اُس سے مسلمان ریاست کا معاہدہ امن موجود ہے تو ایسے ملک کے خلاف بھی اُس وقت تک جنگ نہیں کی جاسکتی جب تک معاہدہ امن کو ختم کرنے کا اعلان نہ کر دیا جائے۔

چوتھی شرط یہ ہے کہ جنگ صرف اُس وقت کی جائے جب اُسے جیتنے کا پورا امکان موجود ہو۔ اگر ایسی حالت پیدا ہو جائے کہ دشمن کی تعداد اور اُس کا ساز وسامان ہمارے مقابلے میں بہت زیادہ ہو، تو اس وقت جنگ کو حتی الوسع ٹالنے کی کوشش کی جائے۔ حضورؐ نے جنگ احزاب میں یہی کچھ کیا۔ اُس وقت دشمن کی تعداد مسلمانوں سے بہت زیادہ تھی، چنانچہ مسلمانوں نے اپنے آپ کو خندق میں محفوظ کر کے، اپنی طاقت کو بچا کر جنگ سے گریز کا راستہ اختیار کیا۔ اس کے بعد جوں ہی موقع ملا تو بنی قریضہ کو اس کی غداری کی سزا دی گئی اور پھر پوری تیاری کے بعد مکہ پر اُس وقت فوج کشی کی گئی جب مسلمانوں کی طاقت دشمن سے کہیں زیادہ تھی۔

ان کے علاوہ بھی قرآن مجید نے جنگ کے بارے میں مسلمانوں کو اہم ہدایات دی ہیں۔ اُن میں ایک ہدایت یہ ہے کہ جو لوگ جنگ میں براہ راست حصہ نہیں لے رہے، انہیں قتل کرنا یا نقصان پہنچانا منع ہے۔ دوسری ہدایت یہ ہے کہ اگر دشمن یہ پیش کش کرے کہ وہ متنازعہ امور بات چیت کے ذریعے حل کرنا چاہتا ہے اور مسلمانوں کی حکومت یہ سمجھتی ہو کہ صلح کی پیش کش خلوص پر مبنی ہے اور دشمن واقعتاً متنازعہ امور مکالمے کے ذریعے حل کرنا چاہتا ہے، محض جنگی چال کے طور پر ایسا نہیں کر رہا، تو اُس کی پیش کش قبول کر لی جائے۔

1980ء کے بعد مسلمانوں کے ہاں اس رجحان نے جنم لیا ہے کہ وہ مختلف مسلح گروہ بنا کر از خود اعلان جنگ کر لیتے ہیں۔ ہمارے دین کی تعلیمات میں اس طرح کی جنگ کا کوئی تصور نہیں ملتا۔ ان تمام امور پر اس راقم نے اپنی کتاب ''جہاد، قتال اور عالم اسلام'' میں تفصیل سے بحث کی ہے۔

Marfat.com

ستائیس واں باب

تشدد اور عدم تشدد

تشدد نام ہے اس بات کا کہ اپنے نقطہ نظر کو طاقت کے ذریعے دوسروں پر مسلط کیا جائے اور کسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے کوئی ایسا اقدام کیا جائے جس سے انفرادی یا اجتماعی طور پر کسی کی جان مال اور آبرو کو نقصان پہنچے۔ اس کے بالکل برعکس عدمِ تشدد کا مطلب یہ ہے کہ اپنے نقطہ نظر کو دلیل کے ساتھ پیش کیا جائے اور اپنے کسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے خالصتاً پرامن ذرائع استعمال کیے جائیں۔

انسانی تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ دنیا میں اصل کامیابی عدمِ تشدد کو ہی حاصل ہوتی ہے۔ جب کہ تشدد کے ذریعے آنے والی تبدیلی کبھی دیرپا ثابت نہیں ہوتی۔ عدمِ تشدد کا اصول انسانی ضمیر کے عین مطابق ہے۔ اگر اس کے ذریعے سے کوئی مقصد حاصل نہ ہو، تب بھی اس سے کم از کم اتنا تو ہوتا ہے کہ خدا کی زمین میں فساد اور بدامنی نہیں پھیلتی۔ ہمارے دین کی تعلیم بھی یہی ہے کہ عدم تشدد کے ذریعے لوگوں کو اپنی بات پر قائل کیا جائے اور قانونی اختیار ملنے سے پہلے کبھی کوئی اقدام نہ کیا جائے۔ قرآن مجید نے کئی مقامات پر اس بات کی طرف توجہ دلائی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضورؐ اور صحابہ کرامؓ پر مکی دور میں بے انتہا مظالم ہوئے، مگر اہلِ ایمان کی طرف سے کبھی بھی اس کے مقابلے میں کوئی اقدام نہیں کیا گیا۔ ماضی قریب کی تاریخ میں ہمیں بے شمار ایسے رہنما ملتے ہیں جنہوں نے عدم تشدد کے ذریعے بہت بڑی تبدیلیوں کو ممکن بنایا۔ قائداعظم، مہاتما گاندھی، ماوزے تنگ، سوئیکارنو، امام خمینی، نیلسن منڈیلا اور عالی جاہ عزت بیگ کی مثالیں ہماری قریبی تاریخ کا حصہ ہیں۔ عدم تشدد کا مطلب یہ قطعاً نہیں کہ غلط قانون کو نہ توڑا جائے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ غلط قانون کو پرامن طریقے سے اس طرح چیلنج کیا جائے کہ اس غلط قانون پر حکومت وریاست کی جانب سے عمل درآمد نہ ہوسکے۔ برصغیر کی تحریکِ آزادی میں مہاتما گاندھی

Marfat.com

کی طرف سے شراب خانوں اور دوسری غلط کاریوں کے سامنے پکیٹنگ (Picketing) اس کی ایک مثال ہے، جس میں لوگ کسی شراب خانے کے باہر جا کر بس پُرامن طور پر بیٹھ جاتے تھے اور اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کرتے تھے۔

عدم تشدد کے علمبرداروں اور کارکنوں پر جب مظالم ڈھائے جاتے ہیں اور ان کو مظلومانہ طریقے سے قتل کیا جاتا ہے تو وہ اس کے جواب میں ہاتھ نہیں اٹھاتے۔ اس کے نتیجے میں عوام کے اندر یہ سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ آخر ان لوگوں پر ظلم کیوں کیا جا رہا ہے۔ اس سوال کے جواب میں لوگوں کے دلوں میں ایک احساس ابھرتا ہے۔ پھر یہ احساس شعور وآگہی کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ پھر جب یہ شعور پختہ ہو جاتا ہے تو قدرت کی مدد سے تبدیلی کے لیے راستہ ہموار ہو جاتا ہے۔

تشدد کے ذریعے آنے والی تبدیلی کبھی دیرپا نہیں ہوتی۔ خوف اور دہشت کے ذریعے لوگوں کے جسموں کو تو غلام تو بنایا جا سکتا ہے لیکن ان کے دل ودماغ کو تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ تشدد کے ذریعے عموماً کوئی اچھا مقصد بھی پوری طرح حاصل نہیں ہوتا۔ یہ عین ممکن ہے کہ تبدیلی کی طرف دو چار قدم کامیابی کے ساتھ اٹھ جائیں، لیکن تشدد کے نتیجے میں بدامنی اور کشت وخون کا کلچر اتنا عام ہو جاتا ہے کہ پھر حالات سنبھالتے نہیں سنبھلتے۔ پھر ہر آدمی یہی سوچتا ہے کہ بندوق ہی قانون ہے۔ تشدد کے ذریعے قومیں اور معاشرے یا تو تباہ ہو جاتے ہیں اور یا پھر ترقی کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ جاتے ہیں۔ اس کے برعکس یہ بھی عین ممکن ہے کہ عدم تشدد کے ذریعے فوری طور پر کوئی اچھی تبدیلی عمل میں نہ آسکے لیکن اس سے کم از کم یہ تو ہوتا ہے کہ مظلوم قوم متحد رہتی ہے اور ترقی کے منازل طے کرتی جاتی ہے۔ اگر کوئی قوم اندرونی طور پر متحد رہے اور عدم تشدد کے ذریعے آزادی کے حصول کی جدوجہد کرے تو کسی مناسب موقعے پر قدرت کی مدد اس کے شامل حال ہو جاتی ہے۔ یہی حال کسی بھی گروہ کی طرف سے کسی بھی اچھے مقصد کے لیے جدوجہد کا ہے۔ کیونکہ فرمایا گیا ہے کہ اللہ صبر واستقامت سے کام لینے والوں کے ساتھ ہے۔

Marfat.com

عدم تشدد کسی وقتی حکمت عملی کا نام نہیں، بلکہ یہ ایک مستقل اصول اور ذہنیت کا نام ہے۔
عدم تشدد کا حصول انسانیت کو اچھائی کی طرف لے جاتا ہے۔ یہ اصول امن اور تعمیر کا علمبردار ہے، اور یہی ترقی کا پیش خیمہ ہے۔

عدم تشدد کا اصول انسان سے صبر کا تقاضا کرتا ہے۔ اس کے برعکس متشددانہ اقدام دراصل جلد بازی اور جذباتیت کا ظہور ہوتا ہے۔ انسان کے لیے اصل راستہ صبر واستقامت کا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں ایک سوتیں مقامات پر اس کی تلقین کی گئی ہے۔ صبر بھی دراصل ایک ذہنیت اور ذہنی روئے کا نام ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب ایک فرد کے لیے حالات ناسازگار ہوں تو دل چھوٹا نہ کیا جائے، اس بات پر یقین رکھا جائے کہ پروردگار تمام حالات کو دیکھ رہا ہے اور وہ جب چاہے گا حالات بدل دے گا۔ چنانچہ ٹھنڈے دل ودماغ سے کام لیا جائے۔ مایوسی اور گھبراہٹ سے بچا جائے۔ حالات کا اچھی طرح جائزہ لے کر بہترین پرامن حکمت عملی بنا کر اس پر عمل کیا جائے۔ اور اس عمل پر ثابت قدم رہا جائے۔

اسی طرح جب ایک مسلمان قوم وملک کے لیے حالات ناسازگار ہوں، مشکلات زیادہ ہوں اور ہر طرف سے خطرے اُمڈے چلے آرہے ہوں تو صبر کا تقاضا یہ ہے کہ ٹھنڈے دل ودماغ کے ساتھ انتظار کیا جائے، مستقبل کے لیے منصوبہ بندی اور تیاری کی جائے، اشتعال، فوری ردِعمل اور جلد بازی پر مبنی اقدامات سے گریز کیا جائے۔ پوری دنیوی تدبیر کی جائے۔ یہ طرزِ عمل اختیار کیا جائے کہ ہمیں بہترین دنیوی حکمت عملی کے مطابق کام کرنا ہے۔ اللہ سب کچھ دیکھ رہا ہے اور جب وہ ہمیں اس قابل سمجھے گا تو حالات کی تبدیلی کے لیے حکم دے دے گا۔ تیاری کے اس مرحلے میں ثابت قدمی ہی صبر ہے۔

اس کے برعکس ایک فرد یا ایک قوم کی طرف سے فوری ردعمل، جلد بازی، معروضی تجزیے کے فقدان، تیاری کے بغیر اقدام اور حکمت عملی میں عدم استقلال کو بے صبری کہا جائے گا۔
اس عاجز کی نظر میں پچھلے دوسو برس کے دوران میں مسلمان قوم کی ایک بڑی کمزوری

Marfat.com

اور خامی بے صبری ہی رہی ہے۔ آج بھی اس امت کے رہنما عوام کو بے صبری ہی کا سبق پڑھا رہے ہیں۔ حالانکہ اس امت کے لیے اصل سبق صبر اور ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ معروضی تجزئے کا ہے۔

عدم تشدد اور صبر ہی وہ ہتھیار ہیں جن کے ذریعے ہم آج کی لڑائی جیت سکتے ہیں اور نتائج کو اپنے حق میں کر سکتے ہیں۔

Marfat.com

اٹھائیس واں باب

حکمت و دانائی کیا ہے

ہم سب یہ بات جانتے ہیں کہ قرآن مجید نے دانائی کے استعمال پر بہت زور دیا ہے۔ حضورؐ نے بھی حکمت و دانائی کے استعمال پر بہت زور دیا ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں کہ ''حضورؐ نے فرمایا کہ دانائی مومن کی گمشدہ مال و متاع ہے۔ اسے جہاں سے بھی ملے، حاصل کرنا چاہیے''۔ گویا اس کا مطلب یہ ہے کہ دانائی کے حصول میں یہ نہیں دیکھنا چاہیے کہ دانائی کی یہ بات کہاں سے اور کس طرف سے آئی ہے۔ دانائی کی بات جہاں سے بھی آئے اُسے اختیار کرنا چاہیے۔

دانائی کے استعمال کا مطلب یہ ہے کہ جو بھی مسئلہ سامنے آئے، اس کے متعلق سب سے پہلے پورا علم حاصل کیا جائے۔ اس کے بعد بالکل معروضی انداز میں اس کا تجزیہ کیا جائے اور اس پر غور و فکر کیا جائے۔ غور و فکر کے بعد یہ دیکھنا چاہیے کہ حالات کے مطابق بہترین تدبیر کیا ہو سکتی ہے، اور پھر اس تدبیر کے متعلق حکمت عملی بنا کر اپنائی جائے۔ دانائی کے ایسے ہی استعمال پر کسی فرد یا قوم کی ترقی کا دارومدار ہے۔

حضورؐ کی ساری زندگی دانائی کے استعمال کی روشن مثال تھی۔ غزوہ بدر میں جنگی مہارت کے حامل ایک صحابی نے آپؐ کو دلیل کے ساتھ قائل کیا کہ جہاں خیمے لگائے گئے ہیں، یہ صحیح نہیں جگہ ہے۔ اور اس کے بجائے فلاں جگہ خیمے لگانے چاہئیں۔ چنانچہ حضورؐ اس پر قائل ہو گئے اور خیمے دوسری جگہ لگا دیے گئے۔ یہ نئی حکمت عملی اگلے دن کی جنگ میں بہت مفید ثابت ہوئی۔ اسی طرح جب جنگ احزاب کے موقعے پر اسلام کے سارے دشمن متحد ہو کر مدینہ پر حملہ آور ہوئے تو حضورؐ نے صحابہ کرامؓ کا اجلاس بلا کر ساری صورت حال ان کے سامنے رکھی۔ مخالف لشکر کی تعداد بارہ ہزار سے بھی زیادہ تھی اور ان کے پاس ایسا اسلحہ بھی موجود تھا جو مسلمانوں کے

Marfat.com

پاس نہیں تھا۔ دوسری طرف مدینے کے اندر جنگ کے قابل افراد کی تعداد تین ہزار سے زیادہ نہیں تھی۔ ان میں بہت سے منافقین بھی شامل تھے۔ چنانچہ حضورؐ اور صحابہ کرامؓ کی متفقہ رائے بنی کہ اس وقت لڑائی لڑنا ہمارے مفاد میں نہیں ہے، چنانچہ اس بات پر غور و فکر ہونے لگا کہ لڑائی کو ٹالا جائے اور مدینے کی حفاظت کی جائے۔ اس موقع پر ایک صحابی حضرت سلمانؓ فارسی، جو ایران کے باشندے اور وہاں سے غلام بنا کر لائے گئے تھے، نے مدینہ کے گرد خندق کی تجویز پیش کی۔ وہ ایران میں اس طریقۂ مدافعت کو دیکھ چکے تھے۔ اس تجویز کو سب نے پسند کیا۔ یوں مدینے کے گرد خندق کھودی گئی اور جب دشمن کا لشکر مدینہ پہنچا تو انہیں خندق سے واسطہ پڑ گیا، جس کے لیے وہ ذہنی طور پر تیار نہیں تھے۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ لڑائی نہ ہو سکی اور بیس بائیس دن بعد جب دشمن کے پاس راشن ختم ہو گیا اور زبردست آندھی آئی تو انہیں محاصرہ اٹھا کر واپس جانا پڑا۔ اس واقعے سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ لڑائی صرف اُس وقت لڑنی چاہیے جب تدبیر کے لحاظ سے ہمیں لڑائی جیتنے کی پوری توقع ہو۔

فتحِ مکہ بھی حضورؐ کی دانائی کی بہت بڑی مثال ہے۔ اس لڑائی کے لیے ساری تیاری اس انداز میں کی گئی کہ دشمن کو کانوں کان خبر نہ ہو سکی۔ مسلمانوں نے اتنا بڑا لشکر تیار کر لیا جو مکے کی پوری آبادی سے زیادہ تھا۔ مکے کے قریب جا کر لشکر کو اس طرح ترتیب دیا گیا کہ وہ اور بھی بڑا نظر آنے لگا۔ اس کے نتیجے میں اہل مکہ کے پاس ہتھیار ڈالنے کے علاوہ کوئی اور راستہ ہی نہ تھا۔ دشمن کے ہتھیار ڈالنے کے بعد حضورؐ نے سب کے لیے عام معافی کا اعلان کر دیا تاکہ ہم آہنگی اور بھائی چارے کا ایک نیا سفر شروع ہو۔

اس سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اندھا دھند کوئی اقدام نہیں کرنا چاہیے۔ پہلے اچھی طرح سوچ بچار کرنا چاہیے کہ ہمارے اس اقدام کے کیا نتائج رونما ہوں گے۔ بغیر صحیح معلومات کے کیا گیا اقدام، جلد بازی میں کیا گیا اقدام اور سوچے سمجھے بغیر محض جذبات کی بنیاد پر کیا گیا اقدام کبھی بھی اچھے نتائج پیدا نہیں کر سکتا۔

Marfat.com

انتیس واں باب

اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی مصیبت

اس دنیا میں انسان پر ہر دو طرح کی مصیبتیں آتی ہیں، ایک وہ مصیبت جسے ہم قدرتی آفات سے منسوب کرتے ہیں مثلاً طوفان، زلزلے وغیرہ۔ دوسری قسم کی مصیبتیں وہ ہیں جو انسان کے اپنے ہاتھ سے اس پر آئی ہوئی ہوتی ہیں مثلاً بے احتیاطی سے ڈرائیونگ کے نتیجے میں ایکسیڈنٹ وغیرہ۔ پہلی قسم کی مصیبتیں دراصل آزمائش ہوتی ہیں۔ جب کہ دوسری قسم کی مصیبتوں کے بارے میں بھی قرآن مجید نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ اگرچہ ان کے بارے میں آخری فیصلہ اللہ ہی کی طرف سے ہوتا ہے، تاہم انسان کو یہ سوچنا چاہیے کہ یہ مصیبت خود اس کے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہے۔ اُسے اس مصیبت کے عوامل کا تجزیہ کرنا چاہیے اور آئندہ کے لیے ان سے بچنے کی تدبیر کرنی چاہیے۔ جنگ اُحد میں مسلمانوں کو شکست ہوئی جس پر سورہ آل عمران میں بہت تفصیلی تبصرہ کیا گیا۔ اس تبصرے کی آیت نمبر 152 میں فرمایا گیا:

"اے مومنو! اللہ نے (تائید و نصرت کا) جو وعدہ تم سے کیا تھا وہ تو اُس نے پورا کر دیا۔ ابتدا میں اس کے حکم سے تم ہی دشمن کو قتل کر رہے تھے۔ مگر جب تم نے کمزوری دکھائی، اپنے کام میں باہم اختلاف کیا، اور جوں ہی کہ وہ چیز اللہ نے تمہیں دکھائی جس کی محبت میں تم گرفتار تھے (یعنی مال غنیمت)، تو تم اپنے سردار کے حکم کی خلاف ورزی کر بیٹھے اس لیے کہ تم میں کچھ لوگ دنیا کے طالب تھے اور کچھ آخرت کی خواہش رکھتے تھے۔ تب اللہ نے تمہیں منکرینِ حق کے مقابلے میں پسپا کر دیا تا کہ تمہاری آزمائش کرے"۔

اس کے بعد آگے آیت نمبر 165 اور 166 میں فرمایا:

"یہ تمہارا کیا حال ہے کہ جب تم پر مصیبت آپڑی تو تم کہنے لگے کہ یہ کہاں سے آئی؟ حالانکہ (جنگ بدر میں) اس سے دوگنی مصیبت تمہارے ہاتھوں (دشمن پر) پڑ چکی ہے۔ اے

Marfat.com

نبیؐ، ان سے کہو، یہ مصیبت تمہاری اپنی لائی ہوئی ہے، اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ جو نقصان لڑائی کے دن تمہیں پہنچا وہ اللہ کے اذن سے تھا اور اس لیے تھا کہ اللہ دیکھے کہ تم میں سے مومن کون ہے"۔

اسی طرح سورہ نساء آیت نمبر 79 میں فرمایا: "اے انسان، تجھے جو بھلائی بھی حاصل ہوتی ہے، اللہ کی عنایت سے ہوتی ہے، اور جو مصیبت تجھ پر آتی ہے تو وہ تمہارے اپنے کسب وعمل سے ہے۔" اسی طرح سورہ شوریٰ آیت نمبر 30 میں فرمایا:

"تم لوگوں پر جو مصیبت آتی ہے، تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے آتی ہے، اور بہت سے قصوروں سے اللہ ویسے ہی درگزر کر جاتا ہے"۔

درج بالا آیات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جب بھی ہمیں شکست ہو یا کوئی دوسری مصیبت ہم پر آجائے تو ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ اس مصیبت کے آنے میں ہمارا اپنا کیا حصہ تھا۔ یہ تجزیہ اس لیے ضروری ہے تاکہ آئندہ کے لیے ان غلطیوں سے بچا جائے جن کا ارتکاب ہم سے ماضی میں ہوا تھا۔

پچھلے تین سو برس سے مسلمانوں نے بہت سی فیصلہ کن شکستیں کھائی ہیں۔ 1757ء میں سراج الدولہ کو شکست ہوئی۔ 1790ء میں ٹیپو سلطان کو شکست ہوئی۔ 1830ء میں سید احمد شہیدؒ کی افواج کو سکھوں کے مقابلے میں شکست ہوئی۔ 1857ء میں ہم نے جنگ آزادی ہار دی۔ یہ تو صرف چند مثالیں ہیں، ورنہ اس طرح کی بے شمار شکستیں ہمارے حصے میں آئیں۔ 1971ء میں سانحہ بنگال رونما ہوا۔ 1999ء میں کارگل کی جنگ میں ہمیں شکستِ فاش ہوئی۔ 2001ء کے آخر میں افغانستان کی طالبان حکومت کو شکست ہوئی۔

درج بالا واقعات میں کئی شکستیں ایسی ہیں جن میں مسلمانوں کے ہاں ایمان وعمل میں کوئی بڑی کمزوری نہیں تھی۔ مثلاً سید احمد شہیدؒ کے ساتھی ایمان وعمل کا بہترین نمونہ تھے۔ اسی طرح طالبان بھی عمل واخلاص کا بہترین نمونہ تھے۔ ان کے قول وفعل میں کوئی تضاد نہیں تھا۔ جس چیز پر دوسروں کو عمل کرنے کا کہتے تھے، پہلے خود اس پر عمل کر کے دکھاتے تھے۔ سادہ، جفاکش، باحیا،

Marfat.com

پرعزم اور اپنے فہم اسلام کے لیے جان ہتھیلی پر رکھنے والے تھے۔ لیکن ایسا کیوں ہوا کہ پروردگار نے ان کو صرف چھ سال حکومت کرنے کا موقع دیا اور پھر اُن سے یہ موقع چھین لیا۔

دراصل درج بالا سب واقعات میں مسلمانوں کی اصل خامی دنیوی تدبیر کی کمزوری تھی۔ ہمارا دشمن ہم سے دنیوی تدبیر کے معاملے میں بہت آگے تھا، اس لیے پروردگار کی طرف سے ہمارے لیے شکست کا فیصلہ لکھ دیا گیا۔ پروردگار ہر چیز پر قادر ہے۔ اگر وہ چاہے تو ہماری شکست کو ایک لمحے میں فتح میں بدل دے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ سب سے بڑھ کر عادل بھی ہے۔ اُس کے عدل کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمانوں کو کبھی ایسی فتح عطا نہ کی جائے جس کے وہ مستحق نہ ہوں۔

پچھلے تین سو برس کی داستان صرف شکستوں کی کہانیاں نہیں ہے، بلکہ اس عرصے میں بہت سی کامیابیاں بھی مسلمانوں کے حصے میں آئیں۔ بشمول پاکستان، کئی مسلمان ممالک کو آزادی نصیب ہوئی۔ پچھلے چند برسوں کے دوران میں بوسنیا اور کوسوو آزاد ہوئے۔ چنانچہ ہمیں یہ تجزیہ کرنا چاہیے کہ جب ہم ناکام ہوئے تو دنیوی تدبیر کے حوالے سے ہم میں کیا خامیاں اور کمزوریاں تھیں۔ اور جب ہمیں کامیابی ملی تو کون سے عوامل کی وجہ سے ملی۔ اس طرح ایک سچا کھرا اور تلخ تجزیہ کرنے کے بعد ہی ہم اس قابل ہوسکیں گے کہ مستقبل کے لیے بہتر لائحہ عمل بنائیں۔

Marfat.com

تیسواں باب

سیکولرزم کا ایشو

سیکولرزم کی کلاسیکل تعریف یہ ہے کہ ''سیاست وحکومت میں مذہب کا کوئی عمل دخل نہ ہواور مذہب انسان کے صرف شخصی عقیدے تک محدود ہو''۔ گویا اس تعریف کے مطابق مملکت کے اجتماعی اداروں اور آئین میں مذہب کا کوئی کردار نہیں ہونا چاہیے۔

سیکولرزم کی اصطلاح سب سے پہلے ہولی اوک نامی انگریز نے 1846 میں وضع کی تھی۔ بہت جلد یہ ایک تحریک بن گئی اور پورے مغرب نے اسے بحیثیت قدر اختیار کرلیا۔ مغرب کی دیکھا دیکھی بے شمار دوسرے ممالک نے بھی اسے ایک بنیادی اصول کی حیثیت سے اختیار کرلیا۔ ظاہر ہے کہ جب ایک تصور آگے بڑھ کر مملکت کے ایک ستون کی شکل اختیار کر لیتا ہے تو اس کے کئی شیڈز یا اظہار یا تعبیریں بن جاتی ہیں۔ چنانچہ آج کل کی دنیا میں اس کی دو بڑی تعبیریں ہیں۔ اس کا پہلا اظہار امریکہ اور برطانیہ کا سیکولرزم ہے۔ ان دونوں ممالک میں ہر مذہب کا احترام کیا جاتا ہے۔ عام لوگوں کو اپنے مذہب پر عمل درآمد میں سرکاری طور پر پوری آسانیاں فراہم کی جاتی ہیں۔ مثلاً سکولوں میں مسلمان طلبہ کو حلال خوراک فراہم کی جاتی ہے۔ برطانیہ کے ان سرکاری سکولوں میں، جہاں مسلمان طلبہ وطالبات کی ایک خاص تعداد موجود ہو، وہاں ان کے لئے اسلامیات پڑھانے کا انتظام بھی کیا جاتا ہے۔ سکولوں کے اندر بچے اپنے مذہبی شعائر کے مطابق لباس پہن کر آسکتے ہیں۔ مثبت طور پر ریاست وحکومت کے معاملات میں مذہب کو ایک خاص حد تک دخیل بھی ہونے دیا جاتا ہے، مثلاً ڈالر پر لکھا جاتا ہے۔ "In God we trust"۔ صدر امریکہ کی حلف برداری کی تقریب میں پروردگار اور یسوع مسیح سے دعا بھی مانگی جاتی ہے۔ تاہم باقی آئین وقانون کو مذہب سے علیحدہ رکھا جاتا ہے۔ آئینی طور پر امریکہ کا کوئی سرکاری مذہب نہیں۔

Marfat.com

بھارتی سیکولرزم بھی درحقیقت اسی کی ایک شاخ ہے۔ بلکہ اس میں تو اکثریت کی دل آزاری روکنے کی خاطر بعض ایسے قوانین بھی نافذ کیے گئے ہیں جو اپنی اصل کے اعتبار سے مذہبی ہیں۔ مثلاً بھارت میں گائے ذبح کرنے پر پابندی ہے۔ اس کے لیے یہ جواز پیش کیا جاتا ہے کہ گائے ذبح کرنے سے عوام کے ایک بڑے طبقے کی دل آزاری ہوتی ہے۔

سیکولرزم کی دوسری تعبیر کی مثال فرانس ہے۔ کسی حد تک جرمنی اور اٹلی بھی اس راستے پر آگے جارہے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے تک ترکی میں بھی سیکولرزم کی یہی شکل تھی۔ اس سیکولرزم کو ''مذہب مخالف سیکولرزم'' کہا جاسکتا ہے کیونکہ اس سیکولرزم میں ہر نمایاں اجتماعی مذہبی علامت کو سیکولرزم سے متصادم سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً فرانس کے سرکاری سکولوں میں مسلمان لڑکیاں سر پر نقاب نہیں لے سکتیں، سکھ طلبہ پگڑی نہیں اوڑھ سکتے، عیسائی صلیب نہیں لٹکا سکتے اور یہودی اپنی مخصوص ٹوپی نہیں پہن سکتے۔ سیکولرزم کی اس برانڈ میں اجتماعی تقریبات میں بھی مذہبی دعا وغیرہ شامل نہیں کی جاتی۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مغرب میں سیکولرزم کی مقبولیت کا اصل سبب کیا ہے۔ درحقیقت اس کی تاریخی وجہ ہے۔ ایک زمانہ تھا جب یورپ میں چرچوں نے اپنے اخراجات پورے کرنے کے لئے بہت بڑی بڑی جائیدادیں بنانا شروع کیں۔ رفتہ رفتہ ملک کی اکثر اہم اور قیمتی جائیدادوں پر ان کا قبضہ ہوگیا۔ ان جائیدادوں کے انتظام نے انہیں حکومت کا چسکا لگادیا اور پادریوں نے ہر جگہ حکومتوں کے اندر حکومتیں قائم کرلیں۔ ان کی اپنی عدالتیں تھیں اور ان کے اپنے جیل خانے تھے۔ کہیں تو وہ اتنے طاقتور ہوگئے کہ ان کی مرضی کے بغیر حکومت ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتی تھی اور کہیں صورت یہ پیدا ہوگئی کہ چرچ اور حکومت ایک دوسرے کے بالکل مقابلے میں آگئے۔ واضح رہے کہ پادری یہ سب کچھ اپنے بل بوتے پر کرتے تھے، اس لئے کہ عیسائیت میں کوئی نظامِ سیاست یا فوجداری قانون ہی نہیں۔ چنانچہ جب حکومتیں اس صورت حال سے عاجز آگئیں تو اہلِ کلیسا کے خلاف جگہ جگہ بڑے آپریشنز کا آغاز کردیا گیا اور یہ فیصلہ کردیا گیا کہ ان

Marfat.com

چرچوں کو آئندہ عدالت لگانے، جیل بھجوانے اوراس طرح کے کوئی اختیارات حاصل نہیں ہوں گے۔ وہ اپنے چرچ کے اندر جو وعظ وتبلیغ چاہیں کریں لیکن چرچ سے باہران کو کوئی اختیار حاصل نہیں ہوگا۔ تمام جائیدادوں اور جرائم کے فیصلے حکومت کرے گی، نہ کہ پادری۔ چونکہ یورپ میں پادری اور مذہب ایک ہی چیز کے دو نام تھے اس لئے اصول یہ بنایا گیا کہ مذہب اور حکومت ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ ہیں اور مذہب (مطلب مذہبی لوگ یعنی پادریوں) کو امورِ مملکت میں دخل دینے کی بالکل اجازت نہیں ہوگی۔

یہاں ہمارے سامنے دوسرا سوال آتا ہے کہ اسلام اور سیکولرزم کہاں کہاں ایک دوسرے سے مختلف اور کن جگہوں میں متفق ہیں۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو اسلام مسلمانوں کی ہر حکومت سے چند متعین مطالبات کرتا ہے۔

O۔ یہ کہ حکمران خود بھی نماز کی پابندی کریں اور عام لوگوں کو بھی اس کی طرف توجہ دلائیں۔

O۔ یہ کہ وہ زکواۃ کی وصولی اور مستحقین تک اس کے پہنچانے کا انتظام کریں۔

O۔ چند جرائم کی متعین سزائیں ہیں جن کے نفاذ کی طرف اس حکومت کو ایک تدریج کے ساتھ، کچھ شرائط کو پورا کرتے ہوئے بڑھنا چاہیئے۔

O۔ اس مملکت میں بدکرداری، سود، جوا، اور شراب نوشی بھی جرم تصور ہو۔

درج بالا چاروں نکات میں اسلام اور سیکولرزم ایک دوسرے سے بالکل مختلف مقام پر کھڑے ہیں۔ ایک سیکولر حکومت کا یہ کام نہیں کہ وہ نماز وزکواۃ کی حوصلہ افزائی اور سود کی حوصلہ شکنی کرے۔ اسی طرح وہ اپنے آپ کو اس امر کا پابند نہیں بنا سکتی کہ کچھ جرائم کے لئے ایک مذہب کی مقرر کردہ سزاوؤں (تدریج اور چند شرائط ہی کے ساتھ ہی سہی) کی طرف پیش قدمی کرے۔ اسی طرح آج کسی سیکولر حکومت میں زنا بالرضا اور شراب نوشی پر پابندی نہیں۔

اسلام اور سیکولرزم کے نظامِ حکومت اور نظامِ اخلاق میں کئی امور مشترک بھی ہیں۔ مثلاً

Marfat.com

دونوں مذہبی رواداری، برداشت، مکالمے، جمہوریت، مساوات انسانی، انصاف، دیانت اور پرامن بقائے باہمی پر یقین رکھتے ہیں۔ کیونکہ یہ سب امور انسانیت کی مشترکہ میراث ہیں۔

اب ہمیں اس سوال کا جائزہ لینا ہے کہ اگر پاکستان کو ایک سیکولر ملک بننا ہے تو اس کے لئے بنیادی شرائط کیا ہیں؟ ظاہر ہے کہ اس کی بنیادی شرط یہ ہے کہ پاکستان کے آئین کو الف سے ے تک تبدیل کر دیا جائے۔ مملکت کے سرکاری مذہب کی حیثیت سے اسلام کے نام کو ختم کر کے یہ کہا جائے کہ مملکت کا کوئی مذہب نہیں ہوگا۔ آئین کے اندر بیسیوں اسلامی دفعات کو ختم کر دیا جائے، صدر اور وزیراعظم کے حلف نامے تبدیل کر دئے جائیں۔ سارے عوامی نمائندوں کے حلف نامے بھی تبدیل کر دیا جائیں۔ اور اسی طرح ملک کے نظام عدالت میں بنیادی تبدیلیاں لائی جائیں۔

بلا تامل یہ کہا جاسکتا ہے کہ پاکستان کے معروضی حالات میں ان تبدیلیوں کا تصور بھی ناممکن ہے بلکہ اس کی طرف پہلا قدم اٹھانا بھی ناممکن ہے۔ اس لئے اس خیال یا خواہش یا خدشہ کہ پاکستان کبھی ایک سیکولر ریاست بن جائے گا، کی کوئی بنیاد موجود نہیں۔ اگر کوئی یہ خواہش رکھتا ہے تو اسے یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ اس کے لئے یہ کوئی زرخیز زمین نہیں ہے۔ اسی طرح اگر کوئی گروہ اس خدشے کا اظہار کرتا ہے کہ فلاں فلاں اقدامات کی وجہ سے اس ملک کو سیکولرزم پر لے جانے کا راستہ ہموار ہو رہا ہے، تو یہ محض ایک سیاسی بیان تو ہو سکتا ہے لیکن اس سے آگے اس کے کوئی معنی نہیں ہیں۔

اب ہمیں اس سوال کا جائزہ لینا ہے کہ ایسا کیوں ہے کہ کچھ لوگ جو اپنی ذاتی زندگی میں صوم وصلواۃ کے بہت پابند ہیں، وہ اپنے آپ کو سیکولر قرار دیتے ہیں۔ اس راقم کے خیال میں اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ اپنی ذہنیت کے اعتبار سے خالص جمہوری مزاج کے حامل ہیں۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ اسلام کے نام پر طالبانائزیشن بھی کی جاتی ہے، جبرواستبداد کا بازار بھی گرم کیا جاتا ہے، عدم برداشت کا رویہ اپنایا جاتا ہے اور انسانی ضمیر سے متصادم قوانین نافذ کئے جاتے ہیں۔

Marfat.com

دوسری طرف وہ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ دین کی تشریح پر بھی عموماً ایسے ہی لوگوں کی اجارہ داری ہے، تو وہ خیال کرتے ہیں کہ ان کے لئے واحد پناہ گاہ سیکولرزم ہی رہ جاتی ہے۔ چنانچہ یہ لوگ اپنی زندگی میں تو دین پر عمل پیرا ہوتے ہیں لیکن یہ پاپائیت کے خوف سے سیاسی پہلو میں سیکولرزم کی پیروی کرتے ہیں۔

اس عاجز کے خیال میں یہ صحیح رویہ نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فی الوقت اسلام کی دو سیاسی تعبیریں موجود ہیں۔ ایک وہ تعبیر ہے جس میں استبداد، آمرانہ روئے، جبر پر مبنی قوانین اور عدم برداشت کو اس کے مظہر کے طور پر پیش کیا جاتا ہے لیلن اس کے بالمقابل ایک دوسری تعبیر بھی ہے جس میں جمہوریت، رواداری، آزادئ ضمیر اور مکالے کو اسلام کی بنیادی اقدار سمجھا جاتا ہے۔ اسے اسلام کی ''انسان دوست یا معتدل تعبیر'' کہا جا سکتا ہے۔ چنانچہ مناسب طریقہ تو یہ ہوگا کہ ایسے جمہوری لوگ سیاست میں سیکولرزم کا نام لینے کے بجائے اسلام کے انسان دوست اور معتدل تعبیر کے علم بردار بن کر کھڑے ہوں۔ عالم اسلام میں ایسے اہل علم کی کمی نہیں جو اسی تعبیرِ اسلام کے داعی ہیں۔

ان جمہوری لوگوں کا دوسرا مخمصہ (Concern) یہ ہے کہ غیر مسلموں پر اسلامی سزائیں کو نافذ کرنا انسانی ضمیر اور مذہبی آزادی کے منافی ہے۔ چنانچہ ان کے خیال میں اس کا حل سیکولرزم میں ہی پوشیدہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اسلام کی معتدل تعبیر کے مطابق غیر مسلموں پر اسلامی سزائیں نافذ نہیں ہو سکتیں، بلکہ اُن کو اختیار ہے کہ وہ اِس معاملے میں اپنے لیے خود قانون سازی کر لیں۔

آخر میں اس راقم کو اس سوال کا بھی جائزہ لینا ہے کہ کیا پختونوں میں سیکولرزم پر مبنی رویہ پنپ سکتا ہے۔ دراصل پختونوں کے اجتماعی مظاہر دو ہیں۔ ایک حجرہ اور دوسرا مسجد۔ ان دونوں کے اختلاط اور توازن نے ہی پختون معاشرے کو رواداری اور برداشت کا حسین چہرہ عطا کیا ہے۔ یہاں کی سیاست میں صرف حجرے کے علم بردار کو وقتی کامیابی ہی مل سکے گی۔ اسی طرح

Marfat.com

صرف مسجد پر تکیہ کرنے والے کو بھی اجتماعی زندگی میں ایک محدود وقت ہی کے لئے کوئی کردار مل سکتا ہے۔ یہاں پائیدار سیاست وہی ہو سکتی ہے جس میں حجرہ اور مسجد دونوں کو یکساں اہمیت دی جائے۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس خطے کے جمہوریت پسند لوگ دین کے معاملہ میں ایک مثبت پوزیشن کے ساتھ معاشرے میں کھڑے ہوں اور خم ٹھونک کر انسان دوست تعبیر دین کے علم بردار بن جائیں۔

Marfat.com

اکتیسواں باب

اپنی غلطیوں کا اعتراف کیجئے

انسان خطا کا پتلا ہے اور اُس سے اپنے زندگی میں بے شمار خطائیں اور غلطیاں سرزد ہوتی ہیں۔ ان خطاؤں کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جن کا تعلق بندے اور خدا کے درمیان ہے۔ ان خطاؤں کو سامنے لانے کی ضرورت نہیں۔ لیکن دوسری طرح کی خطائیں وہ ہیں جن کا تعلق کسی انسان کی جان، مال اور آبرو سے ہوتا ہے۔ یعنی کسی انسان کے ہاتھوں کسی دوسرے انسان کو کوئی تکلیف پہنچی ہوتی ہے۔ ان میں وہ غلطیاں بھی شامل ہیں جو کسی فرد یا جماعت کے غلط فیصلوں کی وجہ سے پوری قوم کی تکلیف کا باعث بنتی ہیں۔ اس دوسری قسم کی غلطیوں کا واضح اور ببانگ دہل اعتراف کرنے کی ضرورت ہے، خصوصاً وہ غلطیاں جو ذمہ داری کے کسی منصب پر رہتے ہوئے سرزد ہو جائیں۔

ہمارے ہاں اس طرح کی غلطیوں کو جماعتی رازوں کے نام پر چھپا دیا جاتا ہے۔ بسا اوقات یہ کہا جاتا ہے کہ اگر ہم نے غلطیوں کا اعتراف کرلیا تو اس سے عوام میں ہمارا تاثر (Impression) مجروح ہو جائے گا۔ یہ دلیل بالکل غلط ہے، کیونکہ سب لوگ جانتے ہیں کہ انسانوں میں کوئی فرشتہ نہیں ہوتا جس سے کبھی کوئی غلطی سرزد ہی نہ ہو۔ غلطی کا اعتراف دوسروں کی نگاہوں میں انسان کی عزت کو بڑھا دیتا ہے، اس لیے کہ سب کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اگر اس شخص سے کوئی غلطی ہو جائے تو یہ اُس پر جما نہیں رہے گا، بلکہ اُس کا اعتراف کرے گا اور آئندہ کے لیے اُس سے بچنے کی کوشش کرے گا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن وحدیث اس ضمن میں حضورؐ کے زمانے کے سارے حالات بلا کم و کاست ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ قرآن وحدیث میں کسی کی اجتماعی غلطیوں پر پردہ نہیں ڈالا گیا بلکہ ہر چیز کو بالکل کھول کر بیان کر کے اُس کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ پھر ان تمام باتوں کو قرآن وحدیث میں قیامت تک کے لیے محفوظ کر کے ہمیں بتا دیا گیا کہ اجتماعی غلطیوں

Marfat.com

کا واضح اعتراف انتہائی ضروری ہے۔ان کا تجزیہ بھی ضروری ہے اور آئندہ کے لیے ان غلطیوں سے اجتناب بھی ضروری ہے۔

بدقسمتی سے امت مسلمہ کے اندر پچھلے کئی سو برس سے اپنی غلطیوں کے اعتراف کی ذہنیت کا فقدان رہا ہے۔دور کیوں جایئے خود اپنے ملک ہی کو دیکھ لیجئے۔ ہماری ملٹری اسٹیبلشمنٹ نے کتنی بھیانک غلطیاں کی ہیں جن کا ملک وقوم کو خمیازہ بھگتنا پڑا۔لیکن آج تک ان میں سے کسی نے غلطی کا اعتراف نہیں کیا گیا۔یہی حال ہماری سیاسی پارٹیوں کا ہے۔تقریباً ہر سیاسی پارٹی سے ماضی میں فاش غلطیاں سرزد ہوئی ہیں۔لیکن سوائے مسلم لیگ (ن) کے اور کسی گروہ نے اپنی غلطیوں کا اعتراف نہیں کیا، بلکہ وہ سب اپنے سابقہ کرتوتوں کے لیے ہر وقت کوئی نہ کوئی جواز پیش کرتے رہتے ہیں۔مسلم لیگ (ن) نے بھی اپنی سابقہ غلطیوں کا کوئی واضح اعتراف اور تجزیہ نہیں کیا بلکہ مجمل طور پر صرف اتنا کہا کہ ہم میں سے ماضی میں غلطیاں ہوئی ہیں جن کا ہم مستقبل میں اعادہ نہیں کریں گے۔ظاہر ہے کہ اس طرح کا مجمل اعترافی بیان بہت ناکافی ہے۔

یہ راقم بھی اپنی اجتماعی زندگی میں کئی اہم ذمہ داریوں پر فائز رہا ہے۔اجتماعی زندگی میں کی جانے والی سب سے بڑی غلطی کا اعتراف اس راقم نے 20 دسمبر 2004ء میں شائع ہونے والے ایک کالم میں یوں کیا:

''میری زندگی کا سب سے بڑا گناہ اور جرم آج سے اکتیس برس قبل اُس وقت مجھ سے سرزد ہوا تھا جب میں مردان کالج سٹوڈنٹس یونین کا صدر تھا۔اُس وقت قانون یہ تھا کہ کالج آنے والے طلبہ سے بس میں نصف کرایہ وصول کیا جائے گا۔کئی کنڈکٹر اس کی پرواہ نہیں کرتے تھے اور میرے پاس شکایت آجاتی تھی۔ان کے مداوا کے لئے ٹرانسپورٹ یونین والوں سے کئی بار رابطہ کیا مگر شکایات کا سلسلہ جاری رہا۔ایک دن یونین عہدیداروں نے یہ فیصلہ کیا کہ مردان آنے اور جانے والی تمام بسوں کو کالج میں اس وقت تک یرغمال بنایا جائے گا جب تک وہ اس ضمن میں حتمی وعدہ نہ کرلیں۔چنانچہ طلبہ سڑکوں پر پھیل گئے۔اور تقریباً سو بسوں کو یرغمال بنالیا گیا۔قبضہ دو تین

Marfat.com

گھنٹے جاری رہا حتیٰ کہ ڈی سی، ایس پی اور ٹرانسپورٹروں کے عہدیداروں نے ہمیں لکھ کر دے دیا کہ آئندہ وہ طلبہ سے آدھا کرایہ وصول کریں گے۔ اس وقت مردان کے ڈی سی جہانزیب خان تھے جو کچھ دن پیشتر اللہ کو پیارے ہو چکے۔

چند دن تو ہم سب فتح کے نشے میں سرشار رہے لیکن پھر مجھے ایک احساسِ جرم نے آن لیا۔ میں اکثر اوقات سوچتا تھا کہ اُس دن میری وجہ سے کتنے مریضوں کو تکلیف ملی ہوگی، کتنے سرکاری ملازمین بروقت اپنی ڈیوٹی پر نہیں پہنچے ہوں گے اور کتنے لوگوں کے انتہائی ضروری کاموں کا ہرج ہوا ہوگا۔ میں سوچتا تھا اس دن سینکڑوں، ہزاروں لوگوں نے ''کالجیوں'' کو بددعائیں دی ہوں گی۔ اور آخری ذمہ داری تو بہرحال مجھی پر آن پڑتی تھی اس لئے کہ صدرِ انجمن تو میں تھا۔

اس دن کے بعد آج تک ہزاروں مرتبہ اس قصور کی معافی کے لئے پروردگار کے حضور گڑگڑایا ہوں، مگر ہر دفعہ جب کسی ہنگامے کی خبر سنتا ہوں تو اپنا جرم دوبارہ یاد آ جاتا ہے۔ شاید یہ احساسِ ندامت کبھی میرا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ آج سے پانچ برس قبل مجھے ایک میڈیکل ٹسٹ کے لئے پشاور جانا تھا۔ میرے پتے میں بلا کا درد تھا۔ پبی کے قریب کالج کے طلبہ نے سڑک بلاک کی ہوئی تھی۔ ایک ایک لمحہ مجھ پر قیامت کا گزر رہا تھا مگر اُس وقت بھی میں یہ سوچ رہا تھا کہ کبھی میں نے بھی اسی طرح لوگوں کو تکلیف میں مبتلا کیا تھا۔

بہت بعد میں جب بھرپور مطالعے اور سلگتے ہوئے سوالات کا سامنا کرنا پڑا تو معلوم ہوا کہ اس معاملے کا صرف یہی ایک پہلو نہیں ہے کہ عامتہ الناس کو زحمت ہوتی ہے، بلکہ اس کا سب سے بڑا نظریاتی پہلو یہ ہے کہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لینا مطلقاً منع ہے۔ مقصد خواہ کتنا ہی اچھا ہو، مطالبات خواہ کتنے ہی جائز ہوں، اگر اُن کو منوانے کے لئے قانون کو اپنے ہاتھ میں لیا جائے تو اس سے فساد برپا ہو جاتا ہے، ذہنیت بگڑ جاتی ہے اور سوسائٹی میں لاقانونیت کا دور دورہ ہونے لگتا ہے۔ اپنے آزاد ملک اور اپنے قانون کو تو خیر بات ہی کیا ہے، تجربات نے صاحبانِ حکمت کو سکھا دیا کہ دورِ غلامی میں بھی قانون کا احترام ضروری ہے۔ جدوجہدِ آزادی بھی صرف وہ کامیاب ہوتی

Marfat.com

ہے جو خالصتاً عدم تشدد کی بنیاد پر ہو۔ اس سے استثناء ایک ہے، وہ یہ کہ اگر کسی صریح غیر اسلامی کام کا حکم دیا جائے مثلاً شراب پینے کا حکم دیا جائے تو اس کی پابندی ضروری نہیں۔

ہم جو کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان میں رہ رہے ہیں، جہاں ہمیں کسی غیر اسلامی کام کا حکم دینے والا کوئی قانون درپیش نہیں، جو ہمارا اپنا پیارا وطن ہے، جس کا ہر ذرہ ہمارے پاس امانت ہے، وہاں کوئی متشددانہ کاروائی تو گناہ کبیرہ ہے۔

چنانچہ جب میں نے پڑھا کہ اسلامیہ کالج پشاور کے طلبہ نے ہنگامہ آرائی کی ہے، توڑ پھوڑ کی ہے کچھ قابل اعتراض نعرے بھی لگائے ہیں، اور اپنے مطالبات منوانے کے لئے تشدد کا سہارا لیا ہے تو اپنا پرانا وقت یاد آ گیا اور جی چاہا کہ ان سے کہوں کہ ہمارے عظیم قائدین محمد علی جناح، باچا خانؒ، مولانا مودودی اور مولانا حسین احمد مدنی نے تو جدوجہدِ آزادی میں بھی ہمیشہ عدم تشدد سے ہی کام لیا۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کے جانشینوں کے جانشین ہم جیسے ناخلف ہوئے، جب کہ متشددانہ کاروائیوں پر ہماری پیٹھ ٹھونکی گئی اور ہمیں شاباش دی گئی۔ میر نے کیا خوب کہا تھا

کل پاؤں میرا کاسۂ سر پر جو آ گیا
یک سر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر
میں بھی کبھو کسو کا سرِ پُرغرور تھا۔

چنانچہ آج جب میں پچاس برس کا ہو چکا ہوں، میرے چار بچے عاقل و بالغ طلبہ وطالبات ہیں، اپنے نظریات کے غیر مبہم بیان کی ہر قیمت ادا کر رہا ہوں، سارے طلبہ وطالبات مجھے اپنے بچوں ہی کی طرح لگتے ہیں۔ میں اپنے بچوں کو یہ سمجھانا چاہتا ہوں کہ آپ کا استاد اور آپ کا ہر پروسٹ آپ کا روحانی باپ ہے۔ اگر میں اپنے بچوں کو نماز عشاء کے بعد باہر جانے کی اجازت نہیں دیتا، تو ایک پرنسپل یہ حکم دے کر درحقیقت اپنا فرض پورا کر رہا ہے۔

پیارے بچو! اپنے آزاد ملک کے اندر قانون کی پابندی صرف حکمتِ عملی نہیں بلکہ عقیدہ

Marfat.com

ہے۔ تشدد کا سہارا گناہِ کبیرہ ہے۔ یقیناً آپ کے بہت سے مطالبات صحیح بھی ہوں گے لیکن ان کو منوانے کے لئے پرامن راستے بھی موجود ہیں۔ عرض داشت لکھ لیجئے، مذاکرات کر لیجئے، ہم جیسے لوگوں سے کہئے، سیاسی اکابرین کو اپنے مطالبات پہنچایئے۔ امید ہے اس طریقے سے کچھ مطالبات تو مان ہی لئے جائیں گے۔ اور اگر کچھ مطالبات نہ بھی مانے گئے تو کیا ہوا۔ مشکلات کے ساتھ جینے کا ڈھنگ ہی تو ایک انسان کو صیقل بناتا ہے۔

پیارے بچو! تعلیمی ادارے میں داخلہ دراصل ایک معاہدہ ہے۔ اس معاہدے کے ذریعے طالب علم یہ وعدہ کرتا ہے کہ ہر استاد و منتظم اس کا روحانی باپ ہوگا، اس کا اہم ترین کام اپنی پڑھائی کی طرف توجہ ہوگا، اور وہ کالج کے نظم و نسق کی پوری پابندی کرے گا۔ تعلیمی ادارے کے اندر ایک طالب علم کا سب سے بڑا فرض اس معاہدے کو لفظ و معنی کے ساتھ پورا کرنا ہے۔

پیارے بچو! میں برسوں پر محیط اپنے احساسِ ندامت کا بوجھ کچھ کم کرنے کی خاطر یہ کالم لکھ رہا ہوں۔ ممکن ہے میرے گناہ کی تلافی کی کوئی صورت نکل آئے۔ میں آپ سے یہ توقع رکھتا ہوں کہ آئندہ آپ ہمیشہ پرامن رہیں گے، تشدد سے کبھی کام نہیں لیں گے اور قانون کی پابندی کریں گے۔"

Marfat.com

بتیس واں باب

سازش تھیوری

پاکستان کے اکثر لوگوں کے خیال کے مطابق ہر جگہ امت مسلمہ اور پاکستان کے خلاف سازشیں ہو رہی ہیں۔ عام لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ ہمارے ہاں یہاں آنے والی ہر تبدیلی اور ہر واقعہ کسی نہ کسی بین الاقوامی سازش کا نتیجہ ہے۔ ویسے تو سازش تھیوری (Conspirancey) کی یہ سوچ ساری دنیا میں کسی نہ کسی درجے میں موجود ہے۔ تاہم پاکستان میں یہ سب سے زیادہ ہے۔ امت مسلمہ کے دوسرے ممالک میں بھی یہ سوچ موجود ہے۔ جب کہ باقی دنیا میں یہ سوچ نسبتاً بہت کم ہے۔ گفتگو اور بحث کے دوران میں یہ سازش تھیوری عجیب وغریب رُخ اختیار کرتی ہے۔ مثلاً بہت سے لوگوں کے نزدیک پچھلے تیس چالیس برس سے پاکستان کے اندر جتنی بھی تبدیلیاں اور انقلابات آئے ہیں، ان سب کے پیچھے امریکہ کا ہاتھ ہے۔ مثلاً امریکہ ہی عوامی لیگ اور پیپلز پارٹی کو برسر اقتدار لایا تھا تاکہ اس ملک میں اسلامی قوتوں کو توڑا جا سکے۔ بھٹو کو امریکہ نے ہی ہٹایا تھا اور ضیاء الحق کو بھی امریکہ ہی لایا تھا۔ اس کے بعد ضیاء الحق کو امریکہ ہی نے مارا، اور پھر نواز شریف اور بے نظیر بھٹو کو امریکہ ہی وقتاً فوقتاً اقتدار میں لایا۔ پرویز مشرف کو بھی امریکہ ہی اقتدار میں لایا۔ حتیٰ کہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آزاد کشمیر میں آنے والا زلزلہ بھی دراصل امریکہ کے ایک زیر زمین ایٹمی دھماکہ کی وجہ سے تھا۔

سازش تھیوری کی اس گفتگو میں مزید دلچسپی اور گرما گرمی اُس وقت پیدا ہو جاتی ہے جب دو مختلف پارٹیوں کے لوگ مل بیٹھ کر ایک دوسرے سے بحث کرتے ہیں۔ اس بحث میں ہر فرد مخالف پارٹی کے لیڈر کو امریکہ اور آئی ایس آئی کا ایجنٹ قرار دینے پر تلا بیٹھا ہوتا ہے۔ مثلاً ایسی ہی کسی بحث کے دوران میں نواز لیگ کے کارکن کا استدلال یہ ہوگا کہ امریکہ نواز شریف کو ایٹم بم کی سزا دینا چاہتا تھا، اس لیے اُس نے قاضی حسین احمد کے ذریعے نواز شریف کے خلاف تحریک چلائی

Marfat.com

تا کہ پرویز مشرف کو اقتدار میں لایا جا سکے۔ اس کے بالکل برعکس دوسرے فرد کا موقف یہ ہوگا کہ نواز شریف کو دونوں مرتبہ امریکہ ہی اقتدار میں لایا تھا۔ غرض یہ کہ اسی طرح یہ بحث چلتی رہتی ہے۔ پاکستان کے بہت سے لوگوں کے خیال میں نائن الیون کی کاروائی بھی امریکی حکومت نے خود کی ہے، تا کہ بن لادن پر اُس کا الزام لگا کر افغانستان میں فوجی مداخلت کر سکے۔

یہ تھیوریاں دراصل جذباتی ذہن کی پیداوار ہوتی ہیں۔ جب کسی انسان یا گروہ کے پاس حالات کو بدلنے کی طاقت نہ ہو، لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ جلد از جلد کوئی نتیجہ دیکھنے کے لیے بے تاب ہو تو اپنے ذہن کو مطمئن کرنے کے لیے وہ سازش تھیوری کا سہارا لیتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے ذہن کو سمجھا لیتا ہے کہ چونکہ ہمارا مقابلہ کچھ انتہائی خفیہ طاقتوں کے ساتھ ہے، اس لیے ہم کامیاب نہیں ہو رہے۔ چونکہ یہ جذباتیت ہمارے ہاں بہت زیادہ ہے، اس لیے یہاں ہر فرد سازش تھیوری ہی کی زبان میں بات کرتا نظر آتا ہے۔

سازشوں کی تھیوریاں اُس ذہن میں پروان چڑھتی ہیں جو سطحی ہو اور جس کے خیال میں اُس کے اپنے اندر کوئی بڑی خامیاں موجود نہیں ہیں۔ یہ تھیوریاں انسان کو اس کی اپنی خامیاں کی طرف متوجہ ہونے سے غافل کر دیتی ہیں۔ پھر اُس کا دھیان اپنی کمزوریوں کا تجزیہ کرنے اور اُس کے مداوا کرنے کی طرف نہیں جاتا، بلکہ وہ ہر وقت سازشوں کا تانا بانا بُننے اور اُس پر سوچ بچار میں اپنے آپ کو مصروف رکھتا ہے۔

سازش تھیوریوں کو بیان کرنے اور اُن پر سوچ بچار کرنے میں ایک بڑی لذت بھی ہے۔ کیونکہ یہ تھیوریاں ایک سنسنی خیز ڈرامے سے بہت مشابہت رکھتی ہیں۔ ان کے ذریعے انسان کی قوتِ پرواز فوراً وائٹ ہاؤس، ڈاؤننگ سٹریٹ اور خاد، موساد اور را کے مراکز تک چلی جاتی ہے۔ انسان سمجھتا ہے کہ اُس کے عالمِ خیال کی رسائی بُش کے ذاتی کمرے تک رہے۔ ایسی سوچ بڑی رنگین، لذیذ اور نشہ آور ہوتی ہے۔ اس سوچ کی لذت ہیروئن کی نشے جیسی ہوتی ہے۔ جب انسان اس میں مبتلا ہو جاتا ہے تو پھر وہ انہی تصورات میں اپنے آپ کو گم کر دیتا ہے۔

Marfat.com

سازش تھیوری دراصل حقائق سے فرار اور شکوک وشبہات کے خیالات (Paranoid thinking) کی دنیا میں زندہ رہنے کا نام ہے۔ جب انسان اس سوچ کا رسیا بن جائے تو پھر وہ اپنے آپ کے علاوہ ہر دوسرے فرد کو شک وشبہے کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اُس کے خیال میں دوسرا فرد کسی بین الاقوامی سازش کا آلہ کار ہوتا ہے۔ وہ ہر کسی کو کسی خفیہ طاقت کا کارندہ اور ایجنٹ سمجھنے لگتا ہے۔ اس کا نتیجہ ذہنی انتشار اور غلط تجزیے کی صورت میں نکلتا ہے۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں طاقتور ملک نوے فیصد کام علی الاعلان کرتے ہیں۔ یقیناً وہ سازشیں بھی کرتے ہیں۔ لیکن اُن سازشوں کے پیچھے بھی اصل اہمیت اُن کی طاقت کی ہوتی ہے۔ ان سازشوں کا حصہ پانچ دس فیصد سے زیادہ نہیں ہوتا، اور ان کی کامیابی کا اصل وجہ سازش کی قوت نہیں ہوتی بلکہ سازش کرنے والے کی اپنی قوت ہوتی ہے۔ اگر امریکہ، مغرب اور اسرائیل کے پاس علم، سائنس اور ٹیکنالوجی کی قوت نہ ہو تو ان کی سازش کامیاب نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ اصل اہمیت اس بات کی نہیں کہ ہم ان کی سازشوں پر سوچ بچار کریں اور معموں کی طرح اُن کو حل کرنے بیٹھ جائیں۔ اس کا اصل حل یہ ہے کہ ہم جمہوریت، انصاف اور ٹیکنالوجی کی منزل تک پہنچنے میں اپنا خون پسینہ ایک کردیں۔ جب ایک دفعہ ہم ان تینوں میدانوں میں کسی نہ کسی درجے میں معیار مطلوب کو حاصل کرلیں گے، اور جب ہم مقابل طاقتوں کے مقابلے میں کچھ نہ کچھ قوت حاصل کرلیں گے تو ان کی تمام سازشیں دھری کی دھری رہ جائیں گی۔

غیر ترقی یافتہ دنیا، بشمول اُمت مسلمہ وپاکستان کے اندر تبدیلیاں اکثر اوقات اپنی اندرونی حرکیات (Dyanamics) اور تضادات کی وجہ سے آتی ہیں۔ کوئی خفیہ سازش ان تبدیلیوں کی وجہ نہیں بنتی۔ البتہ جب یہ تبدیلیاں وقوع پذیر ہو چکتی ہیں، تب مغرب انہیں اپنے فائدے کے لیے استعمال کرنے والا پلان مرتب کرلیتا ہے۔ اور اُن کا پلان ہماری کمزوریوں کی وجہ سے کامیاب ہو جاتا ہے۔

جمہوریت، انصاف اور ٹیکنالوجی کی سمت میں پیش قدمی کا راستہ دشوار گزار بھی ہے اور

Marfat.com

صبر آزما بھی ہے۔ چونکہ ہم لوگ ہمیشہ شارٹ کٹ کی تلاش میں ہوتے ہیں، اس لیے اس صبر آزما راستے پر چلنے کے بجائے سازش تھیوریوں کی آبیاری کر کے اپنے آپ کو مطمئن کرتے ہیں اور اپنے قوتِ عمل کو یہ کہہ کر سُلا دیتے ہیں کہ ہمارے اندر تو کوئی خامی نہیں ہے، اگر اغیار ہمارے خلاف سازشیں نہ کرتے تو آج ہم دنیا کی سپر پاور ہوتے۔ چنانچہ سوچ کی ہیروئن کی یہ ڈوز (Dose) پی کر ہم ایک دفعہ پھر اصل تجزیہ بھول جاتے ہیں اور اس لذت آفریں نشے کے تحت جذباتی سیاسی نعرے لگانے لگتے ہیں۔

Marfat.com

تینتیس واں باب

یہ تیاری کا وقت ہے

ہر انسان اپنی ذاتی زندگی میں اس حقیقت کو جانتا ہے کہ کوئی بھی کام کرنے سے پہلے تیاری بہت ضروری ہے۔ کیونکہ اگر پوری تیاری کے بغیر کوئی اقدام کیا جائے تو وہ اقدام نتیجہ خیز نہیں ہوتا۔ بلکہ بسا اوقات الٹ نتائج اور شکست کا عنوان بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سارے صاحبانِ عقل ہر کام سے پہلے ایک پورا نقشہ بناتے ہیں، پھر اس کے مطابق تیاری کرتے ہیں، اور جب پوری تیاری مکمل ہو جاتی ہے تو تب اقدام کرتے ہیں۔

یہی طرزِ عمل قوموں کے لیے بھی صحیح ہے۔ قوموں اور ریاستوں کے لیے بھی یہ لازم ہے کہ وہ ہمیشہ ایک طویل المیعاد منصوبہ بندی کریں اور پھر اُس کے مطابق تیاری کریں۔ اگر کسی قوم نے پوری تیاری کے بغیر کوئی کام شروع کیا تو اُس کا نتیجہ اُس قوم کی شکست کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

یورپ میں چھاپے خانے کی ایجاد کے بعد ان قوموں نے پوری تیاری کی اور اس کے بعد اپنے عزائم کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کاروائی کی۔ چنانچہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہے۔ پہلے انہوں نے بے شمار ملکوں کو فتح کیا اور وہاں اپنی حکومتیں مستحکم کر دیں۔ اس کے بعد جب ان کو اپنی مجبوریوں اور حالات کے دباؤ کے تحت ان ملکوں سے نکلنا پڑا تو ان ملکوں کی معیشت کو اپنا غلام بنا لیا۔ چنانچہ آج بھی عالم اسلام کا بہت بڑا حصہ معاشی طور پر مغرب کا غلام ہے۔

اس کے بالکل برعکس امت مسلمہ کی پچھلے تین سو برس کی تاریخ اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ مسلمانوں نے نہ اپنی کمزوری کا تجزیہ کیا، نہ اُس تجزیے کے مطابق تیاری کی، بلکہ بغیر تیاری کے، اشتعال کے عالم میں اقدام کر ڈالا۔ چنانچہ ایسے ہر اقدام کا وہی نتیجہ ہوا جو قانون قدرت کے تحت ہونا چاہیے تھا۔ مسلمانوں کو شکستوں پر شکستیں ہوتی رہیں، اور ہر شکست کے بعد لیڈروں

Marfat.com

نے ان کی ہمت بندھائی کہ اس دفعہ تو کچھ افراد کی غداری کی وجہ سے شکست ہوگئی لیکن آئندہ فتح ہمارا انتظار کر رہی ہے۔ پچھلے کئی برسوں میں ہماری پے در پے شکستیں دراصل تیاری کے بغیر اقدام کا نتیجہ ہیں۔ اب اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ شکستوں کے اس گھن چکر (Vicious circle) سے نکلیں، تو یہ ضروری ہے کہ ہم پہلے پوری طرح تیاری کریں اور اس کے بعد اقدام کریں۔ ایسا ہی اقدام نتیجہ خیز ثابت ہوسکتا ہے۔

حضورؐ نے اپنی ساری زندگی میں اسی اصول پر عمل فرمایا۔ فتح مکہ اس کی سب سے بڑی مثال ہے۔ اُس موقع پر حضورؐ نے مکے پر حملے کے لیے اتنی بڑی فوج بنالی جو مکے کی پوری آبادی سے زیادہ تھی۔ پھر اس کے بعد ایک انتہائی خفیہ سفر کے ذریعے مشرکین کو عین اُس وقت جالیا جب وہ بالکل غافل تھے۔ حالانکہ یہ وہ زمانہ تھا جب مدینے سے دس ہزار افراد کی فوج کو مکہ پہنچتے پہنچتے کئی ہفتے لگ جاتے تھے اور یہ بہت مشکل تھا کہ اس پورے سفر کو اس طرح خفیہ رکھا جائے کہ دشمن کو کانوں کان بھی خبر نہ ہو۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بغیر کسی خون خرابے کے مکہ پرامن طور پر فتح ہوگیا۔

آج امت مسلمہ کے لیے بھی یہ تیاری کا مرحلہ ہے۔ تیاری کے اس مرحلے کو مکمل کیے بغیر کوئی اقدام کرنا دشمن کے مفاد میں ہوگا اور ہمارے ملک اور امت کے لیے شکست کا پیغام ہوگا۔ تیاری کا یہ مرحلہ جتنا وقت بھی چاہے لے لے، لیکن جب تک ہم دوسری طاقتوں کے مقابلے میں تیاری کے اعتبار سے ایک خاص تناسب تک نہیں پہنچ جاتے، تب تک ہمیں اقدام سے پرہیز کرنا چاہیے۔ پشتو کی ایک ضرب المثل کا ترجمہ یہ ہے کہ اگر تم نے سو سال بعد بھی اپنی شکست کا بدلہ لے لیا، تو یہ تم نے جلدی لے لیا، گویا اگر تیاری کے مرحلے میں سو سال بھی گزر جائیں تو یہ کوئی غلط بات نہیں۔ غلط بات یہ ہے کہ تیاری سے پہلے اقدام کیا جائے۔

Marfat.com

چونتیس واں باب

عمل اور ردِ عمل۔ ردِ عمل کی نفسیات

اکثر اوقات مختلف اقوام اپنے کسی جذباتی اقدام کے لیے یہ جواز پیش کرتی ہیں کہ یہ اقدام دراصل دشمن کے فلاں اقدام کا ردِ عمل ہے۔ ردِ عمل کے اس جواز کے ذریعے وہ اپنے لوگوں کو ابھارنے کی کوشش بھی کرتی ہیں اور ایک غلط کام کے لیے وجہ فراہم کرنے کی بھی سعی کرتی ہیں۔ دنیا کی پچھلی تاریخ کا مطالعہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ ردِ عمل کے تحت کیا گیا ہر فوری اقدام اُس قوم کے لیے تباہ کن ثابت ہوا ہے۔

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ عمل کے مقابلے میں فوری ردِ عمل ایک طبعی قانون (Physical Law) ہے۔ اس کے مقابلے میں انسان کے لیے روحانی قانون (Spiritual Law) یہ ہے کہ عمل کے مقابلے میں صبر اور ٹھنڈے دل و دماغ سے کام لیا جائے، پھر بالکل غیر جذباتی انداز میں سارے حالات کا تجزیہ کیا جائے، اور وہی قدم اٹھایا جائے جو دستیاب حالات میں قوم کی زندگی کے لیے مناسب ہو۔ دشمن کے کسی اقدام کے نتیجے میں غصہ، جذباتیت اور فوری اشتعال کے تحت ردِ عمل ظاہر کرنا کسی قوم کے طویل المیعاد مفادات کے بالکل خلاف ہوتا ہے اور قوم کو اُس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔

مسلمان قوم اس ردِ عمل کی نفسیات میں بُری طرح گرفتار ہے۔ دشمن کے ہر اقدام کے جواب میں ہم ایک فوری ردِ عمل کا اظہار کرتے ہیں۔ چونکہ ہمارے اقدام کے پیچھے پوری تیاری نہیں ہوتی، اور ہم نے یہ تجزیہ بھی نہیں کیا ہوتا کہ ہمارے اقدامات کی کامیابی یا ناکامی کے نتیجے میں کیا ہوگا، اس لیے یہ اقدامات اُلٹ نتائج پیدا کرتے ہیں، یعنی Counter Productive ہوتے ہیں۔ اس کی ایک مثال خودکش حملے ہیں۔ ان خودکش حملوں نے اسرائیل، امریکہ اور بھارت کو کوئی بڑا نقصان نہیں پہنچایا، البتہ ان حملوں کو جواز بنا کر ان ملکوں نے

Marfat.com

مسلمانوں کے خلاف بہت سے طویل المیعاد اقدامات کر ڈالے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان ملکوں نے اپنی پروپیگنڈا مشینری کے ذریعے دنیا کے عام انسانوں کو اپنے حق میں کر لیا۔ چنانچہ ظالم اور مظلوم کا فرق ختم ہو گیا۔ مثلاً دنیا کے بے شمار لوگ اسرائیل کو ظالم سمجھتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ان خودکش حملوں کو بھی غلط سمجھتے ہیں۔ چنانچہ اس سے فلسطینیوں کی جدوجہد کے اخلاقی پہلو کو بڑا نقصان پہنچا۔

ہمارے اکثر رہنما ردعمل کی نفسیات کے تحت عوام کے جذبات کو گرم کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔ ان تقاریر اور نعروں کی وجہ سے مسلمانوں میں ایک وقتی اشتعال، ہیجان اور غیض وغضب پیدا ہو جاتا ہے، وہ سوچتے ہیں کہ ہمیں بدلہ لینے کے لیے فوری طور پر کچھ کرنا چاہیے۔ جب بدلہ لینے کے لیے ان کو دشمن نہیں ملتا تو اسی اشتعال کی تسکین وہ بے معنی توڑ پھوڑ کی شکل میں کرتے ہیں، جیسا کہ توہین آمیز کارٹونوں کے خلاف مظاہروں میں پشاور، کراچی اور لاہور میں ہوا، جہاں اپنے ہی لوگوں کی اربوں روپے کی مالیت کے سامان کو تباہ و برباد کیا گیا۔

اس کے بجائے اصل ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان قوم کو فوری ردعمل کی نفسیات سے نکال کر ایک مسلسل 'احساس زیاں' یعنی اپنے نقصان کا شعور دیا جائے اور اسے بتایا جائے کہ ہر مسئلے کا حل صبر و استقامت میں پوشیدہ ہے۔ جب تک ہم دشمن کے مقابلے کے لیے پوری طرح تیار نہیں ہوں گے، تب تک ہر فوری ردعمل ہمارے لیے مزید بڑی نقصان کا باعث ہوگا۔ اقبال نے کیا خوب کہا تھا:

تو نے پوچھی ہے امامت کی حقیقت مجھ سے
حق تجھے میری طرح صاحب اسرار کرے
ہے وہی تیرے زمانے کا امام برحق
جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے
دے کے احساس زیاں تیرے لہو گرما دے
فقر کی سان چڑھا کر تجھے تلوار کرے

Marfat.com

حضورؐ کی ساری زندگی ہمیں فوری ردعمل کے کسی شائبے سے بھی خالی لگتی ہے۔ بارہا ایسا ہوتا تھا کہ مسلمان اشتعال میں آجاتے تھے، مگر حضورؐ ہمیشہ صبر کی تلقین کرتے تھے۔ جب کی دور میں حضرت یاسرؓ اوران کی اہلیہ کو ابوجہل نے انتہائی ظالمانہ طریقے سے شہید کرلیا، تو حضورؐ اُن کے اہل خانہ کے پاس تشریف لے گئے اور اُن سے ارشاد فرمایا "اے آلِ یاسر، اس ظلم کے بدلے میں تمہیں جنت کی بشارت دیتا ہوں"۔ اُس وقت اگر حضورؐ چاہتے تو فوری ردعمل کی نفسیات کے تحت ایک خفیہ مسلح گروہ تشکیل دے کر ابوجہل سے بدلہ لے سکتے تھے، لیکن چونکہ ایسا اقدام مسلمانوں کے مجموعی مفاد کے خلاف ہوتا، اس لیے حضورؐ نے سب کو صبر کی تلقین کی، حتیٰ کہ کئی برس بعد وہ وقت آگیا جب ابوجہل کو اپنے کیفرِ کردار کو پہنچا دیا گیا۔

جنگ احزاب بھی اس کی ایک مثال ہے۔ فوری ردعمل کی نفسیات کے تحت تو سب سے اچھا طرزِ عمل یہ ہوتا کہ دشمن سے دوبدو لڑائی کی جاتی۔ اگر فتح نصیب ہوجاتی تو کیا کہنے، اور اگر سب مسلمانوں کو شہادت نصیب ہوجاتی تو جنت میں جانے کے لیے سب کو شارٹ کٹ مل جاتا۔ لیکن چونکہ اُس وقت دشمن سے لڑائی مول لینا مسلمانوں کے مفاد میں نہیں تھا اس لیے حضورؐ اور صحابہ کرامؓ نے خندق کھود کر گویا مدینہ کو قلعہ بند کرلیا۔ اُس موقعے پر دشمن مسلمانوں کو یہ طعنے دیتے کہ تم خندق کے پیچھے چھپ گئے ہو، پھر اُن کو غیرت دلاتے کہ آؤ میدان میں آکر ہمارا مقابلہ کرو۔ لیکن مسلمان ان کی چال میں نہ آئے۔ اس کے بعد جب دشمن اپنے دلوں کی جلن لیے واپس لوٹ گیا تو یہی موقع تھا بنی قریظہ کو اُس کی غداری کی سزا دینے کا۔ چنانچہ اس یہودی قبیلے کو اس کی غداری کو قرار واقعی سزا دی گئی۔

فوری ردعمل سے بچنے کی ایک اور مثال صلح حدیبیہ ہے۔ اس موقعے پر سب اہل ایمان نے حضورؐ کے ہاتھ پر بیعت کی اور اگر لڑائی کی نوبت آجاتی تو یقیناً مسلمانوں کو فتح نصیب ہوتی۔ لیکن اس فتح کا ایک بڑا نقصان یہ ہوتا کہ مسلمانوں پر یہ الزام لگتا کہ ان لوگوں نے حرم میں خون خرابہ کیا ہے، یوں سرزمین عرب کے باقی لوگ اسلام قبول کرنے سے رُک جاتے۔ چنانچہ جوں ہی

Marfat.com

یہ محسوس ہوا کہ دشمن صلح پر آمادہ ہے تو حضورؐ نے اللہ کے حکم کے تحت، صلح پر آمادگی ظاہر فرمائی۔ صلح نامے کی شرائط بظاہر مسلمانوں کے خلاف تھیں اور ان سے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے مسلمان دب کر صلح کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرامؓ کی بہت بڑی اکثریت ان شرائط پر دل ہی دل میں بہت ناراض اور غمگین تھی۔ لیکن حضورؐ جانتے تھے کہ اس صلح کے نتیجے میں مسلمانوں کو یہ موقع ملے گا کہ وہ سرزمین عرب کے ہر گوشے میں بلا خوف وخطر جا کر اسلام کی دعوت لوگوں کو پیش کر سکیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ اس بظاہر دب کر کی جانے والی صلح کو قرآن مجید نے 'فتح مبین' یعنی ایک واضح کامیابی قرار دیا۔ بعد کے واقعات نے یہ ثابت کر دیا کہ ایسا ہی ہوا۔ جب مسلمانوں کو صلح وامن کا ایک وقفہ میسر آیا تو اگلے دو برس کے اندر اتنے زیادہ لوگوں نے اسلام قبول کر لیا جتنا اس سے پہلے سولہ سترہ برس میں نہیں ہو سکا تھا۔ گویا اس طریقے سے حضورؐ نے فوری ردعمل سے بچتے ہوئے دشمن سے اُس کی من مانی شرائط پر امن کا وقفہ خرید لیا۔ حضورؐ کا یہ اسوہ حسنہ ہر وقت ہمارے سامنے رہنا چاہیے۔

ہمارے لیے اصل راستہ صبر اور غیر جذباتی روش کا ہے۔ مقابل قوتوں کے ہر جارحانہ اقدام کے جواب میں ہمیں مزید جاں فشانی کے ساتھ جمہوریت انصاف اور سائنس وٹیکنالوجی کے حصول پر توجہ مرکوز رکھنی چاہیے۔ جب ان میدانوں میں ہم ایک خاص معیار تک پہنچ جائیں گے تو مقابل طاقتوں کو ہمارے خلاف کسی جارحانہ اقدام کا حوصلہ ہی نہیں رہے گا۔

Marfat.com

پینتیس واں باب

کون مخلص ہے

ہمارے ملک میں دوسروں کی نیتوں پر حملہ کرنا ایک عام رواج بن گیا ہے۔ ''فلاں شخص دشمن کا ایجنٹ ہے''، ''فلاں گروہ سی آئی اے اور یہودیوں کا پروردہ ہے''، ''فلاں شخص مغرب سے مرعوب ہے اس لیے ایسی باتیں کر رہا ہیں''، ''فلاں شخص یہ سب کچھ اپنے ذاتی مفاد کے لیے کر رہا ہے اور اُس کی نیت بالکل خراب ہے'' اس طرح کے فقرے اور تبصرے ہمارے ہاں عام سنائی دیتے ہیں۔ ہم لوگ کسی کی دلیل کی طرف توجہ نہیں دیتے بلکہ اُس کی نیت کو مدار ٹھہرا کر اُس کی بات رد یا قبول کرتے ہیں۔ حالانکہ نیت کا علم صرف اللہ کو ہے۔ اس دنیا میں ہم کسی کے متعلق یہ نہیں کہہ سکتے کہ اُس کی نیت اچھی ہے یا خراب۔ اسی لیے ہمارے دین نے ہمیں سب کے بارے میں عموماً حُسنِ ظن سے کام لینے کا حکم دیا ہے۔ کسی کی نیت کے متعلق فتویٰ لگانا ایک خاص مفہوم میں اپنے آپ کو خدائی کے درجے پر فائز کرنا ہے۔ گویا یہ ایک غلط رویہ ہے۔

جب کسی فرد یا گروہ کے پاس کسی بات کا مدلل جواب نہیں ہوتا تو وہ اس کی نیت پر حملے کرتا ہے اور اُس کو غیر مخلص ٹھہراتا ہے۔ اس طرح یہ کوشش کی جاتی ہے کہ لوگ اُس سے متنفر ہوں اور اُس کے دلائل پر کان نہ دھریں۔ اس کے مقابلے میں صحیح رویہ یہ ہے کہ کسی کی نیت کے تجزیے کی کوشش نہ کی جائے بلکہ اُس کے دلائل پر غور وفکر کیا جائے۔ اگر اُس کی دلیل مضبوط ہے تو اُس کی بات ماننے کی قابل ہے، اور اگر اُس کی دلیل کمزور یا غلط ہے تو اُس کی بات قابلِ رد ہے۔ نیتوں کا حال صرف اللہ جانتا ہے۔ دنیا میں وہی فرد یا گروہ کامیاب ہے جو دلیل کی بنیاد پر فیصلہ کرتا ہے۔

ایک صحیح بات کو ماننے میں انسان کے سامنے بنیادی طور پر دو ہی رکاوٹیں پیش آتی ہیں، ایک تعصب اور دوسری نفسانی خواہشات۔ تعصب کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو اپنے گروہ سے اتنی محبت ہو جاتی ہے کہ پھر وہ ہر دوسری بات کی طرف سے اپنی آنکھوں، کان اور دل کو بند کر لیتا ہے۔

Marfat.com

یا وہ فیصلہ کر لیتا ہے کہ اگر مجھے کہیں سے صحیح بات مل جائے تو تب بھی میں اُسے نہیں مانونگا، کیونکہ یہ بات میری قوم، پارٹی، جماعت یا خاندان کے خلاف جارہی ہے۔ ایسا تعصب انسان کو انصاف کی صفت سے محروم کر دیتا ہے۔ یہ انسانیت کے لیے زہر قاتل ہے۔

دوسری بڑی رکاوٹ ذاتی نفسانی خواہشات ہیں۔ ایسا انسان یہ سوچتا ہے کہ اگر میں نے صحیح بات مان لی تو میری قیادت اور سرداری کو نقصان پہنچے گا یا میری دولت میں کمی ہو جائے گی۔ چنانچہ وہ ایک صحیح بات کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگاتا ہے اور اس کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا دیتا ہے۔ یہ رویہ دنیا میں انسان کی اجتماعی اور انفرادی ترقی کے راستے میں ایک بڑی رکاوٹ ہے اور آخرت کے لحاظ سے بھی خسارے کا سودا ہے۔

کچھ لوگوں کے اندر دو مزید ذہنی رویے پائے جاتے ہیں، ایک غصہ اور دوسرا جذباتیت۔ غصہ اور جذباتیت انسان کو صحیح اور غلط کام میں تمیز سے محروم کر دیتے ہیں اور ایسے لوگ عموماً غلط اقدامات اٹھاتے ہیں، یعنی ایسے اقدامات جو امن کو تہہ و بالا کر دیں۔

انسانی ضمیر اور سارے مذاہب کی یہ متفقہ ہدایت ہے کہ انسان کو ہر وقت انصاف کی بات پر قائم رہنا چاہیے۔ حتیٰ کہ اپنے دشمن کے معاملے میں بھی انصاف کے راستے سے کبھی نہیں ہٹنا چاہیے۔ جذباتیت کے بجائے انسان کو ہر وقت ٹھنڈے دل و دماغ سے کام لینا چاہیے۔ اسی کو صبر کہتے ہیں۔ صبر کے رویے کے ساتھ کیے گئے فیصلے عموماً دیرپا اور مضبوط ثابت ہوتے ہیں۔

اس دنیا میں ذاتی تربیت کا مشکل ترین کام گروہی تعصب اور ذاتی خواہشات سے بلند ہو کر انصاف کے مقام پر فائز ہونا ہے۔ ذاتی تربیت کا یہ کام بہت بڑی مشق اور صبر چاہتا ہے۔ لیکن اگر انسان اپنے آپ کو مسلسل یہ یاد دلاتا رہے کہ اُسے تعصب سے اوپر اٹھنا ہے، تو ایک وقت ایسا آجاتا ہے جب اُس کی سوچ پوری طرح انصاف کے تابع بن جاتی ہے۔ شیطانی قوتیں انسان کو تعصب اور گروہی و ذاتی مفادات کی طرف بلاتی ہیں، جب کہ رحمانی طاقتیں اُسے مسلسل انصاف کا راستہ اختیار کرنے کی تلقین کرتی ہیں۔

Marfat.com

اگر کوئی انسان اس دنیا میں کوئی مثبت کام کرنا چاہتا ہے، انسانیت کو فائدہ پہنچانا چاہتا ہے اور اپنی آخرت بہتر کرنا چاہتا ہے تو اُس کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ انصاف پر مبنی سوچ کی طرف مسلسل اپنی کوشش جاری رکھے۔ یہ چند دنوں کا کام نہیں ہے بلکہ برسوں کی ذہنی مشقت، جدوجہد اور ریاضت کے ذریعے ہی اس مقصد کو حاصل کیا جا سکتا ہے، اور پھر اس مقصد کو قائم رکھنے کی جدوجہد تو انسان کو ساری زندگی کرنی چاہیے۔ یہی کامیابی کا اصل راستہ ہے۔

Marfat.com

چھتیسواں باب

اقبال کی شاعری

اقبال شاعرِ مشرق ہے، حکیم الامت ہے، ترجمانِ حقیقت ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ہمارے دلوں میں بستا ہے۔ تقریباً سارے پاکستانیوں کی طرح اس راقم کا پسندیدہ ترین شاعر اقبال ہی ہے۔ اقبال نے اپنے زمانے کے مسلمانوں کو جگایا اور اُن کے تن مردہ میں ایک نئی روح پھونک دی۔ انہوں نے مسلمانوں کو احساس وشعور دیا اور اپنی شاعری کے ذریعے ایک ایسا کارنامہ انجام دیا جس کی نظیر نہ اس سے پہلے اُردو زبان میں مل سکتی ہے اور غالباً آئندہ بھی کبھی نہیں مل سکے گی۔ اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعے قوم کو ایک پیغام دیا، اُن کو بڑی بڑی حقیقتوں سے روشناس کرایا اور انسانی زندگی کے اہم ترین مسائل کا حل اُن کے سامنے رکھا۔ اقبال کے بے شمار اشعار لافانی اہمیت کے حامل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو زبان میں اقبال پر جتنا کچھ لکھا گیا ہے، اُس کا عشرِ عشیر بھی کسی دوسرے کے متعلق تحریر نہیں کیا گیا۔

اقبال نے مسلمانوں کو زیاں اور بہت کھونے کا احساس دیا اور اُن کو عمل پر آمادہ کیا۔ بلادِ اسلامیہ، خطاب بہ نوجوانِ اسلام، شمع اور شاعر، خضرِ راہ، طلوعِ اسلام، مسجدِ قرطبہ اور اسی طرح اُن کی بے شمار نظمیں اور غزلیں اس کی آئینہ دار ہیں۔ اقبال نے کہا اور کیا خوب کہا:

؎ اسی قرآن میں ہے اب ترکِ جہاں کی تعلیم\
جس نے مومن کو بنایا مہ و پرویں کا امیر\
'تن بہ تقدیر' ہے آج ان کے عمل کا انداز\
تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر\
تھا جو نا خوب، بتدریج وہی خوب ہوا\
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

Marfat.com

اسی طرح اُس نے کہا:

اور یہ اہلِ کلیسا کا نظامِ تعلیم
ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف!
اس کی تقدیر میں محکومی و مظلومی ہے
قوم جو نہ کرسکی اپنی خودی سے انصاف!
فطرت افراد سے اغماض بھی کرلیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف!

اسی طرح اقبال نے کوشش اور جدوجہد کی اہمیت کا احساس دلاتے ہوئے کہا:

جو عالم ایجاد میں ہے صاحب ایجاد
ہر دور میں کرتا ہے طواف اُس کا زمانہ

غرض یہ کہ اقبال کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ تاہم اقبال کی شاعری میں کچھ کمزور پہلو بھی موجود ہیں، جن کا ادراک نہایت ضروری ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُنہی کمزور پہلوؤں سے تعلق رکھنے والے چند اشعار زبان زدِ عام ہیں، اور اُن کی وجہ سے اقبال کا اصل پیغام آنکھوں سے اوجھل ہونے کا اندیشہ ہے۔ بعض موقعوں پر، لگتا ہے کہ، اقبال خود بھی جذباتیت کا شکار ہو گئے۔ آخر وہ انسان تھے، پیغمبر تو نہیں تھے۔ ایسے ہی جذبات کے عالم میں اُنہوں نے کہا:

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

حالانکہ یہ بات واضح ہے کہ مومن کے لیے بھی سامانِ جنگ کی اُتنی ہی ضرورت ہے جتنی کسی اور کے لیے ہے۔ ہاں، اس سامانِ جنگ کے ساتھ مومن کا عزم اور صبر شاملِ حال ہو جائے تو پھر کوئی بھی اُس کے مقابلے میں ٹھہر نہیں سکتا۔

Marfat.com

اقبال کی شاعری کا ایک اور کمزور پہلو عقل اور عشق کا موازنہ ہے۔ ان اشعار میں دراصل اقبال نے عقل کے لفظ کو سمجھوتہ کرنے والی ذہنیت (Comprominsing mind) کے لیے استعمال کیا ہے اور عشق کو عزم (Dedication) کے لیے استعمال کیا ہے۔ ایک سادہ لفظ کو اپنے اصل معنی سے اٹھا کر کوئی اور معنی پہنانا صحیح نہیں ہے اور یہ بات بھی صحیح نہیں ہے کہ (Comromising mind) ہمیشہ غلط ہوتا ہے۔ تاہم اقبال نے کہا:

پختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش ہو عقل
عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی
بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

درج بالا دونوں اشعار اپنے معنی کے اعتبار سے صحیح نہیں ہیں۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ انسان کو ہمیشہ عقل سے کام لے کر پوری سوچ بچار کرنی چاہیے اور پھر جس فیصلے تک وہ پہنچ جائے، اُس پر پورے عزم کے ساتھ عمل کرنا چاہیے۔ عقل اور عزم ایک دوسرے کے مخالف نہیں ہیں بلکہ ایک دوسرے کے مدد اور معاون ہیں، یعنی ایک دوسرے کو Complement کرتے ہیں۔ اقبال نے دوسرے شعر میں جو دلیل دی ہے، وہ بھی صحیح نہیں ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نمرود کی بڑھکائی ہوئی آگ میں خود تو نہیں کودے تھے، بلکہ اُن کو تو آگ میں بزور پھینکا گیا تھا۔ اگر نمرود اپنی فوج کو ان کو آگ میں پھینکنے کا حکم نہ دیتا تو حضرت ابراہیمؑ خود کبھی آگ میں نہ کودتے۔ بدقسمتی سے یہ غلط مفہوم والا شعر لوگوں کو بہت یاد ہے۔

اسی طرح اقبال نے علم اور عشق کو بھی ایک دوسرے کے مخالف کے طور پر پیش کیا ہے۔ یہ بھی صحیح نہیں ہے۔ علم ہی کی وجہ سے تو انسان اشرف المخلوقات بنا ہے۔ علم ہی انسان کو عزم عطا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علم اور عقل کے الفاظ قرآن مجید میں سینکڑوں مرتبہ آئے ہیں، اور قرآن نے انسان کو متوجہ کیا ہے کہ وہ علم اور عقل سے کام لے۔ لیکن اقبال نے کہا:

Marfat.com

؎ علم نے مجھ سے کہا عشق ہے دیوانہ پن!

عشق نے مجھ سے کہا علم ہے تخمین و ظن!

بندۂ تخمین و ظن! کرمِ کتابی نہ بن!

عشق سراپا حضور، علم سراپا حجاب!

حالانکہ علم، تخمین و ظن کا نام نہیں بلکہ حقیقت کی جستجو اور اُس کو دریافت کرنے کا نام ہے۔ علم کسی چیز پر پردہ نہیں ڈالتا بلکہ پردہ اٹھاتا ہے۔ علم حاصل ہونے کے بعد ہی عزم کا مرحلہ آتا ہے۔

اقبال کی شاعری کا چوتھا کمزور پہلو جمہوریت کے خلاف اُن کے بعض اشعار ہیں۔ مثلاً انہوں نے کہا:

گریز از طرز جمہوری، مریدِ پختہ کارے شو

کہ از مغزِ دو صد خر، مغز انسانی نہ مے آید

اسی طرح اقبال نے کہا:

جمہوریت ایک طرز حکومت ہے کہ جس میں

جس میں بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

یہ دونوں اشعار مساوات انسانی کے خلاف ہیں۔ پہلے شعر میں یہ مثال دی گئی ہے کہ دو سو گدھوں کا دماغ مل کر بھی ایک انسان کے دماغ کے برابر نہیں ہو سکتا۔ یہ بات اپنی جگہ پر صحیح ہے لیکن اسے جمہوریت کے خلاف ایک دلیل کے طور پر پیش کرنا غلط ہے، کیونکہ جمہوریت میں انسانوں کا واسطہ گدھوں سے نہیں انسانوں سے ہی پیش آتا ہے۔ یہی حال دوسرے شعر کا ہے۔ اس شعر میں دی گئی دلیل بذاتِ خود صحیح ہے، لیکن اس کو جمہوریت کے خلاف بطور ثبوت پیش کرنا غلط ہے، کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ امور مملکت کے حوالے سے کسی کے اوصاف کو تولنے کے لیے کوئی پیمانہ ممکن ہی نہیں۔ آخر خلوصِ نیت، عزم، قوتِ تجزیہ، مسائل کے حل کی صلاحیت اور اندرونی

Marfat.com

علم کو کس طرح تولا جا سکتا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ جمہوریت نے ایک فرد ایک ووٹ کا تصور دیا تا کہ ہر انسان کے اندر خود اعتمادی پیدا ہو، اُس کی خودی کو مہمیز ملے اور وہ اپنے آپ کو اپنے ملک کے معاملات میں دخیل سمجھے۔ اقبال نے اپنی شاعری میں جمہوریت کے ان مثبت پہلوؤں پر کوئی بات نہیں کی۔

اقبال کی شاعری کے جن چار کمزور پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، خود اقبال کا اپنا طرزِ عمل بھی اس کے بالکل برعکس تھا۔ انہوں نے اپنی کتاب (Reconstruction of Religious thoughts in Islam) میں علم اور عقل ہی کو بنیاد بنایا ہے اور کہا ہے کہ اسلامی معاشرے کی جڑ اور بقا کا انحصار جمہوریت پر ہے۔ اقبال کی سیاست عدم تشدد اور قانون پسندی کی پوری طرح آئینہ دار تھی۔ انہوں نے اپنی سیاست اور اپنی زندگی میں اُس ''عشق'' سے قطعاً کام نہیں لیا جس کا پرچار انہوں نے اپنے بعض اشعار میں کیا ہے۔

اقبال کی شاعری پر اس راقم کی یہ عاجزانہ تنقید قطعاً اس غرض کے لیے نہیں ہے کہ اُن کے مقام و مرتبے کو گھٹایا جائے۔ مقصد صرف یہ ہے کہ اُن کے ہر شعر کو دلیل کے طور پر پیش نہ کیا جائے، کیونکہ ایک شاعر بعض اوقات اپنی جذباتی کیفیت اور ذہنی روئے کے زیرِ اثر ایسے اشعار بھی کہہ دیتا ہے جو اس کے اصل خیالات کے نمائندہ نہیں ہوتے۔ خود اقبال نے بھی ''مکاتیب اقبال'' میں اپنے بعض خطوط میں یہ کہا ہے کہ چونکہ میں بعض اوقات اپنے ذہنی پرواز کی وجہ سے کوئی شعر کہہ دیتا ہوں، اس لیے میرے ہر شعر کو میرے نقطۂ نظر کے طور پر نہ لیا جائے۔ اقبال کے ہاں بھی ان چار پہلوؤں میں یہی کچھ ہوا۔ ورنہ اقبال تو ایک عظیم شاعر ہے اور اُس کی عظمت کو تا قیامت تسلیم کیا جاتا رہے گا۔

Marfat.com

سینتیسواں باب

سانحہ مشرقی پاکستان

سانحہ مشرقی پاکستان اور سانحہ لال مسجد دو ایسے اجتماعی واقعات ہیں جن پر اس راقم کی آنکھوں سے بے ساختہ آنسو بہے۔ اگرچہ اجتماعی زندگی میں کئی سخت واقعات پیش آئے لیکن ان دونوں واقعات کے صدمے کا رنگ ہی کچھ اور تھا۔

ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے کہ پاکستان پنڈت نہرو کے ضد کی وجہ سے بنا، ورنہ قائداعظم تو کیبنٹ مشن پلانٹ کو ماننے پر آمادہ ہوگئے تھے۔ تاہم اس بات سے قطع نظر کہ 1947ء میں مسلمانانِ ہند کے حقوق کی تحفظ کے لیے کونسا فارمولا سب سے بہتر تھا، یہ ایک حقیقت ہے کہ پاکستان کے قائم ہونے کے ساتھ ہی مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا بیج بودیا گیا۔ یہ اعلان کہ صرف کراچی ہی ملک کا دارالحکومت ہوگا اور اُردو اس ملک کی واحد قومی زبان ہوگی، مشرقی پاکستان کے عوام کی احساس محرومی کی طرف پہلا قدم تھا۔ مشرقی پاکستان کے اندر جاگیردارانہ نظام موجود نہیں تھا اس لیے وہاں ووٹ بہت حد تک آزاد تھا، اور جمہوریت اور صوبائی خودمختاری کے لیے مغربی پاکستان کی نسبت مشرق پاکستان میں کہیں زیادہ جدوجہد ہوئی۔ قیام پاکستان کے بعد سیاسی محلاتی سازشوں کا جو دور شروع ہوا، اُس میں بہت بڑی اکثریت مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے سیاستدانوں کی تھی۔ مشرق پاکستان کے حصے میں چوہدری فضل حق، خواجہ ناظم الدین اور حسین شہید سہروردی جیسے بااصول سیاست دان آئے اور مغربی پاکستان کی حصے میں غلام محمد، سکندر حیات اور سکندر مرزا جیسے سیاست دان آئے۔ ایوب خان کے مارشل لاء سے مشرقی پاکستان کے باشندوں کا یہ یقین پختہ ہوگیا کہ وہ درحقیقت مغربی پاکستان کے غلام ہیں۔ اس لیے کہ نناوے فیصد فوج مغربی پاکستان پر مشتمل تھی اور سارے جرنیلوں کا تعلق مغربی پاکستان سے تھا۔ مشرقی پاکستانیوں کے اس الزام میں بھی بہت صداقت موجود تھی کہ وسائل کا رُخ مغربی پاکستان کی طرف

Marfat.com

ہے۔ظاہر ہے کہ بجٹ کا ساٹھ فیصد تو ویسے ہی فوج کی صورت میں مغربی پاکستان کے اندر خرچ ہوجاتا تھا۔یہی حال باقی بجٹ کا تھا۔رہی سہی کسر 1965ء کی جنگ نے پوری کردی، جب مشرقی پاکستان کے دفاع کے لیے سرے سے ہی کوئی فوج نہیں تھی۔درحقیقت مشرقی پاکستانیوں کی بہت بڑی اکثریت ذہنی اعتبار سے 1966ء سے ہی مغربی پاکستان سے علیحدگی کا فیصلہ کرچکی تھی۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس وقت مغربی پاکستانیوں کے نزدیک بنگالی دوسرے درجے کے شہری تھے۔اُن کے گلوں شکوؤں کا مداوا کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ایوب خان کے دور میں ملک میں وحدانی طرز حکومت قائم تھی، جس میں صوبائی خودمختاری کا کوئی حصہ نہیں تھا۔اپوزیشن کی وہ پارٹیاں جن کی جڑیں مغربی پاکستان میں تھیں،انہوں نے بھی بنگالی عوام کے دکھ درد کو سمجھنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ان میں مغربی پاکستان کی مذہبی سیاسی جماعتیں بھی شامل تھی۔

اُس وقت مغربی پاکستان میں یہ پروپیگنڈہ عام تھا کہ یہ احساسِ محرومی حقیقت پر مبنی نہیں ہے، بلکہ دراصل مشرقی پاکستان کے اندر آباد ہندو، خصوصاً اساتذہ، اس ساری تحریک کے پیچھے ہیں۔یہ پروپیگنڈہ صحیح نہیں تھا۔ ہندو اساتذہ نے اس احساس محرومی کو بڑھانے کے لیے ضرور اپنا کردار ادا کیا ہوگا،لیکن احساس محرومی کی اصل بنیادیں تو موجود تھیں۔عوامی لیگ کے لیڈر سب کے سب مسلمان تھے،اور یہ سب متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔انہی حالات میں عوامی لیگ کے صدر شیخ مجیب الرحمان نے اپنے چھ نکات پیش کیے۔اگر ان چھ نکات کو مان لیا جاتا تو پاکستان برقرار رہتا، تاہم دونوں حصوں کی پوزیشن کنفیڈریشن (Confederation) کی ہوجاتی۔ان چھ نکات کو مغربی پاکستان میں غداری کے مترادف قرار دیا گیا اور لوگوں کو یہ باور کرایا گیا کہ شیخ مجیب الرحمان غدار ہے۔

1970ء کے انتخاب میں عوامی لیگ نے مشرقی پاکستان میں چورانوے فیصد (94%) ووٹ حاصل کیے، سوائے ایک نشست کے باقی سب نشستوں پر عوامی لیگ کے نمائندے کامیاب ہوئے اور پاکستان کی پارلیمنٹ میں عوامی لیگ کو مطلق اکثریت حاصل ہوگئی۔

Marfat.com

جمہوریت کا تقاضا یہ تھا کہ عوامی لیگ کے مینڈیٹ کو مان لیا جاتا، تاہم ایسا نہیں کیا گیا۔ اُس وقت شیخ مجیب الرحمان نے یہ پیش کش کی کہ اگر مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے صوبے اپنے لیے ان چھ نکات کے علاوہ کسی دوسرے فارمولے پر متفق ہوجاتے ہیں تو انہیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ البتہ مشرقی پاکستان کے بارے میں انہی چھ نکات پر عمل درآمد ہوگا۔ اُن کی اس بات کو نہیں مانا گیا، 25 مارچ 1971ء کو مشرقی پاکستان میں فوجی کاروائی شروع کردی گئی، شیخ مجیب الرحمان کو گرفتار کردیا گیا اور مغربی پاکستان میں بھٹو نے کہا کہ خدا کا شکر ہے کہ پاکستان بچ گیا۔

یحییٰ خان کی عمومی شہرت ایک بدکار اور شرابی شخص کی تھی۔ اُس کے قریبی جرنیلوں کی بھی یہی شہرت تھی۔ سوائے عبدالولی خان کی نیشنل عوامی پارٹی کے، مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے سبھی سیاسی پارٹیوں نے اس فوجی ایکشن کا خیر مقدم کیا۔ ان میں پیپلز پارٹی، جماعت اسلامی اور مسلم لیگ شامل تھی۔ چند مہینے بعد مشرقی پاکستان میں نئے انتخابات کا ڈھونگ رچایا گیا۔ سب پارٹیوں کو اکٹھے بٹھایا گیا اور اُن کے درمیان نشستوں کی بندر بانٹ کی گئی۔ چنانچہ سب کے سب بلا مقابلہ ''منتخب'' ہوگئے۔ ان نام نہاد نشستوں میں سب سے زیادہ حصہ جماعت اسلامی کو ملا، اور باقی سب پارٹیوں کو بھی حصہ دیا گیا۔

اِدھر یہ بندر بانٹ جاری تھی اور دوسری طرف پاکستانی فوج بنگالیوں کو فتح کر کے تہہ تیغ کر رہی تھی۔ محتاط اندازوں کے مطابق مارچ 1971ء سے لے کر دسمبر 1971ء میں بنگلہ دیش کے قیام تک بارہ لاکھ بنگالیوں کو موت کے گھاٹ اتار جا چکا تھا۔ تیسری طرف یہ ہوا کہ عوامی لیگ سے تعلق رکھنے والے اکثر ارکان پارلیمنٹ بھارت میں پناہ گزین ہوگئے اور تقریباً پچیس لاکھ افراد سرحد پار کر بھارت میں مہاجر کیمپوں میں رہنے لگے۔

یہ وہ وقت تھا جب ساری دنیا بیک وقت زبان پوری طرح بنگالیوں کے حق میں تھی۔ وہاں کے قتل عام کی داستان روزانہ بھارتی اور مغربی میڈیا میں شائع ہو رہی تھی اور ساری دنیا یہ کہہ رہی تھی کہ بنگالیوں کو ان کا حق دیا جائے۔ تاہم اس موقع پر جنرل یحییٰ خان اور مغربی پاکستان میں

Marfat.com

جڑیں رکھنے والی سیاسی پارٹیوں کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ انہوں نے سب حقائق سے پوری طرح آنکھیں بند کیے رکھیں اور سمجھا کہ فوجی ڈنڈا ہی سب مسائل کا حل ہے۔

اس موقع پر بھارت نے ایک پلان بنایا، اور حقیقت یہ ہے کہ غضب کا پلان بنایا۔ سب سے پہلے کلکتہ میں مشرقی پاکستان سے تعلق رکھنے والے ارکانِ پارلیمنٹ پر مشتمل ایک عبوری جلاوطن حکومت قائم کی گئی اور تاج الدین احمد کو اُس کا صدر منتخب کیا گیا۔ اس جلاوطن حکومت کو اندرا گاندھی کی انتظامیہ نے تسلیم کرلیا۔ اس کے بعد ان دونوں حکومتوں کا آپس میں دوستی اور بنگال کو غاصبوں کے قبضے سے چھڑانے کا معاہدہ ہوا۔ اس معاہدے کے تحت مہاجر بنگالیوں پر مشتمل ایک فوج 'مکتی باہنی' کی تشکیل کی گئی اور انڈیا نے اس فوج کو تربیت دینے کی ذمہ داری لے لی۔ اس فوج میں سابقہ مشرقی پاکستان رجمنٹ سے تعلق رکھنے والے فوجی بھی شامل تھے، جن کی اکثریت سرحد پار کرگئی تھی۔ اس کے ساتھ انڈیا نے روس سے ایک دفاعی معاہدہ کرلیا جس کی رو سے روس نے اعلان کیا کہ بھارت پر کسی بھی طرف سے ہونے والے حملے کی صورت میں وہ بھارت کے مدد کے لیے آئے گا۔ گویا پورا اسٹیج سیٹ ہوگیا۔ جب ساری تیاری مکمل ہوگئی تو نومبر کے مہینے میں مشرقی پاکستان پر فوج کشی شروع کردی گئیں۔ چونکہ ساری آبادی عوامی لیگ کی حامی تھی اس لیے ہر جگہ مکتی باہنی اور بھارتی فوج کا بھرپور استقبال ہوا۔ پاکستانی فوج نے کہیں بھی کوئی قابل ذکر مزاحمت نہیں دکھائی۔ دراصل وہ کوئی مزاحمت کر ہی نہیں سکتی تھی۔ یہ فوج سو فیصد مغربی پاکستانیوں پر مشتمل تھی اور مقامی آبادی اس کو دشمن، غاصب اور ظالم سمجھتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس ایک مہینے کی نام نہاد جنگ میں پاکستانی فوج کا جانی نقصان نہ ہونے کے برابر ہوا اور ترانوے ہزار (93000) پر مشتمل فوج بھارت کی قیدی بن گئی۔ یوں 17 دسمبر 1971ء کو بنگلہ دیش کا قیام عمل میں آگیا۔

عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اس سانحے کی ذمہ داری جنرل یحییٰ، بھٹو اور شیخ مجیب پر عائد ہوتی ہے یہ بات صرف ایک حد تک ہی صحیح ہے۔ مثلاً اگر جنرل یحییٰ پارلیمنٹ کا اجلاس بلا کر عوامی

Marfat.com

لیگ کے چھ نکات کے مطابق آئین بننے دیتا تو لاکھوں افراد کے قتل عام اور اتنی بدترین شکست سے بچا جاسکتا تھا۔ یا اگر بھٹو یہ اعلان کرتا کہ وہ مشرقی پاکستان کی حد تک چھ نکات ماننے کے لیے تیار ہے اور مغربی پاکستان کے صوبے اپنے لیے اتفاق رائے سے صوبائی خودمختاری کا فارمولا طے کرلیں گے، تو اس صورت میں بھی حالات قابو میں رہتے۔ باقی رہے شیخ مجیب الرحمان تو وہ سرے سے ہی اس سانحے کے ذمہ دار نہیں تھے، اس لیے کہ اُن کا تو ایک موقف تھا جس کے پیچھے عوام کی طاقت موجود تھی۔ اور وہ تو یہی چاہتے تھے کہ مشرقی پاکستان کو اُس کے سارے حقوق مل جائیں، اور نہ ملنے کی صورت میں وہ پاکستان سے علیحدہ ہو جائے۔

اس راقم کے نزدیک مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی ذمہ داری مغربی پاکستان کی تقریباً سب سیاسی اور مذہبی جماعتوں، سب پاکستانی حکومتوں اور خصوصاً فوجی آمریتوں پر عائد ہوتی ہے۔ سوائے نیپ کے، مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے سیاسی اور مذہبی پارٹیوں نے صوبائی خودمختاری کے مطالبے کو غداری قرار دیا۔ ان پچیس برسوں میں مشرقی پاکستان کے عوام کے دکھ درد کو کسی نے سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ ایک دلخراش حقیقت ہے کہ جن پارٹیوں نے 1971ء میں مشرقی پاکستان میں البدر اور الشمس بنائی تھی اور یحییٰ خان کے آئینی خاکے کو عین اسلامی قرار دیا تھا، وہ جماعتیں اب 2007ء میں اس بچے کھچے پاکستان کے اندر صوبائی خودمختاری کی بات کررہی ہیں اور ان کے کچھ لیڈر بالکل وہی زبان بول رہے ہیں جو 1968ء میں شیخ مجیب الرحمان بولا کرتے تھے۔ لیکن ان جماعتوں نے اپنے سابقہ طرزِ عمل کا بے لاگ تجزیہ بھی نہیں کیا اور یہ اعتراف نہیں کیا کہ اُن کے ماضی کے بہت سے اقدامات غیر اصولی اور غیر حکیمانہ تھے۔

سانحہ مشرقی پاکستان سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ کثیر لسانی اور کثیر التہذیبی ملک کے اندر صوبائی خودمختاری کا سوال اُس کے لیے زندگی اور موت کی حیثیت رکھتا ہے۔ دوسرا سبق ہمیں یہ ملتا ہے کہ ملک کو صرف جمہوریت اور افہام و تفہیم پر مبنی مکالمے کے ذریعے قائم رکھا جاسکتا ہے۔ جب کہ فوجی آمریتیں علیحدگی کے جذبات کو پروان چڑھاتی ہیں۔

Marfat.com

اڑتیس واں باب

سانحہ لال مسجد

لال مسجد کا سانحہ پاکستانی تاریخ کے بہت بڑے سانحوں میں سے ایک ہے۔آخر کیوں نہ ہو، جب کہ دارالحکومت کے عین قلب میں چھ مہینے تک جاری آویزش کا ایسا بھیانک انجام ہو جس میں ایک طرف اسلام سے محبت رکھنے والے سینکڑوں مخلص ترین لوگوں نے اپنی جان، جان آفرین کے سپرد کی اور دوسری طرف پاکستانی فوج کے وہ جوان اپنی زندگیوں سے ہاتھ دھو بیٹھے جو اسلامی جمہوریہ پاکستان کے سپاہی تھے۔

لال مسجد کے سانحے کی ذمہ داری اصلاً پاکستان کی ملٹری اسٹیبلشمنٹ پر عائد ہوتی ہے۔ ضمناً اس کی ذمہ داری اُس خاص تعبیرِ مذہب پر عائد ہوتی ہے جس کی رو سے کسی اچھے مقصد کے لیے قانون کو ہاتھ میں لینا جائز بلکہ ضروری ہے۔اس سانحے کا اصل بیج سن اسی کی دہائی میں اُس وقت بویا گیا جب جنرل ضیاء الحق کے فیصلے اور امریکہ کی 'مہربانی' کی بدولت پاکستان اور باقی دنیا سے مجاہدین کو افغانستان میں لڑنے کے لیے جمع کیا گیا اور ان کو تربیت دی گئی۔اس مقصد کے لیے بے شمار مسلح تنظیمیں بنیں اور کئی لوگ بغیر کسی تنظیم کے، دین سے محبت کی خاطر، ایجنسیوں کے ذریعے اس کام میں شریک رہے۔پاکستان کے ہر کونے میں یہ سب کچھ ہوتا رہا، اسلحہ، ہیروئن، ڈالر، تنظیموں کی بنیاد پر ریاستی اختیارات، ملکی انٹیلی جنس ایجنسیاں، غیر ملکی انٹیلی جنس ایجنسیاں اور مذہبی جوش وخروش سب کچھ آپس میں گڈمڈ ہو کر رہ گیا۔ان میں پٹرو ڈالرز پر نظریں جمائے رکھنے والے بھی شامل تھے اور اس کے برعکس مخلص ترین انقلابی مذہبی افراد بھی شامل تھے۔انہی مخلص ترین افراد میں ایک اہم نام مولانا عبداللہ کا تھا، جو دارالحکومت کی ایک اہم مسجد کے خطیب تھے، جن کے اخلاص کی ایک دنیا گواہی دیتی تھی اور ان کو بجا طور پر بہت احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔

Marfat.com

افغانستان کی جنگ اپنے دوسرے تحفوں کے ساتھ ہمیں ہزاروں ایسے انقلابی مجاہدین کی ایک کھیپ بھی دے گئی جو عسکری طریقے سے تبدیلی لانے کے علمبردار تھے۔ عسکریت پسندوں کے آپس کے اختلافات بھی ہمیشہ عسکریت ہی کے ذریعے سے حل ہوتے ہیں، چنانچہ نوے کی دہائی میں ایک دن مولانا عبداللہ کو شہید کردیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ ریاستی ادارے قاتلوں کو اچھی طرح جانتے پہچانتے تھے، تاہم اُس کے دبانے ہی میں عافیت سمجھی گئی اور مولانا کے دونوں بیٹوں نے بھی یہی مناسب سمجھا کہ اس سانحے پر زیادہ زور نہ دیا جائے۔

اس کے بعد اُن کے بڑے بیٹے مولانا عبدالعزیز لال مسجد کے خطیب بن گئے اور اُن کے چھوٹے بھائی مولانا غازی عبدالرشید نائب خطیب بن گئے۔ یہ دونوں اُسی انقلابی جذبے سے سرشار تھے۔ اور اسی جذبے کی آبیاری میں دونوں انتہائی خلوص اور جان فشانی کے ساتھ مصروف رہے۔

ایک لمبے عرصے تک مقتدر قوتوں اور انقلابیوں کے درمیان اپنے اہداف اور طریقہ کار کے معاملے میں مکمل ہم آہنگی رہی۔ اس ہم آہنگی میں اصل انقطاع نائن الیون کے بعد آیا جب ان لوگوں کو امریکہ نے اپنے لیے براہِ راست خطرہ جانا۔ جب امریکی مطالبے پر پاکستانی فوج نے قبائلی علاقے میں مسلح کاروائی شروع کردی تو دونوں اطراف ایک دوسرے کے مقابلے پر آ گئے۔ اس مقابلے میں لال مسجد پوری طرح مجاہدین کا ہم نوا رہا، بلکہ وہ اُن کا مرکزی سیاسی مذہبی ترجمان بن گیا اور یہیں سے ایک مشہور فتویٰ جاری ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ اُس وقت پاکستانی ایجنسیاں بھی فکری اعتبار سے دو حصوں میں بٹ گئیں۔ ایک حصہ سابقہ تعلقات کی بنیاد پر انقلابیوں اور مسلح جدوجہد کرنے والوں کا ہمدرد رہا، جب کہ دوسرے گروہ نے عالمی پالیسی کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنے کو مناسب سمجھا۔

اس پورے عرصے کے دوران میں جامعہ حفصہ تعمیر ہوا۔ کئی دوسرے مدارس بھی تعمیر ہوئے جن کی سربراہی میں مولانا عبدالعزیز کرتے تھے۔ ان میں ہزاروں طلبہ وطالبات زیرِ تعلیم

Marfat.com

تھے نمایاں ہے کہ جہاں انقلابی سوچ ہو، وہاں اسلحہ بھی ہوتا ہے اور مسلح کارروائیوں کی پلاننگ بھی ہوتی ہے۔ ایسے ہی ایک موقع پر مولانا عبدالرشید کو حراست میں لے لیا گیا اور پھر اعلیٰ ترین حکومتی سطح کی مداخلت کے بعد چھوڑ دیا گیا۔ پھر آہستہ آہستہ وہ وقت آیا جب یہ سوچا جانے لگا کہ اس تبدیلی کو طاقت کی زور پر روبہ عمل لایا جائے۔ چنانچہ فروری 2007ء میں اس کے لیے عملی کام شروع کردیا گیا۔ باقی سب جگہوں کی طرح یہاں بھی حرکیات (Vigilantism) کی ابتدا فحاشی کے اُن اڈوں کے عملی تدارک سے کی گئی جن سے عام لوگ بھی تنگ تھے۔ ان کارروائیوں میں ایک سے زیادہ مرتبہ پولیس کے سپاہیوں کو بھی حراست میں لیا گیا اور پھر باقاعدہ گفت وشنید کے بعد تبادلے کے طریقے پر معاملہ حل کیا گیا۔ چونکہ یہ سب لوگ دیوبندی مکتب فکر سے تعلق رکھتے تھے، اس لیے دیوبندی مدارس کی تنظیم وفاق المدارس بھی درمیان میں آئی۔ وفاق المدارس کا نقطہ نظر یہ بنا کہ ریاست کے اندر ریاست بنانا اور ریاستی اختیارات کو براہ راست چیلنج کرنا غلط ہے، اور نفاذِ اسلام کے لیے جدوجہد ہمیشہ پُرامن ہونی چاہیے۔ بالآخر وفاق المدارس نے جامعہ حفصہ اور اس سے ملحقہ اداروں کو اپنی تنظیم سے خارج کردیا۔

بالآخر وہ وقت آگیا جس کا سب کو ڈر تھا۔ جولائی 2007ء میں دونوں طرف کے مسلح لوگ مقابلے پر آگئے۔ اور پھر وہ سانحہ رونما ہوا جسے وقوع پذیر نہیں ہونا چاہیے تھا۔ سلسلۂ جنبانی کے طور پر علمائے دیوبند بھی درمیان میں آئے، اور اُن سے ہمدردی رکھنے والے حکومتی لوگوں نے بھی بیچ بچاؤ کی کوشش کی۔ لیکن ایسے مواقع پر صلح کی کوشش عموماً بارآور ثابت نہیں ہوتیں، اس لیے کہ دونوں طرف کے مفادات ایک دوسرے سے بالکل الٹ اطراف میں ہوتے ہیں۔ خاک وخون کا بازار گرم ہوا اور سینکڑوں لوگوں کا خون بہا۔ اس سانحے کے بعد ملک میں خودکش حملوں کا ایک نیا سلسلہ جاری ہوا، قبائلی علاقے کے عسکریت پسندوں کی جدوجہد کو ایک نیا حوصلہ ملا۔ اس راقم کی خیال میں اس سانحے کے اثرات ایک لمبے عرصے تک محسوس کیے جاتے رہیں گے۔ باقی تمام افسوس ناک واقعات کی طرح اس سانحے میں بھی دونوں طرف سے کام آنے والے افراد

Marfat.com

مسلمان تھے۔ ایسے سب سانحوں میں اصل نقصان مسلمانوں ہی کا ہوتا ہے۔

اس سانحے سے ہمیں کئی سبق ملتے ہیں۔ پہلا سبق یہ ہے کہ ریاستی مسلح افواج کو ایک طرف رکھ کر کئی کئی پرائیویٹ عسکری تنظیمیں کھڑی کرنا ایک بھیانک غلطی ہے اور ملک وقوم کی تقدیر اور امن سے کھیلنے کے مترادف ہے۔ اس سے دشمن سے زیادہ نقصان اپنے آپ ہی کو پہنچتا ہے۔ دوسرا سبق یہ ہے کہ دین سے محبت رکھنے والے لوگوں کو کسی بھی حالت میں اسٹیبلشمنٹ کا آلۂ کار نہیں بننا چاہیے۔ طاقت کی منطق یہ ہے کہ ہمیشہ اسی گروہ کا مفاد پورا ہوتا ہے جس کے ہاتھ میں زیادہ طاقت ہو۔ اگر کسی جگہ عسکری میدان میں امریکہ اور پاکستان اکٹھے ہوں گے تو امریکہ ہی کا مفاد پورا ہوگا۔ اسی طرح اگر کسی معرکہ کارزار میں پاکستانی اسٹیبلشمنٹ اور مخلص لوگ شانہ بشانہ کھڑے ہوں گے تو پاکستانی اسٹیبلشمنٹ ہی کا مفاد پورا ہوگا۔

اس سے ہمیں یہ سبق بھی ملتا ہے کہ نفاذِ اسلام کے لیے جدوجہد کو اصلاً اور عملاً ہر اعتبار سے پرامن اور عدم تشدد پر مبنی ہونا چاہیے۔ پُرتشدد کاروائیاں ہمیشہ اسی مقصد کو پہنچاتی ہیں جسے حاصل کرنے کے لیے یہ کاروائیاں کی جاتی ہیں۔

اس سانحہ کا سب سے بڑا سبق یہ ہے کہ ملک کو اس کے چوکیدار یعنی مسلح افواج کے رحم وکرم پر بھی نہیں چھوڑنا چاہیے۔ ملک کی باگ ڈور ہمیشہ شفاف جمہوری طریقے سے منتخب ہونے والے حکمرانوں کے ہاتھ میں ہونی چاہیے۔ سیاست دان عوام کو جواب دہ ہوتے ہیں، اس لیے اپنی تمام خامیوں کے باوجود وہ بیرونی طاقتوں کے آلۂ کار بننے یا من مانے فیصلے کرنے میں ایک حد سے آگے نہیں جاسکتے۔ جب کہ اس کے برعکس اسٹیبلشمنٹ کے اندر مقتدر لوگ بالآخر کسی کے سامنے جواب دہ نہیں ہوتے۔ چنانچہ یا تو وہ اپنے ذاتی اور گروہی مفادات کی خاطر دوسروں کے آلۂ کار بن جاتے ہیں اور یا پھر اپنے مزعومہ نیک مقاصد کے حصول کی خاطر من مانے فیصلے کرنے لگتے ہیں۔

اس سانحے سے ہمیں یہ سبق بھی ملتا ہے کہ جب ریاست خود ہی لاقانونیت پر اتر آئے تو

Marfat.com

پھر اسے یہ توقع نہیں کرنی چاہیے کہ اس کے یوٹرن (u-turn) لیتے ہی سب لوگ بے چون وچراع اس کی پیروی کرنے لگیں گے۔ ریاستی لاقانونیت ہمیشہ معاشرتی لاقانونیت کو جنم دیتی ہے۔ چنانچہ ایسے تمام سانحات میں اصل ذمہ داری ان ریاستی اداروں پر عائد ہوتی ہے جنہوں نے لاقانونیت کو جنم دیا ہوتا ہے۔ البتہ ضمناً دوسرے ادارے بھی لاقانونیت کے الزام سے اپنے آپ کو بری الذمہ قرار نہیں دے سکتے، کیونکہ اصول یہ ہے کہ خواہ ایک طرف سے کتنی بھی لاقانونیت کیوں نہ ہو رہی ہو، دوسری طرف کو ردعمل میں آ کر قانون کو اپنے ہاتھ میں نہیں لینا چاہیے۔ یہ چیز انارکی، خانہ جنگی اور انتشار کو جنم دیتی ہے جس کا نتیجہ خود اس معاشرے کی تباہی کی صورت میں نکلتا ہے جس کی اصلاح کے لیے یہ سرگرمیاں کی جارہی ہوتی ہیں۔

Marfat.com

انتالیس واں باب

مصلحین (Reformers) کا کام

قرآن مجید میں سورہ توبہ میں شامل بہت سی موضوعات میں ایک موضوع یہ بھی ہے کہ جن مسلمانوں کی صحیح تربیت نہیں ہوئی، اُن کی تربیت کیسے کی جائے۔ اس کا جواب قرآن مجید نے یہ دیا کہ ہر گروہ میں سے کچھ لوگ دین کا علم حاصل کریں اور پھر اس کے بعد اپنی اپنی بستیوں میں جا کر لوگوں کی تربیت کریں۔ گویا اہل علماء کا اصل کام لوگوں کی تربیت ہے۔ اگر کسی ملک کے اہل علم اس کام کو فراموش کریں، یا اس کے بجائے دوسرے کاموں میں زیادہ دلچسپی لینے لگیں تو قوم کی صحیح تربیت نہیں ہو سکتی۔

کسی بھی قوم کے صحیح اصولوں پر قائم رہنے کا انحصار اس بات پر ہے کہ اہل علم سوسائٹی کی تربیت کے لیے کتنی کوششیں کر رہے ہیں۔ جہاں جہاں عالم اور دانشور مختلف افراد کی تربیت پر اپنی توجہ مرکوز رکھتے ہیں، وہاں سوسائٹی کا اونچا طبقہ اُن سے متاثر ہو جاتا ہے اور یوں عام لوگ بھی اُن کے نقش قدم پر چلنے لگتے ہیں۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ زندہ اور اچھے معاشرے اسی طریقے سے قائم ہوئے اور برقرار رہے۔

آج ہماری سوسائٹی کے اہل علم بدقسمتی سے دو کاموں میں پڑ گئے ہیں۔ یا تو وہ براہ راست سیاست میں حصہ لیتے ہیں، اور چونکہ ابھی اصول واقدار کے معاملے میں لوگوں کی تربیت نہیں ہوئی ہوتی، اس لیے یہ اہل علم نہ چاہتے ہوئے بھی ان تمام خرابیوں میں آلودہ ہو جاتے ہیں، جن میں ہمارے دوسرے سیاسی لوگ آلودہ ہیں۔ اس کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ اہل علم کا مقام، وقار اور ان کی باتوں کا تاثر کمزور ہو جاتا ہے۔ دوسرا کام یہ ہے کہ یہ اہل علم ہر وقت حکومت پر تنقید کرتے رہتے ہیں، ہر برائی کا ذمہ دار حکومت کو ٹھہراتے ہیں اور ہر معاملے میں حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ یوں کرے اور یوں نہ کرے۔ حکومت وسیاست کیا ہوتی ہے؟ یہ دراصل عوام کے

Marfat.com

مجموعی اخلاق و کردار کا اظہار ہوتی ہے۔ اگر عوام کی تربیت صحیح خطوط پر ہو چکی ہوتی ہے تو ان کے سیاسی رہنما بھی ان اقدار کا خیال رکھتے ہیں، ورنہ نہیں رکھتے۔ دراصل ایک سیاسی لیڈر کی یہ مجبوری ہوتی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ ووٹ حاصل کرے۔ چنانچہ ووٹوں کے حصول کے لیے وہ ہر وہ طریقہ اختیار کرتا ہے جس کا معاشرے میں چلن ہوتا ہے۔ مثلاً اگر معاشرہ بددیانت ہے، تو سیاسی لیڈر مجبور ہوتا ہے کہ اپنے ووٹوں کی تعداد بڑھانے کے لیے بددیانتی کا ذریعہ استعمال کرے۔ اگر اس کے برعکس سوسائٹی میں دیانت داری کا چلن ہو، تو سیاست دان دیانت داری پر مبنی طریقے استعمال کرتا ہے۔ عملی اور انتخابی سیاست کے ذریعے تبدیلی تب آتی ہے جب اہلِ علم نے عوام کی تربیت کا صبر آزما کام کیا ہو۔

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ عملی سیاست یا حکومت پر تنقید کوئی شجرِ ممنوعہ ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ اگر کچھ اہل علم اپنے رجحان اور ذوق کی وجہ سے عملی سیاست میں حصہ لینا چاہیں تو ضرور لیں۔ لیکن اگر سارے ہی اہل علم یہ کام شروع کر دیں تو پھر معاشرے کی تربیت کون کرے گا؟ یہی معاملہ حکومتوں پر تنقید کا ہے۔ حکومتوں پر تنقید نہایت ضروری ہے اور اُن کے سامنے اچھی تجاویز رکھنا بھی لازم ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی اُتنا ہی اہم ہے کہ عوام کو یہ بتایا جائے کہ خود وہ بھی صحیح اقدار پر عمل پیرا ہو جائیں۔ مثلاً حکومت سے یہ مطالبہ نہایت ضروری ہے کہ وہ لوگوں کو انصاف دلانے کے لیے اقدامات کرے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ عوام کو یہ بتایا جائے کہ وہ خود بھی ایک دوسرے کے ساتھ اور اپنے ساتھ انصاف کریں۔

دنیا میں معاشرتی مصلح ہی تبدیلی اور اصلاح کے نقیب بنتے ہیں۔ تاریخ ان مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ امت مسلمہ کے ننانوے فیصد علماء نے ریاستی معاملات سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہوئے عوام کی تربیت اور علم پھیلانے کا کٹھن کام کیا۔ اگر کہیں موقع ملا تو حاکم وقت کو نصیحت کر دی یا کوئی مشورہ دے دیا، لیکن اس کے علاوہ اُس سے کوئی سروکار نہ رکھا۔ ہاں، اگر کسی حاکم نے اُن کی علمی آزادی پر کوئی قدغن لگانا چاہی تو اُس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ انہی اہل علم کی وجہ

Marfat.com

سے آج امت مسلمہ قائم ودائم ہے اور اس کے اندر کچھ نہ کچھ اقدار باقی ہیں۔

ایک روایت میں یہ بیان ہوا ہے "بنی اسرائیل کی سیاست اُن کے انبیاء کرتے تھے۔ اب اس امت کی سیاست علماء کریں گے"۔ اس روایت کی بناء پر بعض لوگ کہتے ہیں کہ سیاست دراصل علماء کا کام ہے۔ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ سیاست کے لفظ کا اصل مطلب تعلیم وتربیت ہے۔ اور اس روایت میں اس لفظ کو اسی معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ دراصل حضورؐ کے سات آٹھ سو سال بعد مشہور فلسفی ابنِ خلدون نے پہلی مرتبہ اس لفظ کو ریاستی انتظام کے معنی میں استعمال کیا۔ اُس وقت سے اس لفظ کے یہ معنی مروج ہو گئے ہیں۔ ورنہ اِس سے پہلے اِس لفظ کو ہمیشہ صرف اور صرف تعلیم وتربیت ہی کیلئے استعمال کیا جاتا تھا۔

تاریخ میں کچھ ایسے سیاسی رہنماوؤں کا بھی ذکر آتا ہے جنہوں نے اپنی قوم کے کردار پر گہرا اثر ڈالا۔ اگر ان سب رہنماوؤں کے کردار اور حالات زندگی کا بغور جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ دراصل معاشرتی مصلح تھے، اور ان لوگوں نے عملی سیاست کی وقتی آلودگی سے بڑی حد تک اپنے آپ کو بچائے رکھا۔ اگر مہاتما گاندھی، مولانا مودودیؒ، باچا خان، نیلسن منڈیلا اور امام خمینی جیسے اکابرین پارلیمنٹوں کی عوامی سیاست میں حصہ لینے لگتے تو پھر وہ معاشرے پر اتنا زیادہ اثر نہ ڈال سکتے۔ دوسری طرف ایسا بھی ہوا ہے کہ انتہائی بااصول افراد نے اپنے اصولوں کی پاسداری کرتے ہوئے، سیاست میں حصہ لیا اور ناقابلِ فراموش کردار ادا کیا۔ جارج واشنگٹن، لنکن اور قائدِاعظم اِس کی مثال ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر اہل علم معاشرتی اور ریاستی اصلاح کا کام کریں تو اس کے نتیجے میں بااصول سیاسی لیڈر بھی پیدا ہوتے ہیں اور عوام بھی نسبتاً اچھے لوگوں کو منتخب کرتے ہیں۔ گویا اس طرح معاشرے کا ہر طبقہ ایک دوسرے کو سہارا دیتے ہوئے ارتقاء کے راستے پر آگے بڑھتا ہے۔ تاہم اگر معاشرتی مصلح اپنے حصے کا کام نہ کرے تو پھر ملک کے اندر اصول اور اقدار کی پاسداری کا ذہن پروان نہیں چڑھتا۔

کسی قوم کے آگے بڑھنے کے لیے اچھے سیاست دان ضروری ہیں، اور اسی طرح یہ بھی

Marfat.com

ضروری ہے کہ عوامی شعور بیدار ہو۔ یہ دونوں کام اُس وقت تک نہیں ہو سکتے جب تک کچھ اہم ترین لوگ بلحاظ مجموعی اصلاح (Reformation) کا کام انجام نہ دیں۔ آج ہماری سوسائٹی کے اندر جمہوری، منصفانہ، دیانت داری اور عدم تشدد پر مبنی روئے کی اقدار کو یوں عام کرنے کی ضرورت ہے کہ ہر فرد کے دل میں فرائض دینی کے بعد انہی اقدار کی سب سے زیادہ اہمیت ہو۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ انفرادی و اجتماعی شعور کو بیدار کیا جائے۔ یہ کام اصلاح کی ایک ہمہ گیر، مسلسل اور صبر آزما جدوجہد کے ذریعے ہی ممکن ہے۔

Marfat.com

چالیس واں باب

اپنا مائنڈ سیٹ تبدیل کیجئے

ہم پاکستانیوں کے اندر کچھ ایسی خرابیاں پائی جاتی ہیں جس کا علاج ہم میں سے ہر ایک فرد کے پاس موجود ہے۔ اُن معاملات میں اپنے آپ کو تبدیل کرنا کچھ مشکل بھی نہیں، مگر مسئلہ یہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو تبدیل کرنے پر تیار نہیں۔ مثلاً ہم قانون شکنی میں لطف محسوس کرتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ قطار نہ بنائیں، اور ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ ہر دفتر میں ہمارا کام بغیر باری کے ہو جائے۔ ہم خود تو ٹریفک کے قانون کی پروا نہ کریں لیکن اگر کوئی دوسرا ٹریفک کا قانون توڑ کر ہم سے آگے نکل جائے، اپنی طاقت کے بل پر، قطار میں ہم سے آگے کھڑا ہو جائے اور یا ہماری نسبت اُس کا کام کسی دفتر میں جلدی ہو جائے تو ہمیں بڑا غصہ آتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ دلی طور پر ہم ایک قانون شکن گروہ ہیں۔ حالانکہ یہ قانون شکنی سبھی کو نقصان پہنچاتی ہیں۔ مثلاً پاکستان میں ٹریفک کے حادثات اور ان حادثات میں ہونے والی اموات ترقی یافتہ ملکوں کی نسبت دس گنا زیادہ ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ دوسروں پر تو قانون لاگو ہو، مگر ہماری ذات اس سے مستثناء رہے۔ حالانکہ ہم صرف اُسی صورت میں ایک منظم قوم کی حیثیت کر سکتے ہیں جب ہم قانون کو سب سے پہلے خود اپنے آپ پر نافذ کریں۔ تاہم اس کام کے لیے صبر اور برداشت ہم میں نہیں ہے۔ صبر اور برداشت کا رویہ مسلسل ریاضت اور خود احتسابی کے نتیجے میں پروان چڑھتا ہے، مگر ہم یہ گھاٹی پار کرنے پر تیار نہیں ہیں۔

ہم میں سے ہر فرد ہر وقت سیاست پر بحث کرتا ہے۔ ہم حکومت پر تنقید کر کے اپنے دل کی بھڑاس نکالتے ہیں یا دل ہی دل میں کڑھتے ہیں۔ ہمارے حجروں اور ڈرائنگ روموں کا محبوب ترین مشغلہ حکمرانوں اور سیاست دانوں پر تنقید ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ساری خرابیوں کی جڑ اور ذمہ دار حکومت ہے۔ ہمارا یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ جب تک حکومت ٹھیک نہ ہو تب تک کوئی بھی

Marfat.com

کام ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ اور چونکہ حکومت ٹھیک نہیں ہو رہی اس لیے باقی تو سب کچھ خراب ہو گا ہی۔ یقیناً یہ بات صحیح ہے کہ حکومت کو ٹھیک ہونا چاہیے اور ٹھیک کرنا چاہیے۔ لیکن اِس کے ساتھ ساتھ اتنی ہی ضروری یہ بات بھی ہے کہ ہم میں سے ہر فرد اپنی استطاعت کی حد تک خود بھی کچھ کرے۔ چنانچہ تبدیلی کے خواہش منداور پرعزم فرد کی سوچ یہ ہوتی ہے کہ بے شک حکومت ہماری زندگی کے ایک حصے کو کنٹرول کر رہی ہے، مگر ہمارا باقی وقت تو ہمارے اپنے اختیار میں ہے۔ کیوں نہ ہم یہ سوچیں کہ ہم کس طرح سوسائٹی کی خدمت کر سکتے ہیں۔ مثلاً بازاروں میں ہزاروں بچے بوٹ پالش کرتے ہیں، بھیک مانگتے ہیں اور بالکل چھوٹی عمر میں مکینکوں کے ساتھ بیٹھ کر کام کرتے ہیں۔ یوں ان کی تعلیم کا وقت نکل جاتا ہے اور یہ بچے ہمیشہ کے لیے معاشرے پر بوجھ بن جاتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں کتنی ہی بیوائیں، بوڑھے اور یتیم ہیں جن کا کوئی آسرا نہیں۔ کتنے طلبہ ہیں جن کے پاس امتحان میں بیٹھنے کی فیس نہیں۔ کتنے بیمار ہیں جن کے پاس دواؤں کے پیسے نہیں۔ ایک باشعور انسان جب ان چیزوں کو دیکھتا ہے تو وہ یہ سوچتا ہے کہ میں آگے بڑھ کر ان کی کیا عملی مدد کر سکتا ہوں۔ یہ عملی مدد انفرادی طور پر بھی ہو سکتی ہے اور اجتماعی طور پر بھی۔

ہمارے ملک میں صفائی کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ گلیاں اور سڑکیں گندگی کا ڈھیر بن رہے ہیں۔ پلاسٹک کی تھیلیوں نے ہر ڈرینیج سسٹم کو خراب کر کے رکھ دیا ہے۔ لوگ جہاں چاہتے ہیں خالی تھیلے پھینک دیتے ہیں۔ جب لوگ اپنے گھر کی صفائی کرتے ہیں تو سارا کوڑا کرکٹ گھر کے سامنے پھینک دیتے ہیں اور مطالبہ کرتے ہیں کہ حکومت آ کر اُن کی گلی کو صاف کرے۔ کھانے پینے کی دکانوں میں عموماً جالیاں نہیں لگائی جاتیں۔ اگر دوکاندار غلطی سے گاہک کو زیادہ پیسے دے دے تو گاہک اُسے واپس نہیں کرتا۔ اور اگر گاہک سے یہی غلطی ہو جائے تو دوکاندار اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ دوکاندار بیچنے والی چیز کی خامی گاہک کو نہیں بتاتا۔ رمضان میں مہنگائی اپنے پورے عروج پر ہوتی ہے۔

ہمارے یہاں حقوق اللہ اور حقوق العباد کے درمیان توازن کو عموماً مدِ نظر نہیں رکھا

Marfat.com

جاتا۔ایسے بے شمار مذہبی افراد موجود ہیں جو عبادات اور ذکر و تسبیح کے نہایت پابند ہیں، لیکن ان کو اپنی بیویوں یا اپنے بچوں کے حقوق کا خاص خیال نہیں ہوتا۔ایسے بہت سے لوگ گراں فروشی، سمگلنگ اور اسی طرح کے دوسرے دھندوں میں مصروف رہتے ہیں اور شاید یہ سمجھتے ہیں کہ اُن کی عبادت کے مقابلے میں یہ چیزیں کوئی بڑی اہمیت نہیں رکھتیں۔ پاکستان کے دین دار ترین علاقوں میں خواتین کو وراثت میں حصہ دینے کا کوئی رواج نہیں ہے۔

جب تک کوئی فرد ان چیزوں کے بارے میں اپنا ذہنی رویہ تبدیل نہ کرے، تب تک ان معاملات میں کوئی بہتری نہیں آسکتی۔ یقیناً ان معاملات میں ریاست اور معاشرے کو بھی اپنا حصہ ادا کرنا ہے، لیکن ان کے ٹھیک ہونے میں سب سے بڑا حصہ فرد کا ہے۔ اگر ایک فرد اپنی جگہ پر یہ فیصلہ کر لے کہ معاشرہ ٹھیک ہو یا نہ ہو، کم ازکم میں اپنی حد تک اپنے آپ کو ٹھیک رکھوں گا اور خدمت خلق کی ہر ممکن کوشش کروں گا، تو یہی اصل تبدیلی ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہم میں سے ہر ایک فرد دوسروں کے تبدیل ہونے کا انتظار تو کرتا ہے مگر اپنے آپ کو تبدیل نہیں کرتا۔ یہ خرابیوں کی جڑ ہے۔

جدید ترین تحقیقات سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ خدمت خلق کا کام انسان کو بہت سکون و اطمینان دیتا ہے۔ ڈپریشن کی بیماری دور کرنے میں بھی یہ کام بہت مدد و معاون ثابت ہوتا ہے۔ اگر انسان روزانہ کسی نہ کسی فرد کو فائدہ پہنچائے اور کسی بھی دوسرے انسان کو نقصان نہ پہنچائے، تو ایسا انسان ذہنی طور پر بہت خوش ہوتا ہے۔ تحقیقات سے یہ بات بھی معلوم ہو چکی ہے کہ اس خدمت خلق کا کسی شخص کے مذہب یا مذہبی ہونے یا نہ ہونے سے کوئی زیادہ تعلق نہیں ہے۔ یعنی اگر ایک غیر مذہبی شخص بھی خدمت خلق کا کام کرتا ہے تو ایسے شخص کو بھی خوشی کی دولت ملتی ہے۔ گویا خدمت خلق کا انحصار ضمیر و احساس کی بیداری پر ہے۔ اس راقم کے نزدیک یہ بھی توحید کا ایک بہت بڑا ثبوت ہے، اس لیے کہ یہ ضمیر و احساس خالق کائنات کا عطا کردہ تحفہ ہے۔ مبارک ہیں وہ لوگ جو کسی کو نقصان نہیں پہنچاتے، اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے دوسروں کو فائدہ پہنچانے کا موقع ڈھونڈتے ہیں، اور اپنے احساس کو زندہ رکھ کر معاشرے کو فائدہ پہنچاتے ہیں۔

Marfat.com

اکتالیس واں باب

کرپشن کا علاج

آج ہمارے ملک میں کرپشن اپنے عروج پر ہے یہ کرپشن اہل سیاست، بیوروکریسی اور عدالت ہر جگہ ہے۔ کرپشن، بددیانتی، خیانت، رشوت، غلط سفارش اور میرٹ کے بغیر فیصلے، یہ دراصل ایک ہی برائی کے مختلف پہلو ہیں۔ قوموں کی تباہی میں یہ چیز بہت بڑا کردار ادا کرتی ہے۔ کرپتن کسی ملک کے اندر غیر یقینی صورت حال کو جنم دیتی ہے، ہر انسان اپنی ذات تک محدود ہو جاتا ہے اور ہر ایک فرد دوسرے کو کرپٹ قرار دیتا ہے۔ گویا کرپشن سے سوسائٹی میں بلحاظ مجموعی بے اطمینانی کی فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ کرپشن وہیں پر پھلتی پھولتی ہے جہاں انصاف نہ ہو۔ اگر ملک کے اندر انصاف ہو اور ہر ایک کو اُس کی صلاحیت کے مطابق معاوضہ دیا جائے تو کرپشن کم ہوتی جاتی ہے۔ کرپشن کی دوسری بڑی وجہ آپس میں معیار زندگی کی دوڑ ہے۔ یہ چیز قناعت کے بالکل اُلٹ ہے۔

کرپشن کے خاتمے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ملک میں انصاف قائم کیا جائے اور بالا دست طبقات خود یہ فیصلہ کرلیں کہ وہ کرپشن نہیں کریں گے۔ انصاف ہی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ کسی فرد کے اختیارات اور اُس کی آمدنی میں توازن پیدا کیا جائے۔ یہی وہ عامل ہے جس کی وجہ سے جی ٹی روڈ پر تعینات پولیس کا ملازم رشوت لیتا ہے مگر موٹروے پولیس اس خرابی سے بہت حد تک پاک ہے۔

لیکن اگر کسی ملک میں انصاف نہ ملتا ہو تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ایک انسان اس بات کو رشوت لینے کے لیے وجہ جواز بنالے۔ یہ بھی ایک غلط رویہ ہے۔ اگر کسی ملک میں انصاف کی دھجیاں اڑائی جارہی ہوں، وہاں بھی ایک حساس اور باشعور فرد کے لیے یہ لازم ہے کہ وہ کرپشن سے اپنے آپ کو بچائے۔ آخر اُسے اپنی قبر میں لیٹنا ہے۔ پروردگار کے دربار میں تو یہ بہانہ نہیں

Marfat.com

بنایا جاسکتا کہ چونکہ سب لوگ رشوت لے رہے تھے اس لیے میں بھی لے رہا تھا۔ ایسے بہانوں سے انسان اس دنیا میں اپنے دل کو بظاہر مطمئن کرسکتا ہے، لیکن خدا کے دربار میں ان کی کوئی قیمت نہیں۔ ہم روز دیکھتے ہیں کہ ایک بڑا افسر اپنی کم آمدنی کا رونا روکر اور اپنے معیار زندگی کی دہائی دیکھ کر رشوت لیتا ہے اور اُس کے بالکل برعکس ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسٹم کا ایک عام سپاہی اپنے آپ کو بددیانتی سے بچاتا ہے اور اپنی تھوڑی تنخواہ میں خدا کا شکر ادا کر کے اپنی زندگی بسر کرتا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کرپشن کی طرف رجحان بھی درحقیقت ایک ذہنی رویہ ہے۔ اگر انسان اس ذہنی رویے پر قابو پانے کی جدوجہد کرے تو کم از کم اپنی ذات کی حد تک مثال بن سکتا ہے۔

جن لوگوں کو قدرت نے ملک میں پالیسی سازی کی جگہ پر فائز کیا ہے، اُن پر یہ لازم ہے کہ وہ ہر ملازم کے اختیارات اور اُس کی تنخواہ میں توازن پیدا کریں، ہر محکمے اور ادارے کے لیے انصاف پر مبنی واضح پالیسی بنالیں، عدالتوں کے ذریعے بھی انصاف مہیا کریں، ہر حکومتی ادارے کے سب حسابات کو شفاف بنائیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ذمہ داری کے منصب پر فائز افراد اپنا ذاتی حساب قوم کے سامنے ہر وقت رکھیں اور اپنے آپ کو احتساب کے لیے پیش کرنے کے لیے ہر لمحہ تیار ہوں۔ کرپشن کی لعنت پر صرف اسی طریقے سے قابو پایا جاسکتا ہے۔ سخت سزائیں کرپشن کا حل نہیں ہیں، بلکہ اس سے کرپشن کا ریٹ مزید بڑھ جاتا ہے۔

Marfat.com

بیالیسواں باب

''اعتدال پسند روشن خیالی'' (Enlightened Moderation)

ہمارے معاشرے میں کسی اصطلاح کی وضاحت کیے بغیر اُس کو استعمال کرنے کا رجحان عام ہے۔ ہمارے سیاست دان، مذہبی رہنما، دانش ور اور صحافی تحریر و تقریر کے جوش میں بسا اوقات اپنے موقعہ و محل سے ہٹ کر ایسے اصطلاحات استعمال کرتے ہیں، جن کا ایک خاص تاریخی اور نظریاتی پسِ منظر ہوتا ہے۔ مثلاً ہمارے ہاں بہت سے اہم لوگ یہ بیان دیتے ہیں کہ ہر سچا مسلمان بنیاد پرست (Fundamentalist) ہوتا ہے کیونکہ وہ اسلام کی سب بنیادوں پر یقین رکھتا ہے۔ یہ بیان صحیح نہیں ہے۔ دراصل فنڈامنٹلسٹ مغرب میں بنی ہوئی ایک اصطلاح ہے جس کے مفہوم میں یہ چیز شامل ہے کہ کسی عقیدے پر سوچ سمجھ کے بغیر ایمان لایا جائے، ہر بات کے بامحاورہ معنی کے بجائے اُس کے لفظی معنی لیے جائیں، مکالمے پر یقین نہ رکھا جائے اور اپنے خیالات کو بزور دوسروں پر مسلط کیا جائے۔

یہی حال ''اعتدال پسندانہ روشن خیالی'' کی اصطلاح کا ہے۔ روشن خیالی (Enlightenment) خالصتاً ایک یورپی اصطلاح ہے جو سولھویں اور سترہ ویں صدی میں پروان چڑھی۔ اس کی تفصیل اس کتاب کے ابتدائی ابواب میں گزر چکی ہے۔ اُس روشن خیالی کے مفہوم میں یہ بات شامل تھی کہ ہر چیز پر عقل و شعور کی روشنی میں غور و فکر اور مکالمہ کیا جائے۔ معاشرے کی تعمیر علم کی بنیاد پر کی جائے اور ہر چیز کے اندر جمہوری رویہ اپنایا جائے۔ یہ کام حکومتوں نے نہیں، بلکہ آزاد منش اہل علم اور دانش وروں نے شروع کیا۔ دراصل حکومتیں ایسا کام کر بھی نہیں سکتیں۔ حکومتوں کے اپنے مفادات ہوتے ہیں، چنانچہ حکومتی سرپرستی میں کیا جانے والے ہر علمی کام پر اُن مفادات کی چھاپ پڑسکتی ہے، اور اگر نہ بھی پڑے تو تب بھی عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ یہ سب کچھ حکومتی اشارے پر ہو رہا ہے۔ ویسے بھی حکومتی سرپرستی میں یہ بہت مشکل ہے کہ

Marfat.com

کوئی آزادانہ علمی کام کیا جائے یا اپنے نقطہ نظر کا اظہار کیا جائے۔

یہ اصطلاح ہمارے ملک میں جنرل پرویز مشرف نے متعارف کروائی جو ملکی آئین کو بالائے طاق رکھتے ہوئے برسر اقتدار آئے۔ یقیناً وہ خود بھی نہیں جانتے تھے کہ اس اصطلاح کا کیا مطلب ہے۔ شاید اُن کے نزدیک بے محابا طاؤس ورباب اور میراتھان ریس کا نام روشن خیالی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے یہ اصطلاح استعمال کرنے کے بعد کبھی اس بات کی وضاحت نہیں کی کہ اس اصطلاح سے اُن کی کیا مراد ہے۔ شاید وہ ایسا کر بھی نہیں سکتے، اس لیے کہ اس سے اُن کے پورے حکومتی ڈھانچے پر زد پڑتی تھی۔

روشن خیالی کی اصطلاح کے برعکس 'اعتدال' ایک اسلامی اصطلاح ہے۔ یہ عدل یعنی انصاف سے نکلا ہے۔ چونکہ عدل کا راستہ ہمیشہ انتہاؤں سے بچ کر ہوتا ہے، اس لیے اعتدال سے یہ مراد بھی لی جاتی ہے کہ انتہا پسندی سے بچ کر درمیان کا راستہ اختیار کیا جائے۔ یہ لفظ یا اس سے ملتے جلتے الفاظ قرآن و حدیث میں بار بار استعمال ہوئے ہیں۔ چنانچہ یہ ایک بہت پسندیدہ اجتماعی وانفرادی رویہ ہے۔ اس رویے کا سب سے بنیادی تقاضا یہ ہے کہ ملک میں ایک خالص جمہوری کلچر ہو، ہر معاملہ مکالمے کے ذریعے حل کیا جائے، اور سوسائٹی میں بلحاظ مجموعی افہام و تفہیم کی فضا ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ فوجی آمریت کی پیدا کردہ فضا اور اقدار کے بالکل برعکس ہے۔ چنانچہ ایک فوجی آمر کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ اس طرح کی اصطلاحات استعمال کرے۔ ایسے غلط استعمال سے ان اصطلاحات کا تقدس مجروح ہو جاتا ہے۔

Marfat.com

تریالیسواں باب

پختونوں کا مفاد

آج دنیا میں دو قومیں سب سے بڑھ کر خطرات کا شکار ہیں۔ایک فلسطینی قوم اور دوسری پختون قوم۔پختون قوم اِس وقت ہر طرف سے مصیبتوں کا شکار ہے۔پچھلے تیس برس سے یہ خطہ مسلسل سپر پاورز کی آویزش کا شکار ہے۔اس کی ابتدا دسمبر 1979ء میں روسی افواج کی آمد سے ہوئی، جس کی وجہ سے امریکہ کے لیے بھی یہ خطہ اہم ترین پوزیشن کا حامل بن گیا۔ان دونوں سپر پاورز اور پاکستانی ملٹری اسٹیبلشمنٹ کی اختیار کردہ حکمت عملی کے نتیجے میں اب ہم ایک خوف ناک صورت حال سے دوچار ہیں۔اس خطے میں تشدد، انتہا پسندی، لاقانونیت اور اپنی بات کو دوسروں سے بزور منوانے کا رجحان زوروں پر ہے۔اس لڑائی میں دونوں طرف سے پختون ہی مارے جارہے ہیں۔

اس راقم کا یہ نقطہ نظر ہے کہ اگر ہر معاملے میں انصاف سے کام لیا جائے، اور جہاں انصاف ممکن نہ ہو وہاں عدم تشدد پر مبنی مظلومانہ جدوجہد کی جائے، تو انسانیت، امت مسلمہ، پاکستان اور پختونوں کے مفادات میں کوئی ٹکراؤ اور تضاد پیدا نہیں ہوتا۔چنانچہ اس پوری صورت حال کا پُرامن حل ممکن ہے۔صرف پُرامن حل ہی پختونوں کے مفاد میں ہے۔اور اگر ایسا نہیں کیا گیا تو ممکن ہے کہ ہم اپنے بچوں کے لیے بھی ایک جلتی ہوئی سرزمین چھوڑ جائیں۔

پختونوں کی سرزمین ہمیشہ سے بیرونی حملہ آوروں کا راستہ رہا ہے۔لیکن یہاں کی مخصوص صورت حال کے باعث یہ بیرونی حملہ آور یہاں نہیں ٹھہرے، بلکہ آگے بڑھ کر انہوں نے لاہور اور دہلی کو اپنا مستقر بنایا ہے۔یہی وجہ ہے کہ یہاں کے پہاڑوں میں بسنے والے قبیلے عموماً خودمختار رہے ہیں اور انہوں نے جرگوں کے ایک نیم جمہوری نظام کے ذریعے اپنے آپ کو زندہ رکھا ہے۔میدانی علاقوں میں رہنے والے پختون کبھی تو دوسروں کے زیرِ اثر رہے ہیں، کبھی وہ نیم

Marfat.com

خودمختار رہے ہیں، اور ایسا بھی ہوا ہے کہ افغانستان کے اندر بننے والی حکومتوں نے آگے بڑھ کر لاہور اور دہلی پر بھی اپنا اقتدار مستحکم کیا۔ مغلوں کے زمانے میں یہ سرحدی علاقے نیم خودمختار رہے۔ انگریزوں نے میدانی علاقوں، خصوصاً وادیٔ پشاور میں اپنا اقتدار بخوبی مستحکم کیا۔ جب کہ سوات جیسی ریاستوں نے انگریز حکومت کی بالادستی تسلیم کرتے ہوئے اپنی خودمختاری برقرار رکھی۔ قبائلی علاقوں اور انگریزوں کی لڑائی مستقلاً جاری رہی۔ انگریزوں نے قبائلی علاقوں میں اپنا فوجی وجود برقرار رکھا، تاہم اکثر قبائلی مشران کو پیسے کے ذریعے اپنے ساتھ کامیابی کے ساتھ ملائے رکھا۔ اس طرح قبائل نیم خودمختار بھی رہے اور دوسری طرف انہوں نے انگریزوں کے مفادات کا خیال بھی رکھا۔

قیام پاکستان کے وقت اس صورت حال کو تبدیل ہونا چاہیے تھا۔ کیونکہ اب ملک پر کوئی سامراجی حکومت مسلط نہیں تھی۔ اب تو ایک ایسا دور شروع ہونا چاہیے تھا جس میں جمہوری کلچر، صوبائی خودمختاری، اور مقامی رسم ورواج کے احترام کے ذریعے حکومت کا نظام چلایا جاتا۔ مگر ایسا نہیں کیا گیا۔ قیامِ پاکستان کے وقت سے ہی سیاست دانوں اور بیوروکریسی نے ملکی معاملات کو 'جیسا ہے ویسا ہی رہے' کے اصول پر چلانا شروع کیا۔ چنانچہ نہ آئین بن سکا اور نہ کوئی اور بنیادی قدم اٹھایا جاسکا۔ جب 1952ء سے فوج بھی ملکی معاملات میں دخیل ہونا شروع ہوئی، تو اُسے قبائلی علاقوں کا انگریزی نظام ہی اچھا لگا، کیونکہ اسی نظام کے ذریعے وہ مغرب، افغانستان اور روس سے معاملہ کرسکتی تھی۔ باقی رہے وہاں کے عوام، تو ان کی بھلائی تو کسی کی ترجیح ہی نہ تھی۔ چنانچہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہا، اور حکومت اور قبائلی سرداروں کے گٹھ جوڑ کے ذریعے وقت گزرتا رہا۔

حالات میں بنیادی تبدیلی دسمبر 1979ء میں اُس وقت آئی، جب روسی افواج افغانستان میں داخل ہوگئیں اور جنرل ضیاء کی حکومت نے یہ فیصلہ کرلیا کہ روسی افواج کو افغانستان سے بزور نکالنا ہے اور آئندہ کے لیے افغانستان میں ایک ایسی حکومت کو قائم کرنا ہے جو پاکستان کی فرماں بردار رہے۔ یہ ایک غلط فیصلہ تھا، چنانچہ ابھی تک ہم اس کے نتائج بھگت رہے ہیں۔ روسی

Marfat.com

افواج کی افغانستان میں آمد کی مخالفت اور مزاحمت ضرور ہونی چاہیے تھی، مگر اس کے پُرامن طریقے ممکن تھے۔ مذاکرات اور بین الاقوامی ڈپلومیسی کے ذریعے روس کو اس بات پر آمادہ کیا جاسکتا تھا کہ وہ افغانستان سے اپنی افواج نکال لے۔

یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ جنرل ضیاء کے اس فیصلے کا بہت بڑا فائدہ یہ ہوا کہ روس ٹوٹ گیا۔ اوّل تو یہ بات ہی صحیح نہیں۔ روس افغانستان کی وجہ سے نہیں، بلکہ سوشلزم کے اندرونی تضاد کی وجہ سے ٹوٹا۔ پھر روس کے ٹوٹنے کا سارا فائدہ امریکہ کو ہوا، مسلمانوں کو اس سے کوئی فائدہ نہ ہوا۔ جو پانچ نام نہاد مسلمان ریاستیں وجود میں آئیں، وہاں ابھی تک سابقہ کمیونسٹ ہی بدترین آمریت کے ساتھ برسرِاقتدار ہیں۔ مستقبل قریب میں بھی ان ریاستوں کے نظام میں بہتری کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ چنانچہ اگر کوئی محض ان پانچ ناموں سے خوش ہونا چاہے تو ہو لے، مگر امت مسلمہ کو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

افغانستان کی ساری تحریکِ مزاحمت مذہب کے نام پر لڑی جارہی تھی، چنانچہ قبائلی علاقے اور بلوچستان کے سرحدی اضلاع کو اس کے لیے بیس کیمپ بنادیا گیا۔ سرداروں کے بجائے مذہبی رہنماؤں کو نوازنا شروع ہوا، چنانچہ انہوں نے بتدریج سرداروں کی جگہ لینی شروع کردی۔ جب اسلحہ، ڈالر اور مذہب ایک جگہ اکٹھے ہوگئے تو یہ لازم تھا کہ عوام کی وفاداری کا مرکز بھی یہی جگہ بنے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

حالات میں دوسری بنیادی تبدیلی گیارہ ستمبر 2001ء کو آئی جب امریکہ پر خودکش بمباروں نے حملہ کیا، امریکہ نے اس کا الزام بن لادن پر عائد کیا، اور طالبان حکومت سے مطالبہ کیا کہ بن لادن کو اُس کے حوالے کیا جائے ورنہ نتائج بھگتنے کے لیے تیار ہوجائے۔ اس موقع پر امریکہ نے پاکستان سے بھی یہ مطالبہ کیا کہ وہ نہ صرف طالبان کی حمایت سے دست بردار ہوجائے بلکہ اس جنگ میں امریکہ کی عملی حمایت کرے۔ چنانچہ اس موقع پر جنرل مشرف کی حکومت نے اباؤٹ ٹرن لیتے ہوئے امریکہ کے سارے مطالبات مان لیے۔ یہ مشرف حکومت کا ایک غلط

Marfat.com

فیصلہ تھا۔اُس وقت یہ چاہیے تھا کہ پاکستان طالبان کی حمایت سے دست بردار ہو جاتا،مگر طالبان کے خلاف امریکہ کی عملی مدد نہ کرتا۔پاکستانی حکومت یہ کہہ سکتی تھی کہ امریکہ کی عملی مدد سے اُسے داخلی طور پر بہت مشکلات پیش آئیں گی۔اُس وقت پاکستان کے لیے بہترین پالیسی یہ تھی کہ پاک افغان بارڈر کو سیل کر دیا جاتا،قبائلی علاقوں کو یا تو صوبہ سرحد (پختون خوا) میں ضم کر دیا جاتا اور یا اس کو ایک علیحدہ صوبہ بنا دیا جاتا۔مگر فوجی حکومت نے ایسا نہیں کیا اور اس کے برعکس مکمل طور پر امریکی ڈکٹیشن پر چلنے کا فیصلہ کیا۔

اہم ترین بین الاقوامی حلقوں کی طرف سے یہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ پاکستانی فوجی حکومت ایک لمبے عرصے تک دوغلی پالیسی پر عمل پیرا رہی۔ایک طرف وہ امریکہ کی حمایت کرتی رہی اور دوسری طرف کچھ اہم ایجنسیاں عسکریت پسندوں کے ساتھ بھی رابطہ رکھتی رہیں۔آنے والا وقت ہی بتا سکے گا کہ اس میں کتنی حقیقت ہے۔

جو لوگ مذہب کے نام پر روسی افواج کے خلاف لڑے تھے،ظاہر ہے کہ وہ اپنے نقطہ نظر کے حوالے سے انتہائی مخلص لوگ تھے۔چنانچہ ان کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ پاکستانی فوجی حکومت کے اباؤٹ ٹرن کے ساتھ وہ بھی اپنے نظریات چھوڑ دیں۔فوجی حکومت تو اپنے مفادات کی اسیر تھی، جب کہ یہ لوگ اپنے نظریات پر یقین رکھتے تھے۔چنانچہ حالات میں تیسرا اہم موڑ 2004ء میں اُس وقت آیا جب پاکستانی حکومت نے قبائلی علاقوں میں مسلح اپریشن شروع کر دیا۔مسلح اپریشن کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ اگر اس کا فیصلہ ہو جائے تو پھر اسے پوری طرح روبہ عمل لایا جاتا ہے،ورنہ سرے سے اپریشن کیا ہی نہیں جاتا۔لیکن موجودہ فوجی حکومت کا یہ مسلسل مخمصہ رہا ہے کہ جب وہ اپریشن کرتی ہے تو بغیر کسی تیاری کے (Half coocked) کرتی ہے اور نیم دلانہ طریقے (Half heartedly) کرتی ہے۔یہ حکومت عام طور پر ریگولر فوج کو استعمال نہیں کرتی، بلکہ اُن پیرا ملٹری فورسز کو استعمال کرتی ہے جن کی تربیت کمزور ہوتی ہے۔پھر یہ بھی ہے کہ ایک ہزار جنگجوؤں سے لڑائی کے لیے دو سو فوجیوں کو بھیجا جاتا ہے۔اس کا نتیجہ جان و مال کے

Marfat.com

ضیاع اور فوجی شکست کی صورت میں نکلتا ہے۔ یہ پیراملٹری فورسز لڑائی کے بجائے ہتھیار ڈالنے کو ترجیح دیتی ہیں۔ان سب چیزوں کا مجموعی نتیجہ عوام کے لیے بہت برا ہوتا ہے۔

اس فوجی حکومت کا یہ بھی طریقہ ہے کہ جب کوئی مزاحمت سر اٹھانا شروع کرتی ہے، تو کئی برس تک اُسے نظر انداز کیا جاتا ہے۔ اور جب وہ ایک تناور درخت بن جاتی ہے تو تب فوجی ایکشن لے لیا جاتا ہے۔ حالانکہ دنیا بھر کا طریقہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ جب ایک مزاحمت حد سے بڑھ جائے، وہ ایک بڑے علاقے پر کنٹرول حاصل کر لے، اور ہزاروں لاکھوں لوگ اُس کے ساتھی بن جائیں، تو ایسے وقت میں فوجی ایکشن کوئی فائدہ نہیں دیتا، بلکہ الٹا نقصان پہنچاتا ہے۔ شاید ہماری مرکزی فوجی حکومت ان دو صوبوں کو محض ایک تجربہ گاہ خیال کرتی ہے، جہاں کے لوگوں کو Ginaea pigs کی طرح استعمال کیا جاسکتا ہے اور اس سے سفاکانہ بین الاقوامی فوائد حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

اس وقت وادیٔ پشاور کے سوا پختونوں کے سارے علاقوں میں طالبانائزیشن، عسکریت پسندی اور لاقانونیت اپنے پورے عروج پر ہے۔ پختونوں کی ساری سیاسی اور مذہبی قیادت کسی نہ کسی درجے میں اس کے لیے ذمہ دار ہے۔ مرکزی سیاہی دھارے سے تعلق رکھنے والی پارٹیوں، مثلاً 1988ء کے بعد پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ نے اے این پی کے ساتھ مل کر کئی مرتبہ حکومتیں بنائیں، مگر ان حکومتوں پر کرپشن کے الزامات لگتے رہے۔ عام تاثر یہ ہے کہ ان الزامات میں حقیقت موجود ہے۔ 1992ء کے انتخاب میں پشتو بولنے والے ستر فیصد (70%) لوگوں نے ایم ایم اے کو ووٹ دیا۔ مگر ایم ایم اے بھی عوامی توقعات پر پورا نہ اتر سکی۔ یہ سابقہ حکومتیں اتنا بھی نہ کرسکیں کہ پاٹا یعنی صوبے کے زیرِ اہتمام قبائلی علاقوں کو صوبے میں ضم کر کے صوبے کا باقاعدہ حصہ بنادیتیں۔ کئی جگہ یہ علاقے مجرموں کی پناہ گاہ بن چکے ہیں، اور کئی جگہ مذہبی انتہا پسندوں نے اپنی جڑیں مضبوط بنالی ہیں۔

اس صوبے کے ایک عام انسان کو اسلام اور پختون ولی دونوں سے والہانہ محبت ہے۔

Marfat.com

وہ ایسے لیڈر کو پسند کرتا ہے جو عاجزانہ طبیعت رکھتا ہو، جس سے کسی بھی وقت ملاقات کی جا سکتی ہو، اور جو دیانت دار ہو۔ چنانچہ پختونوں کی بھلائی کے لیے کام کرنے والی ہر تنظیم کو ان باتوں کا خیال رکھنا ہوگا۔

آج پختونوں کی سب سے بڑی ضرورت امن، تعلیم اور ترقی ہے۔ عدم تشدد کا اصول ہمیشہ کے لیے ہماری ضرورت ہے۔ شریعت اور انصاف کا جلدی حصول تو نہ صرف پختونوں بلکہ سب اہلِ وطن کی ضرورت ہے، لیکن اس کے لیے بھی جدوجہد کا واحد طریقہ پُرامن راستے سے ذہنوں کی تسخیر ہے۔ عسکریت پسندی، خواہ حکومت کی طرف سے ہو یا کسی گروہ کی طرف سے، وقتی طور پر تو کسی کو فائدہ پہنچا سکتی ہے، مگر انجامِ کار یہ خسارے کا سودا ہے۔

Marfat.com

چوالیسواں باب

فرقہ بندی کا ناسور

مسلمانوں کے مختلف مسلکوں کے درمیان اتفاق بہت زیادہ ہے اور اختلاف بہت کم۔ اہل سنت ہوں یا اہل تشیع، دونوں توحید و رسالت اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ قرآن مجید کو واجب الاتباع مانتے ہیں اور حضورؐ کے فرامین کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ یقیناً دونوں کے درمیان کچھ اہم معاملات پر اختلاف بھی ہے لیکن اگر نسبت کا جائزہ لیا جائے تو نوے فیصد اتفاق ہے اور دس فیصد اختلاف۔

لیکن بدقسمتی سے اس دس فیصدی اختلاف نے اِس ملت کو یوں ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیا ہے کہ دشمنی، جھگڑوں اور منافرت کا ایک بازار گرم ہے۔ ایک دوسرے کے جان و مال اور آبرو پر حملے ہو رہے ہیں اور ایک دوسرے کے رہنماؤں کو قتل کیا جا رہا ہے۔ بسا اوقات مخالف مسلک کی مسجدوں پر خودکش حملے ہوئے ہیں۔ بازاروں کو جلا کر خاک کر دیا گیا ہے اور غیض و غضب میں خواتین اور بچوں کو بھی نہیں بخشا گیا۔

صرف یہی نہیں بلکہ تنگ نظری کا یہ طوفان اِس حد تک امتِ مسلمہ کے اندر سرایت کر گیا ہے کہ ایک ہی مسلک سے تعلق رکھنے والے ذیلی مسالک بھی ایک دوسرے کا خون بہاتے ہیں۔ کئی جگہوں پر دیوبندیوں اور بریلویوں کے درمیان معرکہء کارزار برپا ہے اور اس خانہ جنگی میں سینکڑوں لوگ کام آ چکے ہیں۔

دین کے کچھ مسائل کو سمجھنے کے معاملے میں ایک دوسرے سے اختلاف کرنا کوئی بری یا غلط بات نہیں۔ انسان کی عقل محدود ہے۔ مختلف انسانوں کے ذہنی سانچے ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ اس لئے بعض لوگ کسی حکم کے پیچھے اصل مقصد کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں، بعض لوگ بامحاورہ معنی کو ترجیح دیتے ہیں اور بعض لوگوں کا ذہن الفاظ کو زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ خود حضورؐ کے

Marfat.com

زمانے میں صحابہ کرامؓ کے درمیان کسی بات کو سمجھنے میں اختلاف ہوا ہے۔لیکن اگر یہ اختلاف رائے شائستگی کی حد میں رہے، ایک دوسرے کی نیت پر حملہ نہ کیا جائے اور ایک دوسرے پر کفر کے فتوے نہ لگائے جائیں تو کوئی خرابی رونما نہیں ہوتی۔ مسئلہ تو اُس وقت گھمبیر صورت اختیار کر لیتا ہے جب دوسرے گروہ کے قابلِ احترام رہنماؤں کے خلاف غلط زبان استعمال کی جاتی ہے، دوسرے گروہ کو روس اور امریکہ کا ایجنٹ کہہ دیا جاتا ہے اور اُس کو خارج از دائرہ اسلام قرار دے دیا جاتا ہے۔ یہ طرز عمل اِس امت کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیتا ہے، اور مقابل قوتوں کا کام آسان کر دیتا ہے۔

چنانچہ آج ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم سب یہ فیصلہ کرلیں کہ کسی بھی مسلک کی بزرگ ہستیوں کے متعلق دل آزاری پر مبنی الفاظ استعمال نہیں کریں گے۔اور کسی کی نیت پر حملہ نہیں کریں گے۔ہم شائستگی اور ادب کے ساتھ اختلاف رائے کریں گے لیکن کسی پر کفر کے فتوے نہیں لگائیں گے۔تاہم اس سے بھی بڑھ کر عزیمت کا راستہ یہ ہے کہ ہم یک طرفہ طور پر صبر و برداشت کا راستہ اختیار کریں۔ مثلاً اگر کوئی گروہ یا فرد ہمارے قابلِ احترام رہنماؤں کے خلاف غلط زبان استعمال کرتا ہے تو ہم اِس طرزِ عمل پر افسوس کا اظہار تو ضرور کریں گے لیکن خود کبھی بھی کسی کی دل آزاری نہیں کریں گے۔ نہ خود مشتعل ہوں گے اور نہ دوسروں کو مشتعل کریں گے۔یہی سبق ہمیں سکھایا گیا ہے اور اسی میں امتِ مسلمہ کا وسیع تر مفاد ہے۔

Marfat.com

Marfat.com

سے پورے ملک میں [illegible]

پروگراموں میں شمولیت کی [illegible]

ہیں۔ ڈاکٹر محمد فاروق خان [illegible]

ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی [illegible]

اور کوہاٹ میں تحصیل علم کی [illegible]

نفسیاتی امراض کے شعبے [illegible]

پریکٹس کرتے ہیں۔ ان کے [illegible]

کرتے رہے۔ اب تک [illegible]

"پاکستان اور اکیسویں صدی" [illegible]

"اسلام اور عورت" [illegible] جہاد و قتال [illegible]

"امت مسلمہ۔ کامیابی کا راستہ" اور [illegible]

انشاء اللہ آسان ترجمہ قرآن [illegible]

ہو جائے گی [illegible]

لکھنے اور کہنے [illegible]

عنایت ہے۔

Marfat.com